جنوری تا دسمبر ۲۰۰۰
شمارے: ۳۶ تا ۳۹

مدیران: احمد ہمیش
انجلا ہمیش

زندہ اور نمائندہ ادب کا شاک انگیز استعارہ

زندہ اور نمائندہ ادب کا شاک انگیز استعارہ

سرپرست فریدائے غنی

سہ ماہی

شمارے: ۳۶ تا ۳۹ ۳۹ جنوری تا دسمبر ۲۰۰۰

مدیران: احمد ہمیش انجلا ہمیش

معاون مدیر: سحر علی

تشکیل سہ ماہی

TASHKEEL QUARTERLY

ادارت وترتیب :احمد ہمیش انجلا ہمیش
سرورق اور پشت ورق : انوار احمد
تزئین :زین العابدین، صادقین، انعام راجہ اور عاطف علیم
کمپوزنگ: تشکیل کمپوزر۔6/J,8-2۔ناظم آباد، کراچی (پاک) فون :629190
مقامِ طباعت :گلزار پرینٹنگ پریس۔4/B-2۔ناظم آباد کراچی 74600 (پاک)

دفتر رابطہ :6/J,8-2۔ناظم آباد، کراچی 74600 (پاک)۔فون :629190

قیمت : 140روپے
زرِ سالانہ : 300روپے
بہ ذریعہ ڈاک (رجسٹرڈ): 350روپے
بیرونِ ملک : 50$ (ڈالر)

نمائندہ ہندوستان :یوسف عارفی

۵

پرستش رب الارباب کی
(سورہ یٰسین کی آیت ۳۱ کے پس منظر میں)

کوثر مظہری

کہو،
کون ہے جو تمھیں رزق دیتا ہے
اس آسماں سے زمیں سے
کہو،
کون ہے جو ہے مالک
تمھارے ان اعضاء کا اجسام کا
کہو،
کون کرتا ہے پیدا یہ جاندار بے جان سے
اور ایسے ہی بے جان جاندار سے؟
سمجھتے ہو سب کچھ
کہ اس ذات واحد کی قدرت میں سب ہے
مگر کر رہے ہو پرستش
مظاہر، مناظر کی اب تک
پرستش کرو تو فقط رب الارباب کی!

طاہر سلطانی

نعت

بلندیوں سے یوں آقائے دوجہاں گزرے
کہ ان کے نقشِ کفِ پا سے آسماں گزرے

مہک رہے ہیں وہ رستے وہ کوچہ و بازار
جہاں جہاں سے کبھی شاہِ مُرسلاں گزرے

درِ حضورؐ پہ اس حال میں ہیں دیوانے
کہ جیسے ان پہ کوئی وقتِ امتحاں گزرے

خدا کا قُرب ملے اس کو یہ ہے ناممکن
جسے وسیلہ شاہِ امم گراں گزرے

دعا یہی ہے مری کائنات کے مالک
یہ زندگی رہِ طیبہ کے درمیاں گزرے

یہ فیضِ نعت ہے طاہر کہ فکرِ مدحت میں
دیارِ شوق سے لفظوں کے کارواں گزرے

خاص صفحہ

مٹی کا رشتہ

بوسیدہ ٹوٹی گلیوں میں
وہ ایک عرصے بعد گیا تھا
جن کی ہر دیوار سے چمٹا
اس کا بچپن سوکھ رہا تھا

وہ پہلے تو چند دنوں تک
بے مقصد گلیوں میں گھوما
دشت و دامن میں چکر کاٹے
بام و در کو آنکھ سے چوما

پھر آبائی قبرستان میں
اک دن فاتحہ پڑھنے آیا

اس کے دامن اور تلووں سے
خشک ببول کے کانٹے الجھے
سوکھے پیڑ کی شاخ پہ بیٹھا
اِک تنہا کوا چلایا
ایک گلہری نے گھبرا کر
غور سے اس کی جانب دیکھا

آباء کی قبروں پر رُک کر
اس نے گرد و پیش نظر کی
دھنسی ہوئی ٹوٹی قبروں سے
چند نئی قبروں نے پوچھا
آنے والے پردیسی کا
اس مٹی سے رشتہ کیا ہے؟
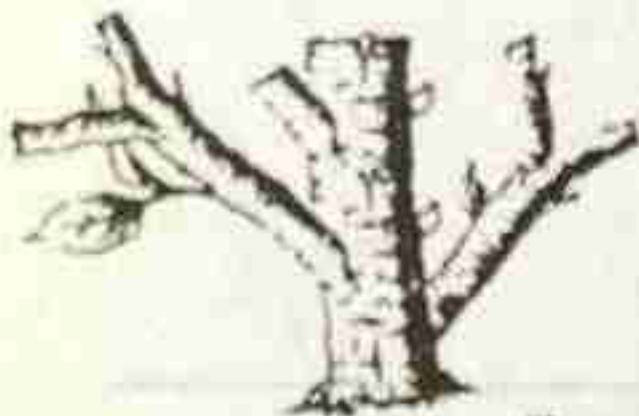
علامہ طالب جوہری کے شعری مجموعہ "حرفِ نمو" کی ایک نظم

جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء، شمارہ۔ ۳۶

بہ معنی محیط و بہ صورت نمی

ز موجِ نفس در قفس عالمی

بیدل

بساطِ حرف ولفظ

تنقید اور دیگر مضامین : مرقع ذات ۱۹۲۔۱۹۳

تحریری مطالعہ

منتخب خطوط

(پاکستان، بھارت، سعودی عرب، برطانیہ اور امریکہ)

حنیف اسعدی، آفتاب احمد تسکین واحدی، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر سلیم اختر، عبدالصمد، دل نواز دل، عشرت رومانی، ساجدہ زیدی
زاہدہ زیدی، وارث علوی، آشم میرزا، شاہانہ ایلیا، حیدر جعفری سید، عنبر بہرائچی، احمد سہیل، محمد الیاس، مسعود احمد، کلیم شہزاد،
مظفر الزماں خان، شہناز کنول غازی، شاہد اختر، شاداور اسحاق، یوسف عارفی، سیدہ حنا، ظفر امام، صابر عظیم آبادی، حسن جمال،
سید قمر حیدر قمر، اختر آزاد، جمال نویسی، آغا گل، شباب اختر، طارق قمر، شکیل جمالی، ساجد حمید، ناہید نظم، فرزین مقبول،
ڈاکٹر شمیم انصاری، خالد ریاض خالد، مسعود میاں، نثار احمد نثار، اصغر داورس، محمد حنیف ناشاد، دانش دلیغ بلوچ اور سحر مل ناصر

TASHKEEL ENGLISH WRITINGS-9

(From back page-2 to 11)

COMPILED BY AHMAD HAMESH

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، مظفر علی سید، قمر جمیل، انور عظیم،
نور جہاں بیگم (والدہ نیر جہاں) اور نفیسہ خاتون (والدہ نورالہدیٰ سید)

قصہ درمیانی مخلوق کا

احمد ہمیش — ادار یہ

دشمنی ہے تو دشمنی ہی سہی
میں نہیں یادگار شیشہ نہیں — محبوب خزاں

دنیا بہادروں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ گزرے گا، جب انسانی آبادیوں میں بیشتر ہیجڑے رہ جائیں گے۔ کوئی بہادر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ ممکن ہو، یہ قیامت کے آثار ہوں۔ مگر فی الحال دیکھنے میں تو یہی آتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں و اداروں، ایوانوں و مکانوں، گلی کوچوں، سڑکوں اور بازاروں میں بظاہر مرد اور عورت کی شکل اور تجسیم رکھنے والی مخلوق اپنی چال ڈھال، گفت و شنید، عادات و خصائل، ہاؤ بھاؤ اور سب سے بڑھ کے رویے سے ہیجڑا بنتی جارہی ہے۔

مثلاً مہابھارت میں بھیشم پتامہ جیسے مہان ویر کے خاتمہ کے لئے شکھنڈی (جو نہ آکاش سے تھا نہ دھرتی سے...... یعنی درمیانی مخلوق...... یعنی ہیجڑا تھا)۔ کو وجود میں لایا گیا تھا۔ یہ اور بات کہ بھیشم پتامہ نے شکھنڈی کے ہاتھوں نہ مر کے ارجن جیسے ویر کے ہاتھوں تیروں کی بارش اور اس سے بنائے گئے بستر مرگ پر باوقار مرنے کو ترجیح دی۔

آسمانی صحیفوں کے مطابق حضرت لوط علیہ اسلام کی قوم اور سدوم کی بستی کو ہم جنسی کے نتیجہ میں نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے سدوم کی بستی میں مخنث یا ہیجڑے اور امرد پرست رہا کرتے تھے (یعنی اس زمانہ کے گے (Gay) اور لیزبین (Lesbian)۔ کھجراہو کے مندروں میں شلپ کلا کے کئی آسن ہم جنسی کے پائے گئے۔ پھر تاریخ ہمیں راج محلوں اور شاہی ایوانوں کی جھلک اس حد تک دکھاتی ہے کہ محل سراؤں میں خواجہ سراؤں کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ بظاہر انھیں جنسی طور پہ بے ضرر ہونے کے سبب رکھا جاتا تھا۔ پھر بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ محلاتی سازشوں میں خواجہ سراؤں کو شریک کیا جاتا تھا۔ یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اورنگزیب کے جانشین جن تعیشات کے سبب کمزور ہوئے اور مغل سلطنت کا زوال ہوا، ان کے شراکت دار خواجہ سرا یا ہیجڑے بھی تھے۔ پھر وہی خواجہ سرا یا ہیجڑے برصغیر میں انگریزوں کی سلطنت قائم ہونے تک کیسے سول سرونٹ کے نوکر شاہوں یا بیوروکریٹس میں منتقل ہوئے، اس کی نشاندہی بھی پرانے آقا سے غداری یا پرانی وفاداری کو بدل کے نئے آقا سے نئی وفاداری جوڑنے کے کوائف سے ہی ہو سکتی تھی۔ مگر تب برملا بات کہنے کی جرات یا گنجائش نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ کو غدر کا نام دینے والے انگریزوں کے ملکی فریق وہ ہیجڑے ہی تو تھے، جو بعد کے حالات میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے مقابل حکومت انگلشیہ کو کمزور پڑتے دیکھ کے آزادی کے ریاکار نقیب بن گئے۔ مگر ابن الوقتی کو ماہرانہ

منافقت سے برتتے ہوئے برصغیر کی تقسیم کے دوران قوم کے محسن کہلانے لگے۔ گویا آزادی کی جنگ لڑنے والے مخلصین محض بے وقوف تھے۔ آخر انہیں نئے آقا کی ملکیت و اقتدار سے کچھ ملا بھی تو نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد قربانی کا بحران گئی جب کہ دو طرفہ قوم اور راشٹر کے جعلی محسنوں کو نقلی تاریخ کی نقلی عظمت و بڑائی ہاتھ آگئی۔ تو ایک طرف جنتا کو کھلی جمہوریت، فراڈ سیکولرازم، شانتی نکیتن کی پرفریب آڑ میں للت کلا کے بے جس منورنجن کی راہ لگا کے پرانی دیومالا کی جگہ غریبی، بھوک، گرسنگی اور فلاکت کی نئی دیومالا بنائی جانے لگی تو دوسری طرف عوام الناس کو مختلف النوع آمریت، نقلی حریت کے نعرے، یہودی نژاد اسلام، اقبالیات اور حرام خوری کی برکات و فیوض کی راہ لگا کے بھوک، افلاس و بیماری، بے گھری اور بے زمینی کو آوٹ آف فیشن بنایا جانے لگا۔ جب کہ انگریزوں کے بوٹ چاٹنے والی روایت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ساری مہارت اور کرتب بازی اس میں تھی کہ ایک کا ہگا ہوا دوسرا اور دوسرے کا ہگا ہوا تیسرا چو تھا کیسے کھائے! یا کہاں ہاتھی اپنے دکھانے والے دانت کی نمائش کرے اور کہاں کھانے والے دانت کے لیے غذا تلاش کرے! سوائے اس کے کہ دونوں طرف کے مقتدر ہیجڑوں نے سرے سے ہی آدمیت اور تصور زندگی کو خبط کر دیا۔ اس طرح کہ زندہ رہنے کی کسی بھی ضرورت کو اس کی بنیاد سمیت کس طرح اکھاڑ پھینکا جائے! یہاں تک کہ آدمی مرتے ہوئے یہ بھول جائے کہ کبھی وہ روئے زمین پر زندہ رہا ہوگا!

البتہ یہ سب کچھ دھوکا دینے والی آسانی میں اتنا غیر ضروری اور غیر اہم اس لیے ہو چلا تھا کہ دراصل جاپانیوں کی بہادری کا مقابلہ نہ کر کے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کی صبح امریکہ نے ہیروشیما پر اور اس کے بعد کے دن ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کے اپنا سب سے بڑا ہیجڑا ہونا ثابت کر دیا تھا مگر اس عالمگیر زعم کے ساتھ اس نے لاکھوں انسانی جانوں، معصوم چرند پرند اور نباتات وغیرہ کو نیست و نابود کرنے اور آبادیوں کو وسیع و عریض خرابہ میں بدلنے والی موت کا پہلی بار تعارف کرایا تھا۔ یعنی اس طرح امریکہ اپنے کیے پہ شرمندہ بھی نہیں ہوا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے انتہائی بور کر دینے والے فلمی سیریل کی طرح ویت نام میں اپنی نامردی کا تجربہ دہرانے اور اس کے بعد کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزار دیا۔ تاہم اس سے خود تو امریکہ کو ایک مرکب نسخہ یہ ملا کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں پائی جانے والی بہادری کی قوتِ مدافعت کو کیسے ختم کیا جائے!

دراصل جب مختلف حربوں سے دنیا چلانے کی سیاست مروج ہوئی تو کسی نہ کسی طور مملکتی و ریاستی اقتدار کو قائم رکھنے کا چلن عام ہوا۔ یعنی طاقت کی جائے معکوس طاقت کی سیاست کا بازار گرم ہونے لگا تو اس کے لیے دنیا کو دنیا سے چھپانے کے مقصد سے درپردہ شر کی دانش ناگزیر ہوئی۔ جب کہ خیر کی دانش میں تو انسانی نظام کو ظاہری و باطنی طور پر معتدل و متوازن رکھنے کی صلاح دی گئی۔ وید و اپنشد میں یہ تو نہیں کہا گیا کہ آگ کی جگہ پانی کو اور پانی کی جگہ آگ کو دی جائے۔ اہلِ دانش میں سے کسی نے یہ تو صلاح نہیں دی کہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالو یا ایک ہی جگہ سانپ اور نیولے کو شیک ہینڈ کرتے دکھاؤ۔ کسی مصلح نے دودھ

میں پانی ملانے کا مشورہ نہیں دیا۔ کہا جاتا ہے کہ گرو شنکر اچاریہ جنگل میں بیٹھے اپنے چیلوں کو مایا کا پاٹھ پڑھا رہے تھے کہ اتنے میں ایک دیوانہ ہاتھی ادھر ہی آتا نظر آیا۔ تبھی گرو شنکر اچاریہ سمیت سب ہی چیلے پیڑ پر چڑھ گئے اور دیوانہ ہاتھی پیڑ تلے سے ویسے ہی گزر گیا۔ اس کے گزرنے کے بعد چیلوں نے گرو شنکر اچاریہ سے پوچھا "گروجی! یہ سب کیا تھا؟" انہوں نے جواب دیا "یہ بھی مایا ہے"

اس کے باوجود جب نوبت یہ آئی کہ دنیا کی حکومتوں کے خفیہ محکمے ہیجڑوں کی رازدارانہ کارکردگیوں سے انسپائر ہو کر قائم کئے گئے۔ اور ان کی شراکت دار حلیف و حریف ایجنسیوں یا مافیاؤں نے آدمی کی انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کا شکار کرنے کے لئے سائنسی علوم یہاں تک کہ نفسیات، بشریات اور عمرانیات کو مشروط مراعات کی لین دین سے فریق بنا لیا تو اب انتہائی رازوں کے ماہر رکھوالے ہیجڑوں کو حرف و لفظ کی بساط الٹنے کی تفویض (Assignment) پر مقرر کیا گیا۔ پھر یہیں سے تو ساری گڑبڑ شروع ہوئی کہ حرف و لفظ کو معنی سے محروم کرنے کے لیے عدمیت (Nihilism) کے توسط سے مصوری کے رجحان ماورائے حقیقت (Sur.realism) اور تھیٹر کے رجحان لایعنیت (Absurdity) کا اطلاق لسانیات پر کیا جانا لگا۔ مگر اس میں نااہلی کا پہلو یہ تھا کہ مثلاً اگر لفظ "پیڑ" کی اوریجن کو ہدف بناتے ہوئے اس کی ساخت اور پہچان کو سرے سے خبط کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے نتیجہ کیا نکلا! اس کی ساخت اور پہچان تو اپنی جگہ رہی۔ مصور ڈالی کے ایک ماورائے حقیقت عمل سول وار (Civil war) میں ڈرائنگ کی گرفت کے انفرادی و اجتماعی کرب کی معنویت تو پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ اس طرح مثلاً اگر دیوانہ ہاتھی مایا تھا اور اس کے خوف سے پیڑ پر چڑھنے والے گرو شنکر اچاریہ اور ان کے چیلے بھی مایا تھے تو اس کے نتیجے میں لایعنی (Absurd) تھیٹر کا کیا بھلا ہوا! سوائے اس کے کہ آئنسکو اور سیموئیل بیکٹ کی نااہلی عدمیت کے پس منظر میں نہیں جا سکی یا اس کے مشرقی ماخذ سے رجوع نہیں کر سکی۔ مثلاً نکاتِ بیدل میں ایک جگہ ایک نااہل کا ذکر کچھ یوں ہے کہ وہ عقل مندوں کی طرز پر ڈینگ ہانکتے ہوئے مچھلی کی ماہیت بتا رہا تھا کہ مچھلی وہی ہے جو اونٹ کی مانند دو سینگ رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نااہل کو گوارانہ کرتے ہوئے سوال کرنے والے کی جگہ حضرت بیدل نے فرمایا کہ مچھلی کا اونٹ ہونا بے بنیاد بات ہے یعنی بات وہی کرنی چاہیے، جو بامعنی ہو۔ مگر اب اس کو کیا کیا جائے کہ وجودیت کے زمرے میں سارتر نے اپنی تصنیف Nausea میں ایک مقام پر لایعنیت Abusurdity کی نکتہ دانی کچھ یوں کی : The word absurdity is now born beneath my pen۔ مگر لکھنے والے کے قلم کی خود اختیاری کو جس عالمگیر خرابہ سے دوچار ہونا پڑا، وہ جنگل میں سوروں کے درمیان گھرے ہوئے شیر کی بے بسی یاد دلاتا ہے۔ سارتر جو ادب اور فلسفہ کا شیر تھا مگر چلا تھا تن تنہا مقابلہ کرنے دنیا بھر میں ہوتے ہوئے ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف۔ ظاہر ہے، اس کی بہادری ہی تو تھی اس کی انٹیلیکچوئل لیڈر شپ۔ جسے کاؤنٹر کرنے کے لیے امریکہ کی اسپانسر شپ میں ساختیات کے سوروں: رولاں بارتھ، لاکاں، دریدا، فوکو، لیوی اسٹراس اور آلتھوسے کو ہڑکایا گیا۔ اس طرح کہ حرف و لفظ

کی بساط الٹنے کے لیے انتہائی رازداری سے پہلے پورے متن کے معنی کو خبط کیا جائے، اسے تخلیقی و علمی وصف سے معطل و خارج کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ کسی اجنبی اور بنجر جگہ معلق کر دیا جائے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مصنف اور تخلیق کار کو اس کی تخلیقی اور علمی مملکت سے نکال باہر کیا جائے بلکہ قتل کرا دیا جائے۔ اس بھیانک ارادہ کے متعلق فضیل جعفری کے الفاظ میں کچھ یوں ہوا "ہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نشانیات اور ساختیات ہم معنی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ بارتھ، دریدا اینڈ کمپنی نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس سوسیر کو بہانہ بنا کر نیز اس کی بعض کلیدی اصطلاحوں مثلاً لانگ، پارول، معنی نما اور تصورِ معنی کی بیساکھیوں کی مدد سے جو چھلانگیں لگائیں اور پھر جس طرح نشانیات کے ماہر سوسیر کو تمام سماجی علوم کا سائنس داں قرار دیا، اس کے پیچھے ایک اہم اور خود غرضانہ مقصد بھی کارفرما تھا" مگر ابھی سارتر کے جیتے جی رائٹر کو حرف و لفظ کے تخلیقی و علمی اور فکری جہان سے جلاوطن کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود ایک انتہائی راز امریکی ہیجڑوں کی تحویل سے کسی طرح عیاں ہونے لگا...... کہ عربوں کے متعلق مشہور محاورہ "مالِ عرب پیشِ عرب" میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ "مالِ عرب پیشِ یہود"۔ تاہم ابھی اس کی توثیق محال تھی۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عرب ملکوں سے عربی شعر و ادب کیسے ناپید ہو گیا! وہ جو کبھی کبھار مصر اور لبنان سے جدید عربی شعر و نثر کے اردو تراجم پڑھنے کو مل جاتے تھے، وہ بھی عنقا ہو گئے۔ سوائے اس کے کہ عالمی منڈی میں عربی بول چال رہ گئی یا عرب ملکوں کے سربراہوں (ایک طرح سے امریکہ کی کٹھ پتلیوں کے نام میڈیا کے توسط سے سنے جانے لگے)۔

البتہ اس سے بہت پہلے جو دنیا کے حقیقی مسائل سے خود دنیا کی توجہ ہٹانے کے لئے ہر خاص و عام کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا ماسٹر پلان تیار ہو رہا تھا، اب اس پہ ایک اضافہ بطور ترمیم کچھ یوں کیا گیا کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے شعر و ادب اور ثقافت کو امریکہ کے حسب منشا یرغمال بنا لیا گیا۔ اس کے لیے امریکہ میں سب سے قابلِ نفرت دولت مند راک فیلر نے ایک فاونڈیشن کی بنیاد ڈالی۔ ستم ظریفی یہ کہ راک فیلر کو شعر و ادب اور ثقافت سے نہ کوئی لگاؤ تھا اور نہ دلچسپی تھی۔ تاہم رویہ سے ہیجڑے ہونے کی پہچان یا امریکی نمایندگی اس کا مخصوص حوالہ تھی۔ مگر اس کی فاونڈیشن میں جو قابلِ توجہ رازداری برتی گئی، وہ متعدد ثقافتی پروجیکٹس میں صرف کیے گئے کثیر مالی فنڈ کو بس کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگا گئی۔ اور اس کا کبھی بھولے سے پتہ نہیں چلا۔ بالکل اس لطیفے والی مثال کی طرح...... کہ کھانے کی دعوت کے دوران چاندی کا چمچہ اپنی جیب میں ڈالا کسی اور نے...... مگر نکلا وہ کسی اور کی جیب سے۔ مثلاً امریکہ سے بھاری رقم کا ایک چیک ریاض سعودی عرب میں واقع سائسو ریکس والے صلاح الدین پرویز کی جیب تک پہنچا اور یہ منظر اس کے کئی بہنوئیوں نے بغور دیکھا۔ مگر معلوم نہیں کیسے وہ چیک اسی دن دہلی میں گوپی چند نارنگ کی جیب سے نکلا! ظاہر ہے ان دونوں چوروں نے ساری رازداری ایک دوسرے کے مفاد کے تحفظ کے لئے برتی مگر بھولے سے بھی راک فیلر فاونڈیشن کے ثقافتی فنڈ کا ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مارچ ۱۹۸۰ء کے دوران دہلی میں منعقد کیے گئے اردو

کہانی کے پاک و ہند سیمینار میں یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ مہتمم گوپی چند نارنگ کو بھارت سرکار کی وزارتِ تعلیم کے توسط سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے فنڈ فراہم کیا یا کسی اور نے! کیونکہ سیمینار کے کثیر اخراجات کی نوعیت تصرف بے جا کی چغلی کھا رہی تھی اور ایسے میں وہاں صلاح الدین پرویز کی مدح سرائی میں پیش پیش تھے گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی! ممکن ہو، صلاح الدین پرویز نے کمپیوٹر کی مدد سے لکھوائی ہوئی نمرتا سمیت ساری کتابیں راک فیلر فنڈ کے زمرے میں ہی چھپوائیں۔ جبکہ بیچ کھیت مارا گیا بلراج مین را...... کہ بے چارہ "کمپنی کی مشہوری" میں بس مفت ہی استعمال ہوا۔ جیسا کہ صلاح الدین پرویز نے ایک موقع پر ڈینگ ہانکتے ہوئے کہا "میں نے مین را سے افسانہ نگاری چھڑوا کے لگا دیا نمرتا کی چھپائی میں"۔

دراصل گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی تو بہت پہلے سے ہی بکاؤ نقاد تھے۔ البتہ انھیں دیگر بکنے والے شاعروں ادیبوں اور نقادوں کی بہ نسبت زیادہ قیمت ملی۔ حال ہی میں ماہنامہ شاعر بمبئی جولائی ۲۰۰۰ء کے شمارے میں نقد و نظر کے صفحہ پر مظہر امام کے نام مشاہیر اردو کے خطوط مرتب امام اعظم تبصرہ شائع ہوا ہے۔ مبصر محافظ حیدر نے حسن نعیم کی تحریر کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے "پروفیشنل نقاد بک چکے تھے، دس ہزار روپے لے کر صلاح الدین پرویز پر ستے ہیں، مضامین لکھے جا رہے ہیں" جبکہ دوسری طرف صلاح الدین پرویز کو ۸۱۔۸۳ کے دوران پاکستان کے بکاؤ شاعروں ادیبوں خصوصاً نقادوں کو خریدنے کی تفویض Assignment کو بھگتانا تھا۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں وہ پہلے سے ہی بڑا تجربہ کار تھا۔ اپنی سگی اور رشتے کی کئی بہنوں کے لیے ضرورت مند بہنوئیوں کو خریدنے کا تجربہ اسے ہندوستان کی غریبی اور فیملی یونٹ کی تباہی سے ہوا ہوگا۔ جب لڑکیوں کے بیاہ کی خانہ پری کے لیے بکاؤ دولہوں کو خریدے جانے کا چلن ہوا۔ البتہ صلاح الدین پرویز نے اپنی بہنوں کے لیے جو بہنوئی خریدے ان میں سے کئی تو اس کی دولت کی طرف اس طرح بھاگے جیسے کوہ ندا یا اخی کی ندا سن کے بھاگے چلے جاتے اور کبھی واپس نہ آتے، تاہم جب صلاح الدین پرویز کے ایک بہنوئی آشفتہ چنگیزی میں اس کے خلاف ذرا سی چنگیزیت جاگی تو اس نے نارنگ اور محمود ہاشمی کے تعاون سے اغوا کرا کے اسے غائب کروا دیا یا ہلاک کروا دیا کیونکہ وقوعہ کے بعد آج تک پتہ نہیں چلا کہ اسے آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی! وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بہنوئیوں کو خریدنے اور انھیں ہر ناجائز دباؤ میں رکھنے کے آزمودہ تجربے نے صلاح الدین پرویز کی عادت اتنی بگاڑ دی کہ اس نے کراچی میں سلیم احمد کو ایک لاکھ روپے میں خریدتے ہوئے اپنے متعلق حسب منشا مضمون لکھوانے کا سختی سے پابند کر دیا۔ ایسی ہی بے بسی میں انھوں نے محض بلا ٹالنے کے لیے اسے مطمئن کر دیا۔ جبکہ وہ ادھر ادھر کہتا پھرا گویا سلیم احمد نے مضمون لکھنے کی وصیت کر دی ہے۔ کسی وجہ سے جب سلیم احمد مضمون نہیں لکھ سکے تو اس نے فون پر انھیں دھمکی دینا شروع کی۔ راوی کا بیان ہے کہ اس دھمکی کا سلیم احمد کے قلب پر اتنا شدید اثر ہوا کہ نیند میں ہی وہ موت سے جا ملے۔ اس پر بھی صلاح الدین پرویز نے تہذیب ظرف سے کام نہیں لیا۔ جیسا کہ وہ سلیم احمد کے بھائی شمیم احمد (جو کم از کم بکاؤ نقاد نہیں تھے) کے پاس گیا اور سلیم احمد کی خودساختہ وصیت کے

حوالے سے ان کو مجبور کیا کہ وہ مضمون کے مقروض بڑے بھائی کا قرض اتارنے کے لیے مضمون لکھیں۔ اس دریدہ دہنی کو برداشت نہ کر کے شمیم احمد نے صلاح الدین پرویز پر جوتا کھینچ کر مارا۔ اس پر بھی وہ اپنے غیر انسانی رویہ پہ شرمسار نہیں ہوا۔ بلکہ شہرت کے جلد از جلد حصول کے لیے کراچی سے لاہور کا رخ کیا جبکہ پہلے سے ہی لاہور میں اس کے شاندار استقبال کی تیاری کے لیے سلیم احمد کے ہی ایک پٹھے سراج منیر نے ایک موٹی رقم وصول کی۔ مگر اس رقم میں سے معلوم نہیں سراج منیر نے بکاؤ نقاد جیلانی کامران کو کتنا دیا! سوائے اس کے کہ راوی کا بیان ہے، اسی رقم میں سے جیلانی کامران کا دانہ پانی اب تک جاری ہے۔ البتہ چونکہ ایک ہیجڑے کے استقبال اور اعزاز کے لیے بھی تو اس کی نسل کے ہی ہیجڑے درکار تھے۔ لہٰذا اردو تنقید میں امتزاجی تنقید (ایک طرح سے ہیجڑا تنقید) کی بنیاد ڈالنے والے ڈاکٹر وزیر آغا نے لاہور کی دربار داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے صلاح الدین پرویز کی پذیرائی تو خوب کی۔ مگر انتظار حسین، انور سدید، اور کشور ناہید نے جو صلاح الدین پرویز کی دربارداری کی تو کیوں کی! شائد انہیں توقع تھی کہ صلاح الدین پرویز انہیں راتوں رات متمول بنادے گا۔ معلوم ہوا کہ اس نے انہیں متمول تو نہیں بنایا مگر بنانے کا وعدہ کر گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کراچی میں کئی بدنصیب سائیسوریکس کی جاب پانے کی لالچ کے سبب اس کے جھانسے میں آگئے اس نے بالکل عیاش عرب شیوخ کی مثل نو عمر لڑکیوں کو پھانسا۔ اس طرح کہ ان کے لالچی دلال بھائیوں کو سائیسوریکس کی طرف سے محض زبانی جمع خرچ کے طور پہ ریکروٹنگ ایجنٹ بنا کے اپنی راہ چلتا بنا۔ پھر ہوا یہ کہ اس قبیل کی بہنوں والے کئی بھائی دھوکا کھانے کے بعد صلاح الدین پرویز کے شناسا لوگوں سے پوچھتے پھرے۔ مگر صورتِ حال تو انا للہ وانا الیہ راجعون سے مشابہ تھی۔ کوئی کیا کر سکتا تھا۔ ویسے انتظار حسین، انور سدید اور کشور ناہید پر کوئی خاص فرق اس لیے نہیں پڑا کہ ان کے یہاں ہیجڑا پن "مرے ہوئے پانی کی مثال تھا" اور ان کی دربار داری "چت بھی میری پٹ بھی میری" کی عادی رہی البتہ کشور ناہید اپنے ذیلی مفادات یا مفاداتِ پیوستہ میں حائل مردوں کو مغلظ مردانہ گالیاں اس لیے دیتی تھی۔ ویشیا جو سنسکرت ناٹک کار شودرک کے ناٹک مرچھ کٹک میں شمشان میں کھلے ہوئے پھول کی مانند بیان کی گئی ہے۔ آخر شمشان میں کھلے ہوئے پھول میں بھی تو کوئی خوشبو ہوتی ہوگی۔ جبکہ مرچھ کٹک کی وسنت سینا میں عورت اتنی زندہ تو تھی کہ اس نے چارودت سے اس کی غریبی کے باوجود پریم کیا۔ یہاں تک کہ اس نے چارودت کے کمسن بیٹے کی مٹی کی گاڑی کو سونے، رتن اور جواہر سے بھر دیا۔ اس کے برعکس جاوید شاہین کے مضمون "یوسف کی خریدار" میں ایسے گھناؤنے حقائق بیان کئے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا بیان کئے مذکور منحوس ناموں کے درمیان "باہمی دلچسپی کے امور" مشترک ہوں!

البتہ صلاح الدین پرویز کے خلاف مہم اس وقت ناگزیر ہوئی جب مذکور ہیجڑوں کا گروہ شعر و ادب کی نشوونما کے درپے ہوا۔ یہ ۱۹۸۱ء کا عرصہ تھا۔ یہاں ہیجڑوں کے گروہ کے پس منظر میں جانا تو محال ہے مگر باقی پیش منظر نو دو تیے پن کے اس گھٹیا مظاہرہ پہ مشتمل تھا جب کچھ اسطرح کا بڑبولا پن سماعت میں پڑا

"میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی بیوہ کو پانچ سو روپے بھیجتا ہوں"...... تو وہاں قریب ہی بیٹھے ہوئے بد نصیب مدعوین میں شامل عبید اللہ علیم، ریحان صدیقی اور احمد ہمیش کو بیک وقت ناگوار گزرا۔ یہاں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ احمد ہمیش کے چہرہ پر ناگواری کا تاثر صلاح الدین پرویز کی نوٹس میں آگیا۔ اس کے بعد ہی تو کمال اداکاری سے احمد ہمیش کو ٹریپ کیا گیا۔ اس کے غنڈوں میں ٹی وی کے کچھ اداکار بھی شامل تھے۔ اداکار بہت سے چہروں کی اداکاری کرتے کرتے آخر اپنے چہرہ سے محروم ہوجاتے ہیں، ان کا اپنا چہرہ تو ہوتا نہیں، ان کی اپنی ذات تو کوئی ہوتی نہیں۔ سو، احمد ہمیش کو ٹریپ کرنے والے غنڈے یا اداکار تو صلاح الدین پرویز سے معاوضہ پاچکے تھے۔ اب وہ کچھ بھی کرسکتے تھے۔ انہوں نے گن پوائنٹ پر "دوسرا نروان" مضمون احمد ہمیش سے ہی کچھ اس طرح لکھوایا کہ عنوان تو نارنگ کا تجویز کیا ہوا درج کردیا۔ جب کہ بیشتر جملے اور پیراگراف سلیم احمد اور سراج منیر کے تھے۔ گن پوائنٹ پر مضمون لکھوانے کے ساتھ ہی ایک کمسن لڑکی کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کے فرضی الزام سے بلیک میلنگ بھی کی گئی۔ افسوس تو یہ کہ ساری کاروائی کسی گھٹیا فلم کے منظر جیسی تھی۔ مگر ایک گھٹیا معاملے میں عزتِ نفس اور جان دونوں خطرے میں تھیں۔ اس طرح ہلاک ہونے پر دنیا کو خبر تک نہ ہوتی۔ اس لئے کسی بھی طرح جان کی سلامتی ناگزیر تھی۔ آخر نجات ملتے ہی احمد ہمیش نے ریحان صدیقی سے جلد از جلد رابطہ قائم کیا اس کے بعد ہی تو صلاح الدین پرویز کے خلاف مہم کا آغاز ہوا۔ مذکورہ واقعہ کی پوری تفصیل کلام حیدری مرحوم کے رسالہ ماہنامہ "آہنگ" بہار میں شائع ہوئی۔ البتہ اس سے قبل ان دنوں علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ "الفاظ" میں جعلی مضمون "دوسرا نروان" شائع کرنے پر احمد ہمیش نے ابوالکلام قاسمی کے نام ایک خط میں سرزنش کی تھی اور ماہنامہ آہنگ میں متعلق تفصیل کی اشاعت کی یاددہانی بھی کرائی تھی۔ مگر ابوالکلام قاسمی نے کوئی جواب نہ دے کر مجرمانہ خاموشی اختیار کرلی۔ تاہم مہم عرصہ تک جاری رہی اور اس دوران پاک و ہند کے اخبارات و رسائل میں صلاح الدین پرویز کے مذموم حربوں کی تفصیلات مسلسل شائع ہوتی رہیں۔ اس مہم کا اتنا اثر ہوا کہ صلاح الدین پرویز سمیت گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی وغیرہ منظر عام سے طویل عرصہ تک کے لئے غائب ہوگئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہیجڑے اپنے مردے رات کے اندھیرے میں کہیں چپکے سے دفن کرکے اوپر سے مٹی کو چورس کردیتے ہیں، قبر کی پہچان بالکل نہیں رکھتے۔ بہت دنوں بعد سننے میں یہ آیا کہ صلاح الدین پرویز نے بمبئی میں اپنے ہی جیسے چمگادڑوں سے مل ملا کے ایک فلم "جنبش" بنائی۔ مگر جنبش ڈبے میں بند رکھی ہوئی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرسکی۔ لگ بھگ ۹۳۔۹۴ تک شعروادب کی کسی بھی سطح پر صلاح الدین پرویز سمیت گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی کی نوٹس نہیں لی گئی۔ ان راندۂ درگاہ عناصر کے لیے شعروادب کا میدان دشتِ عنقا بن گیا۔ اور اب العطش...... العطش کی نوبت آیا چاہتی تھی کہ پھر وہی ازلی وابدی مردود اور روئے زمین کے تمام مصائب کے ذمہ دار امریکہ میں گے Gay اور لزبئن Lesbian کی بن آئی۔ کہاں تو پہلے دنیا بھر میں بھوک، غریبی اور حقوقِ انسانی کی پامالی پر احتجاج کیا جاتا رہا تھا، تحریکیں چلائی جاتی رہی تھیں۔ اس

کے بر عکس وہ دن آگئے کہ گے اور لزبین کے حقوق کی سرپرستی میں امریکہ ہی پیش پیش رہا۔ یہ کیا ستم تھا کہ جو مخلوق زمین پر نسلِ انسانی کی پیدائش، نشوونما اور ہر ذی روح مخلوق یہاں تک کی پیڑ پودوں کے پھل پھول اور نمو کی روک ٹوک وبندش، قطع وبرید اور آختہ کردینے کے حقوق کے لئے تحریک چلانے لگی، اسی کے دوٹوں سے کلنٹن امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ بلکہ اس کے فوراً بعد ہی راک فیلر فاونڈیشن کے نئے ثقافتی پروجیکٹس میں مابعد جدیدیت کے پروجیکشن کو شامل کیا گیا۔ جبکہ ہندوستان پاکستان سے امریکہ سدھارے ہوئے کچھ لوگ مثلاً چودھری محمد نعیم، افتخار نسیم، اور ڈاکٹر عذرا رضا نے تو گے اور لزبین کی اگوائی سنبھال لی۔ البتہ گوپی چند نارنگ ہندوستان میں اور ڈاکٹر وزیر آغا پاکستان میں گے اور لزبین کے ہمنوا بن گئے۔

معلوم ہوا کہ یہ ساری اگوائی اور ہمنوائی امریکی ادبی تھیوری کے توسط سے مابعد جدیدیت کے پروجیکشن میں خصوصی معاون ثابت ہوئی۔ اس ساری ٹکنالوجی کو تمام اگلے پچھلے رجحانات کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت، نئی ترقی پسندی، تجریدیت اور علامتیت کو مکس کرکے ایک طرح کا ملغوبہ یا گڑبڑ گھٹالہ بنا یا گیا۔ گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا نے ہندوستان پاکستان کے کئی ذہنی غلام نیم ادبی رسائل پکڑ لئے۔ نگر گئے مابعد جدیدیت کے ترجمہ کئے ہوئے مضامین اپنے نام سے دھڑا دھڑ چھپوانے۔ درمیان میں کہیں سے آملے دیویندر اسر، جو کمزور شخصیت ہونے کے سبب ترقی پسندی اور جدیدیت میں جب کسی طرح نہیں کھپے تو اس محرومی کے ازالہ کے لیے شریمان جی نے مابعد جدیدیت کی دُم پکڑ لی۔ پھر وہ بہ زعم خویش خدا، انسان، تاریخ، مذہب، ثقافت، نظریہ، ادب اور ادیب کی موت کے اعلانچی یا ڈھنڈورچی بن گئے۔ اس پر سابق ماہنامہ دریافت کے مدیر قمر جمیل (جو شعروادب کے کئی قرض ادا کئے بغیر مرحوم ہو چکے ہیں) اور ماہنامہ صریر کے مدیر فہیم اعظمی (جو بہ قید حیات ہیں مگر جھوٹ، بد دیانتی، اور جہل کے رائدین میں سے ایک ہیں) یا بقول فضیل جعفری...... نارنگ کے ادبی چلغوزے جمیل و فہیم ادبی ساجیات کی برساتی سیلن، غلیظ رطوبت اور طرح طرح کے مردہ ڈھیر پر پیدائشی عمل کے بغیر آپ ہی آپ اگ آنے والے کُکر متوں Fungus کی طرح ہر ذی روح یا زندہ عناصر ومظاہر کے پیراسائیٹ بن گئے اور لگے مابعد جدید تحریروں کے ڈھیر لگانے۔ مگر کاغذ پر مترجم نہ درج کرکے سالم مصنف بن بیٹھے۔ خیال رہے کہ نباتیات میں کُکر متوں کا شمار پودوں میں نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر زندگی کے خاتمے کی متعدد مثالوں میں بیشتر کُکر متوں کا دخل رہا ہے مثلاً ۱۸۴۵ء میں آئرلینڈ کی سیاسی صورت حال کے زیر اثر آلو کی کثیر فصل کو کُکر متوں کی ایک قسم سے تباہ کر دیا گیا تھا۔ اور لاکھوں لوگ قحط سے مر گئے تھے۔ البتہ بنگال کا بھیانک تاریخی مصنوعی قحط بھی چاول کی فصل میں کیڑوں کی ایک قسم کے استعمال کا نتیجہ تھا۔ ۹۰ کی دہائی کے دوران ہندوستان میں جو طاعون کی جو وبا آئی تھی اور اس میں بہت سی جانیں تلف ہوئی تھیں، اس میں دراصل امریکہ اور ہندوستان کی سرکاری ملی بھگت سے کُکر متوں کی ایک قسم کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے راز کو راز رکھنے کی پالیسی کے تحت خبر رساں ایجنسیوں کو بھاری رشوت دے کر کوئی سچ خبر شائع کرنے سے روک دیا گیا۔ ایک سائنسدان کی تحقیق کے مطابق

گمر متوں کی زہریلی اقسام سے انسانی جسم کی قوتِ مدافعت کو ختم کر کے کینسر اور ایڈز جیسی مہلک بیماریوں میں مبتلا کیا جاتا رہا ہے۔ اس موضوع پہ تفصیل سے بات ہو سکتی ہے۔ تاہم فی الحال یوں سمجھئے کہ شعر و ادب کے زمرے میں مابعد جدیدیت جو کینسر اور ایڈز جیسی ہی مہلک بیماری سے مختلف نہیں، اس کے انڈے بچوں کا دخل گمر متوں کی شمولیت سے ہوا ہے۔ مثلاً ساقی فاروقی نے اپنی ایک تحریر میں ڈاکٹر وزیر آغا کو کچھ یوں ہدف بنایا ہے کہ وزیر آغا کس طرح نظمیں لکھتے ہیں؟ بالکل ویسے ہی جیسے کتے جہاں کہیں کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتے ہیں وہیں گمر متے اُگ آتے ہیں۔ تاہم مابعد جدید کاروائیوں اور کارگزاریوں میں گمر متوں کی شمولیت جناتیاتی تحقیق کی رُو سے کچھ اس طرح پائی گئی ہے کہ گمر متے جین Gene کے عمل سے عاری از قسم ہیجڑے ہوتے ہیں۔ گمر جس طرح وہ جین کے اہل پودوں کے جین کی چوری کر کے ان کی زندگی ختم کرتے ہیں بالکل اسی طرح مغربی ملکوں کے ریسرچ اسکالر بالکل مجموعی طور پر امریکی اسپانسر شپ میں ورلڈ بینک، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور آئی ایم ایف کے نمائندے گلوبل اکانومی اور گلوبل ویلج قائم کرنے کے لیے ایشیائی ملکوں خاص کر برِ صغیر میں ریسرچ کے بہانے آتے ہیں مگر وہ گمر متوں ہی جیسی خفیہ تباہ کاریاں مثلاً گندم، چاول، اور دیگر قیمتی اجناس سے جین چوری کر کے چلتے بنتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ملک کی محقق خاتون بدجبیں زہرہ برائے نباتیات و جینیات اپنے ایک مضمون "ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم" میں رقم طراز ہیں "امیر ممالک کی انجمن (OECD) کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق صرف امریکہ جو کہ امداد کے حوالے سے تیسری دنیا کا نجات دہندہ نظر آتا ہے، کی زراعت کا دارومدار تیسری دنیا کے ان حیاتیاتی وسائل پر ہے اور ان سے وہ کئی عرب امریکن ڈالر کا سالانہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ صنعتی ممالک خام جڑی بوٹیوں کو تیسری دنیا سے ارزاں قیمت پر خرید کر ان سے تیار کردہ ادویات سے ۴۰ ملین امریکن ڈالر سالانہ منافع حاصل کرتے ہیں"...... اور یہی تو ہے مارکیٹ اکانومی اور گلوبل ویلج کا فراڈ، جو آسانی سے اس لئے نہیں کھلتا کہ مابعد جدید اسکیم سے ہی ہندوستان پاکستان کے بڑے شہروں میں کے ایف سی، میکڈونلڈ اور پزاہٹ کھولے جانے لگے۔ اس طرح کہ کسی بھی ہندوستانی بڑے شہر کی برگر کلاس کے ایریا میں کے ایف سی، میکڈونلڈ اور پزاہٹ کی برانچیں کھولنے کا مقصد شہر کے باقی آبادی والے ایریا میں بھوکے ننگے مرتے ہوئے لوگوں سے غفلت کا ریڈی میڈ جواز فراہم کرنا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ بیشمار ٹی وی چینل ۲۴ گھنٹے مسلسل حرام خوری اور عیاشی پر مشتمل تفریحی پروگرام پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اختلاط کے عام مناظر دیکھ دیکھ کے بچے نوجوان بوڑے بوڑھے سبھی تباہ ہو رہے ہیں۔ برِصغیر کی حکومتوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان کے عوام تفریحی پروگراموں کو دیکھ دیکھ کے ضائع ہو جائیں۔ اور انہیں کبھی زندگی کے حقیقی مسائل کی طرف دیکھنے کی مہلت نہ ملے۔ یعنی ایک عام تاثر یہ قائم کیا جائے کہ ہندوستان پاکستان میں کوئی بھوکا ننگا مر نہیں رہا ہے، سب ہی برگر اور پزا کھا رہے ہیں بلکہ کوک پی رہے ہیں۔ جیسا کہ ایک تہراطوفوکوہاما نے امریکہ میں ایک لیکچر دیتے ہوئے کہا "چونکہ تاریخ مر چکی ہے لہٰذا دنیا کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ سب کو کھانے کے لیے برگر وغیرہ اور

پینے کے لیے کوک اور ڈرنک میسر ہے"...... ظاہر ہے ایسی ہی دھوکا دینے والی آسانی میں راک فیلر فاونڈیشن کی طرف سے ثقافتی پروجیکٹس کے فنڈ کی نئی کھیپ دہلی پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے تو گوپی چند نارنگ کے زیر اہتمام دہلی میں مابعد جدیدیت پر سمینار اور ورکشاپ برپا کی گئی۔ اس کے بعد ہی تو بھارت سرکار کے ہاتھی کے کھانے والے دانت کے در پردہ شراکت دار تھے: گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز اور محمود ہاشمی! بس کیا تھا اتنی لوٹ کھسوٹ کی گئی کہ خدا کی پناہ! تب ہی ان غاصبوں کو مع ان کی مابعد جدیدیت کے، تنقید کا نشانہ بنایا شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری نے۔ جب کہ احمد ہمیش نے ریحان صدیقی کے مشورے اور تعاون سے سہ ماہی تشکیل کے ذریعہ مابعد جدیدیت کے قلع قمع کی ٹھان لی۔ ظاہر ہے، غاصبین شعر و ادب تاب نہ لا سکے۔ اور چونکہ ہیجڑے بہر حال بہادروں سے ڈرتے ہیں۔ کبھی وہ ان کے سامنے نہیں آتے۔ خفیہ ہونے کے ناطے ان کی حرکات و سکنات طول پکڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا نہ جانے کب سے سہ ماہی "استعارہ" کے اجرا کی تیاری ہو رہی تھی! صلاح الدین پرویز چوری چھپے مراسلت کر رہا تھا۔ ایک خود دار بہنوئی کے فلیٹ پہ قبضہ کر کے استعارہ کا دفتر بھی اسی میں قائم کیا گیا۔ جب کہ حقانی القاسمی نام کے ضرورت مند طالب علم کی مجبوری خرید کے اسے معاون مدیر بنا لیا گیا۔ تاہم کافی رقم لگا کے استعارہ کا پہلا شمارہ تو شائع کر لیا گیا۔ بلکہ اس کی کاپیاں کثیر ڈاک خرچ سے بہتوں کے پتوں پہ ارسال کی گئیں۔ سوائے اس کے کہ احمد ہمیش کے نام اور پتے پر کاپی ارسال نہیں کی گئی۔ معلوم نہیں کون سا خوف تھا، جو بزدلوں کی درز پوشیدہ میں جا گھسا! کسی اور ذریعہ سے جب رسالہ نظر میں آیا تو یہ دیکھ کے جی مکدر ہو گیا کہ سرورق سے اندر کے صفحات تک گٹ اپ اور مشمولات وغیرہ بھی سہ ماہی تشکیل کی بھونڈی نقل ثابت ہوئے۔

ویسے تو ہندستان پاکستان سے کئی رسائل سہ ماہی تشکیل کی نقل میں نکل رہے ہیں۔ مگر کسی رسالہ کے مدیر میں نقل کے اعتراف کی اخلاقی جرات نہیں۔ سہ ماہی تشکیل کے اداریوں کی نقل میں بعض رسائل اداریے لکھنے بیٹھ گئے۔ مگر ظاہر ہے، بزدل لوگ نہ تو خلاق اور عالم ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی اصیل ادبی رسالہ کے مدیر ہو سکتے ہیں۔ جبکہ کوئی بھی رسالہ صرف کثیر مالی وسائل سے ہی نہیں نکلتا بلکہ اس کے پس منظر میں مدیر کی خلاقانہ اور علمی شخصیت بھی ناگزیر ہے۔ اسی لئے احمد ہمیش کے مقابل آنا آسان نہیں اور یہ خیال رہے کہ جنگ اکیلا آدمی ہی لڑتا ہے۔ ایک سے زیادہ یا کوئی گروہ جنگ نہیں لڑ سکتا۔ اکیلے پن کا مفہوم ہے بہادری۔ جبکہ گروہ کا مطلب ہے بزدلی یا ہیجڑا پن۔ جیسا کہ سہ ماہی استعارہ کے شناختی نشان Logo gram کی جگہ درج ہے...... "ادب کے سناٹوں کو توڑتی ہوئی تیسری آواز"...... جبکہ تیسری آواز تو ہیجڑے کی آواز ہوتی ہے۔ البتہ سہ ماہی تشکیل کے لوگو گرام "زندہ اور نمائندہ ادب کا شاک انگیز استعارہ" سے لفظ استعارہ چوری کر کے صلاح الدین پرویز اینڈ کمپنی نے اپنے رسالہ کا نام استعارہ رکھ لیا۔ اور اپنے ناجائز تمول کی گدی پر مطمئن بیٹھ رہا کہ گویا چوری کبھی پکڑی ہی نہیں جائے گی۔ مگر صلاح الدین پرویز کو تولے ڈوبے گرو گھنٹال نارنگ اور ان کے چیلے بشمول محمود ہاشمی جیسے پیرا سائیٹ۔ البتہ پاکستان سے انتظار

حسین اور جیلانی کامران وغیرہ کی بھی تیسری آواز شامل ہو گئی۔ اب اس کو کیا کہا جائے کہ گروہ تو محض شر کی پیداوار ہوتا ہے اس کا علم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا بیشتر گزارا فتنہ وفساد اور فسق وفجور بلکہ مجموعی طور سے جہل پر ہوتا ہے۔ اسی لئے سہ ماہی استعارہ کے مشمولات میں ایک مضمون نہ تو علمی ہے اور نہ ہی اس پر مصنف کا اصل نام درج کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے، اصل نام درج کرنے کی جرات تو کسی بہادر میں ہی ہوتی ہے۔ نام چھپانے والے تو ہیجڑے ہی ہوتے ہیں۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ "مولا بخش اسیر" کوئی مرد ہیجڑا ہے اور زینب علی کوئی عورت ہیجڑا یا عورت ہے۔ روایت میں تو پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق ہوا کرتا تھا۔ تذکیر و تانیث کے فرق سے قطع نظر معشوق کے ہونے کا سارا لطف پردۂ زنگاری کے تجسس میں ہوتا تھا۔ مگر موجودہ عہد میں اشاعت وطباعت کی غارت گری کچھ اس طرح ہوئی کہ محض حسد، غیبت، عداوت، لتی بغض، بہتان، الزام تراشی اور دروغ گوئی سے کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ہیجڑے اپنے نام "خامہ بجوش" "منشی چراغ دین" "مولا بخش اسیر" اور زینب علی رکھنے اور چھپوانے لگے۔ زرد صحافت اور ادبی ساجیات کی صحافت کا چلن بھی اسی طرح ہوا۔ یہاں اگر ایک نظر کی جائے تو سہ ماہی استعارہ میں جو زرد یا نارنجی (نارنگ کا رنگ نارنگی) کاغذ لگایا گیا ہے، وہ زرد صحافت اور ادبی ساجیات کی صحافت کی غمازی کرتا ہے۔ ہاں اس کا مقابلہ مختلف وقتوں میں بہادروں نے کیا ہے۔ مثلاً ضمیر نیازی کی تصانیف Press in chains...... صحافت پابند سلاسل (اردو ترجمہ اجمل کمال) اور حکایات خونچکاں (مرتب راحت سعید) میں برصغیر کی ادبیات اور صحافت کے مشنریز راجہ رام موہن رائے، مولانا حسرت موہانی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کے اسمائے گرامی کے حوالہ سے اس حقیقت کا واضح طور پہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان ہستیوں نے انگریزوں اور انگریزی اقتدار کے خلاف انتہائی بہادری اور جرات سے لکھا اور شائع کیا۔ ان کے اداروں پر حکم انگریز سرکار پابندی نافذ کی گئی۔ پھر بھی ان میں سے کسی نے اپنا اصل نام نہیں چھپایا۔ کسی نے بھی فرضی یا جعلی نام سے نہیں لکھا۔ حالانکہ گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، انتظار حسین، مشفق خواجہ، انیس ناگی اور صلاح الدین پرویز ایسے دور میں رہ رہے ہیں، جس میں پریس بہتو کسی حد تک آزاد ہے۔ ہندوستان پاکستان کی حکومتوں نے بہت سی قباحتوں کے باوجود پریس پر کوئی ناقابل شکن پابندی نافذ نہیں کی۔ اس کے باوجود گوپی چند نارنگ صلاح الدین پرویز کی پشت پر کھڑے ہو کے یا بیٹھ کے مابعد جدید حربوں سے آل احمد سرور، شمس الرحمن فاروقی، قرۃ العین حیدر، فضیل جعفری، باقر مہدی اور احمد ہمیش کو ہدف بنا رہے ہیں اور اپنے اصل نام سے کچھ کہنے اور لکھنے کی ہمت نہیں ہے تو مولا بخش اسیر اور زینب علی جیسے جعلی نام سے کب تک اپنی پشت بچا سکیں گے!! البتہ افسوس تو اس قباحت پہ ہوا کہ سہ ماہی استعارہ کی گروہی سیاست میں یا تو خود بنا سوچے سمجھے شریک ہو گئے ممتاز نقاد شمیم حنفی یا انجانے میں انہیں ملوث کیا گیا۔ پھر بھی ۱۹ سال کے دوران ان کی یادداشت اتنی تو متاثر نہیں ہوئی ہو گی کہ ۱۹۸۰ء میں دہلی میں منعقد ہوئے پاک وہند اردو کہانی کے سمینار کے پہلے ہی دن گوپی چند نارنگ نے شمیم حنفی کو ان کی رہائش کے دروازہ پر کسی غنڈے کی طرح کھڑے ہو کر

مغلظ گالیوں اور دھمکیوں سے ذلیل کیا، مارے خوف کے شمیم حنفی اندر سے باہر نہیں نکلے۔ ان کی اہلیہ اور بچے رونے لگے۔ جبکہ انتظار حسین ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے مہمان کی حیثیت سے خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ شمیم حنفی کا بس اتنا ہی قصور تھا کہ انہوں نے انتظار حسین کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرالیا تھا۔ اس سانحہ کو یاد رکھتے ہوئے تو انہیں بیک وقت گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز اور انتظار حسین سے تعلق ختم کر دینا چاہیے تھا۔ مشکل یہ ہے کہ ہر رسالہ میں چھپنے اور اس طرح مشہور ہونے کی لالچ بھی تو آدمی کی ذیلی نفسیات کا ہی ایک حصہ ہے مثلاً استعارہ کے زرد یا نارنگی صفحات پر ظفر اقبال نے صلاح الدین پرویز اور گوپی چند نارنگ سے سلسلہ جنبانی جوڑنے میں منافقت کی انتہا کر دی۔ بڑی بے حسی اور خود غرضی سے انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کو ان کے تنقیدی احسان سمیت بھلا دیا۔ مگر بات تو وہی ہوئی نا کہ ...... کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق

قصہ حاتم طائی میں درج ہے کہ حاتم طائی کا گزر ایک ایسی بستی سے ہوا کہ جس میں لوگ خوفزدہ اور مغموم نظر آئے اور بستی منحوس اور اجاڑ تھی۔ حاتم طائی نے لوگوں سے جب پوچھا تو معلوم ہوا کہ بستی میں ہر مقررہ دن ایک بلا آتی ہے اور اپنے ہدف نوجوان کو اٹھالے جاتی ہے بلکہ اس کی شکل دیکھتے ہی نوجوان زمین پہ ڈھیر ہو کے بے جان ہو جاتا ہے۔ تبھی حاتم طائی نے بستی کے آئینہ سازوں کے تعاون سے قدِ آدم آئینہ بنوایا اور اس دن کے مقررہ ہدف نوجوان کے مکان کا رخ کیا، قدِ آدم آئینہ سمیت اندر داخل ہو کے مذکور نوجوان کو تو باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ پھر اس کی جائے خود قدِ آدم آئینہ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ جو نہی بلا مکان کے اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظر قدِ آدم آئینہ پر پڑی۔ بس کیا تھا، بلا آئینہ میں اپنی ہی شکل دیکھ کے زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس طرح بستی کے خوفزدہ اور مغموم لوگوں کو ایک بلا سے نجات مل گئی۔

ظاہر ہے، اس تحریر میں جو قصہ درمیانی مخلوق کا بیان کیا گیا ہے، اسے ایک طرح سے مذکور بلا ہی سمجھا جائے اور تصور کیا جائے کہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کے مقابل قدِ آدم آئینہ رکھا گیا ہے۔

اگست ۲۰۰۰ء۔ کراچی ۔

ایک درخواست

براہ کرم سہ ماہی تشکیل کراچی کے نام ہائیکو، سین ریو، ثلاثی، ماہیا، آزاد غزل، غلام غزل اور ترویئی ارسال نہ فرمائیں۔ خیال رہے کہ سہ ماہی تشکیل اعلیٰ معیاری ادبی جریدہ ہے۔ اس میں صرف شاعری شائع ہوتی ہے۔ (ادارہ)

پردہ اٹھتا ہے

ادارہ

(۱) چھچھوندروں کی عفونت

ابھی لکڑبگھوں اور گیدڑوں نے خوخیانا، ہونکنا، اور ہُواں ہُواں کرنا چھوڑا نہ تھا۔ ابھی وہ شیر کے اور جنگل شکار کو اچکنے میں لگاتار آگے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں...... بظاہر اپر مڈل کلاس کے صاف ستھرے رہائشی ایریا کے دورویا منزلہ دو منزلہ شاندار مکانوں کی صاف ستھری اسٹریٹ کے کارنر پر کسی چھچھوندر کے گزرنے کا گمان ہوا۔ اک دم چونک کے محسوس کیا تو پتہ چلا کہ عفونت قریب ہی سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے باوجود چھچھوندر کہیں نظر نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ اس کی مکروہ ہیت دھیان میں رہی معاً سہ ماہی آئندہ کے مدیر محمود واجد کو نگراں نظروں نے ایک دو منزلہ مکان کے مخدوش چکردار زینہ پر چڑھتے ہوئے پھر صاحبِ رہائش کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ جیسا کہ چھچھوندر میں نوزائیدہ سے باقی عمر تک والدینی بو Parental odour بسی رہتی ہے، جس کی عفونت سے ہی اس کا تحفظ ہوتا ہے خیال رہے کہ کافکا کی ایک کہانی "چھچھوندر" میں اس کی جسامت بڑی دکھائی گئی ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ڈرائنگ روم میں چھچھوندر کے داخلہ سے پہلے ہی بڑی عفونت پھیلی ہوئی تھی کئی لکڑبگھے اور گیدڑ کرسیوں اور صوفوں پر براجمان تھے ۔ ایسے میں سہ ماہی آئندہ کے تازہ شمارے کی اعزازی کاپیاں تقسیم کی گئیں۔ معلوم ہوا کہ محمود واجد نے شمارہ کے اداریہ نوٹ میں احمد ہمیش کی ادبی تاریخی حیثیت و حقیقت کی معاندانہ تردید کی تھی۔ تبھی وہاں بیٹھے ان کی برادری کے لوگ اس مشترکہ منصوبہ پہ متفق پائے گئے کہ احمد ہمیش کی ادبی حیثیت کا ستیاناس کرنے کے لیے محمود واجد کا ساتھ دینا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ احمد ہمیش نے نہ تو کبھی شاعری کی اور نہ کوئی کہانی لکھی۔ گویا شعر و نثر کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا جبکہ برادری والوں میں سے ایک فسادی نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ چھٹی دہائی کے افسانہ نگار نورالہدیٰ سید اپنے مکان پر کئی برس تک ہوتی رہی انجمن جدید مصنفین کی نشستوں کو ختم کرانے اور انجمن کی ہی ملکیت آئندہ کا مسودہ ہڑپ کر کے ڈیکلیریشن اپنے نام سے لینے کا الزام محمود واجد پر لگایا ہے۔ اس پر یاد آیا کہ ڈیڑھ سال گزرے نورالہدیٰ سید نے سلمان صدیقی کے گھر پر منعقد کی گئی ایک نشست کے دوران محمود واجد کی موجودگی میں یہ بتایا کہ پٹنہ بہار میں قاضی عبدلودود سے ان کے بڑے مراسم تھے۔ یعنی نورالہدیٰ سید

اور قاضی عبدالودود آپس میں شعروادب کی باتیں کیا کرتے تھے مگر محمود واجد کی بہ وجوہ قاضی عبدلودود تک رسائی نہیں تھی۔ یا شائد قاضی صاحب ناکارہ لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دراصل عرصہ دراز تک محمود واجد نے بیسویں صدی اور شمع ٹائپ افسانے لکھے اور ایسے ہی گھٹیا رسالوں میں چھپوائے یہاں تک کہ ایسے ہی افسانوں کا مجموعہ بھی چھپوایا مگر بعد کے حالات میں مارے شرم کے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں! انہیں جب جدیدیت کا ہوکا ہوا تو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوا کے کراچی آنے والوں میں وہ پیش پیش تھے۔ اس طرح بزعم خویش جدیدئن کے موصوف نے انجمن جدید مصنفین کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا۔ اس کے باوجود بھی جب وہ کوئی ڈھنگ کا افسانہ نہیں لکھ سکے اور اس ناکامی میں بوڑھے بھی ہو گئے تو بوڑھوتی میں سہ ماہی آئندہ جیسے رسالہ کی مدیری اختیار کر لی۔ مگر ڈرائینگ روم میں بیٹھے ان کے برادری کے لوگ معلوم نہیں کس بات پر بڑبڑانے اور کھسیانے لگے۔ تاہم محمود واجد سے ان کے بھارت کے سفر کی تفصیل معلوم کرنے پہ اصرار کیا گیا تب انہوں نے کچھ یوں بتایا کہ پنڈی اور اسلام آباد میں ان کی بڑی مان جان ہے۔ مگر باوثوق ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے پنڈی وال والوں کی اتنی چاپلوسی کی کہ ان میں سے کسی نے انہیں اپنے مکان میں کچھ دن ٹھہرا کے کھلایا پلایا اور رشوت اور سفارش سے بھارت کا ویزا دلوایا۔ موصوف نے بھارت کے سفر کا حال خود بیان کرتے ہوئے تو یہی ظاہر کیا کہ بھارت کے مختلف شہروں خاص طور پر دہلی اور ممبئی میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور یہ کہ بھارت میں سہ ماہی آئندہ کے سوا کسی بھی ادبی رسالہ کو شمار نہیں کیا جاتا۔ احمد ہمیش کے رسالہ سہ ماہی تشکیل کو بھارت میں کوئی جانتا ہی نہیں۔ اس تضاد بیانی پر معلوم نہیں ڈرائینگ روم میں موصوف کی برادری کے لوگ کیوں چپ ہو رہے! اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ غلط بیانی منافقت اور ریاکاری کی بنیاد ہے۔ اس لئے جب محمود واجد دہلی میں صلاح الدین پرویز کے وہاں کھانے پینے کی دعوت میں شرکت کا حال کچھ یوں بتانے لگے کہ وہاں تو شراب وکباب اور شباب کا دور چل رہا تھا اور انہیں پاکستانی مہمان کی حیثیت سے شریک کیا گیا البتہ جب وہ رخصت ہونے لگے تو صلاح الدین پرویز نے ان کے ہاتھ ایک بند لفافہ بطور نذر و نیاز تھمایا۔ موصوف اسے قبول کرتے ہوئے ہچکچائے شرمائے کہ پتہ نہیں اس میں کیا رکھا ہوگا! تبھی وہاں براجمان گوپی چند نارنگ بولے "لے لو بھائی...... شرماؤ نہیں...... یہ صلاح الدین پرویز کا تحفہ ہے...... عنایت ہے...... نوازش ہے...... کرم ہے"...... ظاہر ہے محمود واجد اپنی برادری والوں کو یہ کیسے بتاتے کہ لفافہ میں کیا تھا...... کہ جس کے عوض صلاح الدین پرویز اپنا پروجیکشن کروانے کے ساتھ ہی احمد ہمیش کے خلاف مہم چلانا چاہتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ چھچھوندر کو آسانی سے مارا نہیں جاسکتا۔ وہ اپنی والدین بوسے اپنا تحفظ تو

کرتا ہی ہے۔ مزید وہ اپنی عفونت سمیت کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ جاتا ہے۔ نگراں نظروں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اک دم چھچھوندر بندکور اور اس کی برادری کے لکڑ بگھے اور گیدڑ معلوم نہیں کس کونے کھدرے میں چھپ گئے یا ادبی سماجیات میں اپنی عفونت پھیلاتے ہوئے اپنے بلوں وغیرہ میں جا گھسے۔

الف۔ ایک ناکارہ افسانہ نگار کی دُوسرے ناکارہ افسانہ نگار کے بارے میں رائے

میں نے محمود واجد کے افسانوں کا مجموعہ "موسم کا مسیحا" پڑھا۔ دیباچہ کو بڑھے ہی عالمانہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مغربی مفکرین کے حوالے بھی موجود ہیں لیکن جب افسانے پڑھنے شروع کیے تو اس چند سطروں کے بعد آگے بڑھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوئی۔

(سلطان جمیل نسیم کے انٹرویو سے اقتباس۔ روزنامہ ایکسپریس ۲۵ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

ب : سچائی چھپ نہیں سکتی

"اردو دنیا" کے جولائی کے شمارہ میں آپ نے جدید افسانے کی دنیا کے جو قصے شائع کئے ہیں وہ دلچسپ تو ہیں مگر ادھورے...... مثلاً بقول محمود واجد جن "اہلِ قلم" کی احمد ہمیش نے بے حرمتی کی ان کے نام آپ نے حذف کر دیئے ہیں۔ "آئندہ" کے مذکورہ شمارہ میں وہ نام دیکھ لیں اور ادب کے موجودہ منظر کو سرسری نظر سے بھی دیکھیں تو جن اہلِ علم کی لسٹ محمود واجد نے بیان کی ہے ان میں سے بیشتر کی بے حرمتی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ خود کر چکے ہیں۔ احمد ہمیش کی تلخ بیانی سے تو محمود واجد کانپ اٹھتے ہیں لیکن جب انہیں ادیبوں کے خلاف ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ہرزہ سرائی کرتے ہیں تو ان پر کپکپی طاری نہیں ہوتی۔ پھر محمود واجد کا احمد ہمیش کے ذکر میں انہیں چائے پیش کرنے والا لڑکا بیان کر کے اپنے فلیپ لکھنے کا احسان جتانا ان کے بڑے پن کو نہیں بلکہ ان کے تکبر کو ظاہر کرتا ہے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ "لڑکا" اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر کہاں جا پہنچا ہے اور وہ خود کہاں رہ گئے ہیں!

(اردو دنیا جرمنی شمارہ ستمبر ۲۰۰۰ میں شائع ہوئے سعید شباب۔ خانپور کے ایک خط سے اقتباس)

نوٹ: ۷۰ء کی دہائی میں کہانیوں کا جو انتخاب مجلہ کی صورت احمد ہمیش نے ترتیب دیا تھا، اس میں محمود واجد کی تحریر میں کوئی فلیپ شائع نہیں ہوا۔ البتہ ۹۰ء کی دہائی میں محمود واجد کی درخواست پہ ان کی کہانیوں کے مجموعہ کے بروشر میں احمد ہمیش نے کچھ لفظ بطور حوصلہ افزائی ضرور لکھے۔

(۲) سابق شہنشاہ جاپان کی موت یا کارنامہ ہائیکو*(۱) کا

جاپانی شاعری کی مقبول صنف ہائیکو جاپانی زبان میں تو اپنے زمنی اور معاشرتی پس منظر میں

ضرور مطابقت رکھتی ہو گی۔ مگر جب سے پاکستان میں ہائیکو اردو کے مشاعرہ بازوں کے ہاتھ لگی اور جاپان قونصلیٹ جنرل کے منعقد ہوئے مشاعروں میں اردو ہائیکو سنانے والے مشاعرہ بازوں کو پانچ پانچ سو کے لفافے ملنے لگے تو اس طرح جاپانی شاعری کی ایک مقبول صنف کے زوال سے نوبت یہ آئی کہ اس صدمے کی تاب نہ لا کے سابق شہنشاہ جاپان فوت ہو گئے۔

---

* (۱) البتہ وضاحت نسیم کے مطابق صحیح تلفظ ہائیک ہے

۲(۱) ''مگر سچ کون بولے گا!''

تحریر: محبوب خزاں

کئی سال گزرے سہ ماہی ''نیا دور'' کراچی میں شائع ہوئے مضمون ''مگر سچ کون بولے گا!'' کے مصداق اگر ایک نظر کی جائے تو ضمیر نیازی کی شخصیت محولہ سوال کا مجسم جواب ہے
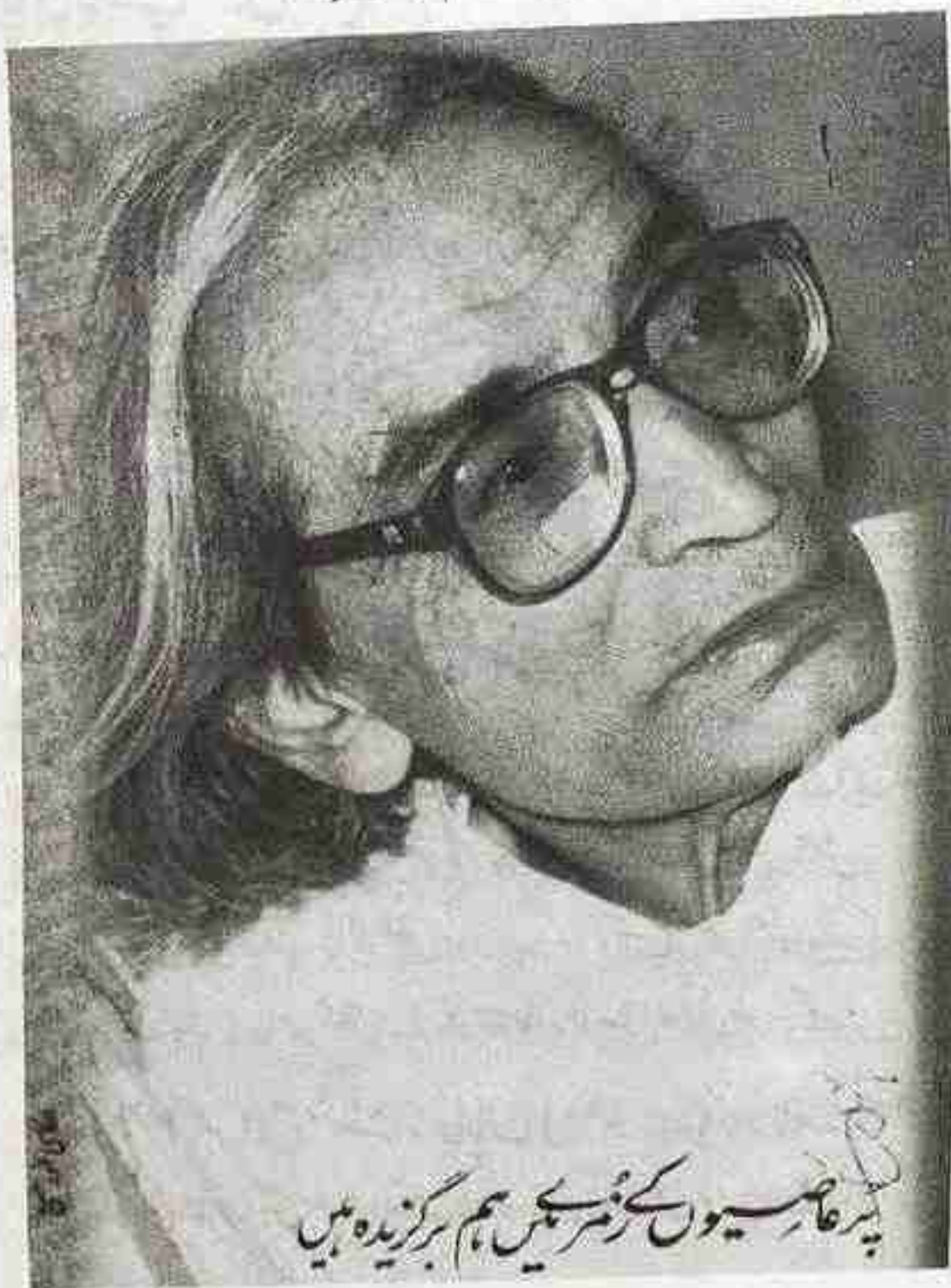
(۳)۔ منافقت اور چوری، دو سگی بہنیں!

منافقت اور چوری دو سگی بہنیں ہیں۔ دونوں اپنے ظاہر سے خود کو پوشیدہ رکھتی ہیں۔ اسی لئے دونوں آسانی سے نظر میں نہیں آتیں۔ اسی لئے مرزا حامد بیگ کا آگا پیچھا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کی منافقانہ حرکتوں کو دیکھتے ہوئے تو بیگ خاندان کا فرد معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پس منظر میں مغل خاندان کا کوئی سائیس رہا ہوگا۔ اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا۔ اس لئے خاندانی سرشت یا خو بو پر ایک نظر کرتے ہوئے مرزا حامد بیگ کے بجائے اس کا نام کچھ اور تجویز کیا جائے تو قوم کا بھلا ہو گا مگر فی الحال اس کی ضرورت نہیں ۔ سوائے اس کے کہ پنڈی وال حشرات الارض افسانہ نگاروں کی ناک کان وغیرہ سے دھواں نکلنے لگے تو کوئی تعجب نہیں۔ ممکن ہے وہ نوبت آجائے کہ منشا یاد کو اپنا نام بھی یاد نہ رہے۔ اور آئندہ وہ احمد ہمیش کے نام نامہ غضب لکھنا بھول جائیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مرزا حامد بیگ نے اپنا آگا پیچھا چھپا کے نظم کے ایک اچھے بھلے شاعر ابرار احمد کو اپنا آلہ کار بنالیا اور ان کی مٹی اس طرح خراب کی کہ وہ اپنی اوسط درجہ کی خوشحالی پر اکتفا نہ کر سکے۔ محض سوشل اسٹیٹس انجوائے کرنے کے لئے اندھوں میں کانا راجا کی مثل لاہوریوں کے درمیان انٹیلیکچوئل بننے کی سوجھی تو مرزا حامد بیگ کی ہدایت پر اک دم احمد ہمیش کے خلاف ہو گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ احمد ہمیش کی نظموں کہانیوں اور تنقیدی اور محققانہ مضامین پر مشتمل مطبوعہ ٹوٹل ورک پر نظر کئے بغیر ابرار احمد ماہنامہ شب خون آلہ آباد کے صفحات تک گھوم پھر آئے۔ ادھر مرزا حامد بیگ نے اپنے کراچوی ادبی دلال محمود واجد کو بہکایا کہ احمد ہمیش کے خلاف لگائی بجھائی جاری رکھی جائے۔ سہ ماہی آئندہ کے نام وہ اپنے ایک خط میں معاندانہ سطح پر اتنا اچھلا کودا کہ احمد ہمیش کے خلاف "پدی پدی چہ پدی کا شوربہ" محاورہ بول گیا اور یہ بھول گیا کہ وہ خود پدی ہے بلکہ کئی پدیوں کا ایک پدی! خیر پدی تو رہا پدی...... جبکہ پدی سے تو بہت بڑا ہوتا ہے اونٹ! مگر جب تک اونٹ پہاڑ کے قریب نہیں گیا تھا، تب تک خود کو قد آور سمجھتا تھا۔ تاہم مرزا حامد بیگ، ابرار احمد اور محمود واجد کو بیک وقت یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے (اگر وہ ذہین ہوں) کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے نمائندہ لکھنے والوں نے کم اور منتخب لکھا ہے اور کسی لکھنے والے کے ٹوٹل ورک کو مقدار کی بجائے اقدار کی رُو سے دیکھنا چاہیے ۔ البتہ دروغ گوؤں اور کاذبین کے لئے تو شیرنی اور کتیا کے درمیان ایک مکالمہ کی مثال ہی سر توڑ سکتی ہے۔ جیسا کہ اتفاق سے کتیا کو شیرنی سے مکالمہ کرنے کا موقع میسر آیا تو بولی "تم سال بھر میں دو بچے جنتی ہو...... مجھے دیکھو، میں گیارہ گیارہ بچے جنتی ہوں" یہ سن کے شیرنی نے اسے ڈانٹ دیا "ابے احمق! میرے دو بچے شیر کے بچے اور تیرے گیارہ بچے کتے کے بچے کہلاتے ہیں"۔ کم از کم یہ مکالمہ مرزا حامد بیگ ابرار احمد اور محمود واجد کو یاد رکھنا چاہیے۔ کیونکہ

اب کوئی لاہوری آلہ کار یا کراچوی ادبی دلال مرزا حامد بیگ کا آگا پیچھا زیادہ دن چھپا نہیں سکتا۔ ویسے بھی سارے کئے دیے کا نتیجہ تو ٹائیں ٹائیں فش فش نکلا۔ مرزا حامد بیگ کو لکڑ بگھا قرار دینا بر اعظم یورپ میں اتنا پسند کیا گیا کہ اسے "اردو دنیا" جرمنی نے مکرر شائع کیا جیسا کہ ادبی خبر نامہ اردو دنیا جرمنی اپریل اور مئی ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں مرزا حامد بیگ کے ایک افسانہ "آوازیں" کو ایک انڈین فلم اور ایک صوفیانہ حکایت کو مکس کر کے سرقہ یا چوری کی مثال بطور خبر شائع کی گئی۔ بلکہ حامدی کاشمیری نے تو انڈین فلم "وہ کون تھی" اور مرزا حامد بیگ کے افسانے "آوازیں" دونوں کا ایک ہی جیسا خلاصہ ناقدانہ تجزیہ کے ساتھ پیش کیا ہے، اسے اردو دنیا کے چیف ایڈیٹر جناب ارشاد ہاشمی اور ایڈیٹر جناب جاوید خان نے شائع کر کے اہلِ اردو کو باخبر کر دیا ہے۔ مزید اس سے پتہ چلتا ہے کہ منافقت اور چوری کے قدیم رشتہ دارانہ زمرے میں مرزا حامد بیگ پیشہ ور منافق اور چور ہیں۔ اس کے باقی افسانے بھی انڈین فلموں سے سرقہ کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں ایک معتبر قاری نے مرزا حامد بیگ کے افسانہ "کارنیوال" کو چونی کی کلاس والی گھٹیا بازاری بلیک اینڈ وائٹ فلم کے لطیفے نما منظر کی چوری بتایا ہے کہ کس طرح ایک چالاک آدمی حلوائی کی دکان سے کئی مختلف مٹھائیاں ایک دوسرے کے عوض باری باری سے مول لیتا ہے، اس طرح بڑی چالبازی سے قیمت کی ادائیگی کا معاملہ گول کر کے مٹھائیاں مفت لئے ہوئے چلتا بنتا ہے۔

دریدہ دہنی اور سینہ زوری کی حد تک چوری کی ایک اور مثال قابلِ ذکر ہے کہ ماہنامہ شاعر ممبئی کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے صفحہ ۴۳۵ پر مرزا حامد بیگ نے اپنے نام اعظم کریوی کا ایک خط شائع کرایا ہے۔ خط کی مرسلہ تاریخ ۲۵ اگست ۱۹۵۱ اور مقام اور پتہ اخبار مجاہد ملیر کینٹ درج ہے جب کہ اعظم کریوی کی تاریخِ پیدائش ۲۲ جون ۱۸۹۸ء اور وفات ۲۲ جون ۱۹۵۳ء درج ہے۔ اس کے برعکس مرزا حامد بیگ کی اپنی تاریخ پیدائش ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء ہے۔ گویا مرزا حامد بیگ نے دو سال کی عمر میں اعظم کریوی سے مراسلت کی۔ گویا اس کے نام اعظم کریوی کے جوابی خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا حامد بیگ رحمِ مادر میں ہی افسانہ اور تنقیدی اور محققانہ مضامین لکھنے لگا تھا۔ پھر رحمِ مادر سے نکلتے ہی وہ اس قابل ہو گیا کہ اعظم کریوی جیسے مشاہیر سے خط و کتابت کرنے لگا۔ البتہ سنتے آئے ہیں کہ کسی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والے عجیب الخلقت بچے کو منحوس سمجھ کر فوراً ضائع کر دیا جاتا تھا۔ مگر یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ مرزا حامد بیگ نہ صرف اپنی منحوس بقا پہ مصر ہے بلکہ مسلسل چوری اور سرقہ سے بھی باز نہیں آتا۔ البتہ اس طرح مرزا حامد بیگ کی تحریریں غیر معتبر ٹھہرتی ہیں۔ موصوف کو بس شہرت کا ہوکا ہے۔ خیال رہے کہ ماہنامہ شاعر کے ہم عصر ادب نمبر میں اعظم کریوی کے نام چھپے ہوئے مذکور خط کی لگ بھگ ڈیڑھ سال سے تادمِ

تحریر (ستمبر۔ ۲۰۰۰ء تک) اپنی مشہوری کی غرض سے مرزا حامد بیگ نے تردید نہیں کی۔

ظاہر چور بھی تو چوری میں بلا کے ماہر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں ممتاز افسانہ نگار محمد الیاس کے دوست آئی یو جرال نے احمد ہمیش کے نام اپنے مفصل خط میں مطلع کیا ہے کہ سلمان وجیہ حسن کے ٹی وی ڈرامہ سیریل "گھونگھٹ" کا سواد محمد الیاس کی کہانی "دارے کی عورت" جو ان کے مجموعہ (لوح ازل پہ لکھی کہانیاں میں شامل ہے) سے سرقہ کیا گیا ہے۔

(۴) قصہ بی بد دیانتی کے شکار اور شکار گاہ کا.......

سنا ہے کہ بی بد دیانتی نام کی ایک بد نام زمانہ حرافہ نے ماضی قریب میں کئی نامی گرامی ہستیوں سے نکاح کیا مگر ان سے مطلب براری کے بعد طلاق لے کے چلتی بنی۔ البتہ اس کے شکار ہونے والوں میں گوپی چند نارنگ، قمر جمیل، فہیم اعظمی اور زبیر رضوی بہت نمایاں ہوئے۔

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ بی بد دیانتی اور گوپی چند نارنگ کے درمیان خوب نبھی۔ عرصہ دراز تک گوپی چند نارنگ اس کے تصرفِ نکاح میں رہنے کے باوجود صحیح سلامت نکلے اور بڑے فائدے اٹھائے۔ مگر جب قمر جمیل اس کے تصرفِ نکاح میں آئے تو کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ سوائے اس کے کہ اردو نثری نظم کی جعلی تحریک چلانے اور سابق ماہنامہ دریافت کے کچھ شمارے نکالنے کے بعد تھوڑے ہی دن زندہ رہ پائے یعنی بی بد دیانتی نے انھیں شکار کیا بایں کہ آخر اپنی جان سے گئے۔ دراصل قمر جمیل ۶۰۔ ۶۲ کے دوران غزل کی روایت کے ایک اچھے شاعر تھے۔ ریڈیو کی ملازمت بھی انھیں راس نہیں آئی۔ کسی شدید ذاتی کامپلیکس میں انھوں نے سلیم احمد کے گروپ کے مقابلہ میں اپنا ایک گروپ بنانے کی کوشش کی مگر وہ سلیم احمد کی طرح اتنے ذہین نہیں تھے کہ گروپ بنا کے کامیاب ہو جاتے! پھر بھی بی بد دیانتی نے ان کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ موصوف نے پہلے تو احمد ہمیش کو اس کی بے گھری کے دوران کچھ دن اپنے گھر میں پناہ دی۔ مگر جلد ہی احمد ہمیش کو اس کے ۶۰۔ ۱۹۶۱ کے وقت کے مصدق اور تسلیم شدہ ادبی اثاثہ خاص طور پر اس دوران اس کی شائع ہوئی اردو نثری نظموں کی صداقت (ماہنامہ نصرت لاہور ۶۲ میں احمد ہمیش کی پہلی اردو نثری نظم کی اشاعت کے مصداق) کو دانستہ نظر انداز کر کے بزعم خویش گھر بیٹھے ہی اردو نثری نظم کی تحریک کا اعلان کر بیٹھے۔ بالکل انگریزی کی توپ کی طرح اتنے لاؤڈ ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ یہاں تک کہ مقامی سطح پر کئی نچکان ادب ان کے گروپ میں شامل ہو گئے۔ تاہم سارہ شگفتہ جو نثری نظم کی ایک جینوئن شاعرہ تھی اور اس میں آگے بڑھنے کی بے پناہ آگ تھی۔ قمر جمیل اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس کا شعری مجموعہ نہیں چھپوا سکے۔ بعد میں وہ احمد ہمیش کے پاس آئی تو حسنِ اتفاق سے ایک انسان دوست شخصیت سعید احمد نے فراخدلانہ مدد کی۔ اس طرح سارہ شگفتہ کا شعری مجموعہ "آنکھیں" بہ حسن و خوبی شائع تو ہو گیا مگر اس کی

اشاعت سے پہلے ہی وہ ٹرین سے کٹ کے مر گئی۔ اس کی موت کے کافی عرصہ بعد قمر جمیل نے وزیری پانی پتی کے کتابی سلسلہ "دریافت" کو بغیر اجازت اپنی تحویل میں لے لیا۔ پھر اسی نام سے ڈیکلیریشن لیا۔ یعنی ماہنامہ "دریافت" کا اجرا کیا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے" محاورہ کے مصداق قمر جمیل کو ایک سوڈو انٹیکچول ضمیر علی بدایونی اور ایک اداکار طلعت حسین کی مستقل صحبت کیا میسر آئی کہ لگے ہاتھوں علمی بد دیانتی کو بھی مزے آگئے۔ مزید کچھ چیلے چانٹے مثلاً انور سن رائے، عذرا عباس، افضال احمد سید، تنویر انجم، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن اور ممتاز رفیق مل گئے ...... تو قمر جمیل پہلے سے کہیں زیادہ اردو نثری نظم کی جعلی تحریک کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ بہ زعم خویش اردو نثری نظم کے بانی بھی بن بیٹھے۔ جیسا کہ روزنامہ جنگ، جسارت اور روزنامہ ایکسپریس کے ادبی صفحہ پر دیئے گئے انٹرویوز میں قمر جمیل نے ہر بار نثری نظم کے متعلق اپنا بیان بدل بدل کے بات کی۔ کبھی فرمایا کہ انہوں نے نثری نظم کا قصہ ہی ختم کر دیا۔ کبھی فرمایا کہ ۱۹۷۱ء سے پہلے نظم لکھی ہی نہیں گئی۔ ایک انٹرویو میں تو انہوں نے فرمایا کہ احمد ہمیش نے نثری نظم لکھی ہوگی مگر اس میں شاعری ہی نہیں ہے۔ اس طرح احمد ہمیش سرے سے شاعر ہی نہیں۔ اس طرح کے مختلف متضاد اخباری بیان کی سنسنی خیزی سے موصوف نے اخبار پڑھنے والوں کو تو ضرور چونکایا۔ مگر شعر و ادب میں دیانت دارانہ موقف کا جو پیمانہ ہوتا ہے اور جس سے ایک معتبر ادیب اپنے مافی الضمیر کے مطابق حرف و لفظ کی حرمت قائم رکھتا ہے اور کوئی ورڈکٹ Verdict دیتے ہوئے صداقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا بلکہ اس طرح وہ دل و جان پر جو قرض ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی جیتے جی ہی کر جاتا ہے۔ افسوس کہ علمی بد دیانتی کے ہاتھوں قمر جمیل کو قرض ادا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ موت نے انہیں موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں، موت سے کچھ ہی دن پہلے روزنامہ ایکسپریس کو دیئے گئے انٹرویو میں قمر جمیل نے ماضی کے مختلف بیانات سے بھی مختلف اور متضاد جو بیان دیا، اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف غبارِ خاطر کے حوالہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کو نثری نظم کا بانی قرار دیا۔ دراصل قمر جمیل کو اپنی ذات پر اعتماد بالکل نہیں تھا۔ حرف و لفظ کے معاملے میں ان کا ذہن متوازن اور واضح نہیں تھا۔ اب اس کو کیا کہا جائے کہ حال ہی میں قمر جمیل کی کتاب "ادب کی سرحدیں" شائع ہوئی۔ اس میں شامل ایک مضمون میں قمر جمیل نے احمد ہمیش کو اردو نثری نظم کا پہلا شاعر قرار دیا۔ جبکہ احمد ہمیش کے بعد مبارک احمد اور محمد سلیم الرحمٰن کے نام درج ہیں۔ اب ستم ظریفی یہ کہ قمر جمیل کی موت کے بعد کراچی کے کچھ نچکانِ ادب ان کے حق میں اخباری مہم چلا رہے ہیں۔ اور وہ اردو نثری نظم سے بالکل لاعلم ہیں مگر علم نما جہل سے کام لیتے ہوئے احمد ہمیش کے خلاف محض نفرت اور عداوت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۷ ستمبر ۲۰۰۰ء کے انگریزی ڈان کے ادبی صفحہ پر کسی بچے کا مضمون چھپا ہے۔ مضمون کی زبان نہ صرف عامیانہ ہے بلکہ انگریزی بھی کمزور ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ

مضمون کئی لوگوں کی ملی جلی سازش سے لکھوا کے چھپوایا گیا۔ مگر اب اس کو کیا کیا جائے کہ مضمون میں ایک جگہ قمر جمیل کی کتاب "ادب کی سرحدیں" کے مذکور مضمون کی کہ ان مذکور سطروں کا حوالہ درج کیا گیا ہے جن کی رو سے قمر جمیل نے احمد ہمیش کو اردو نثری نظم کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ اس طرح تو مقامی ٹھگان ادب کی معاندانہ مہم محض ضائع جا رہی ہے۔

ادبی بد دیانتی کی ریکارڈ میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام بھی سر فہرست ہے۔ موصوف عرصہ دراز سے اپنے رسالہ اوراق کی لابی بنانے میں مصروف ہیں۔ لاہور اور سرگودھا بلکہ پنڈی اور اسلام آباد سے جو ادبی جائزے، تبصرے اور شعری اور افسانوی انتخاب شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر وزیر آغا کی مرضی اور منشا کو بطور ہدایت شامل رکھا گیا۔ اپنے اپنے گروپ اور لابی کے لکھنے والوں کو تو وہاں کے ادبی جائزوں، تبصروں اور شعری اور افسانوی انتخاب میں دھڑلے سے شامل کیا گیا، جب کہ ان کے گروپ اور لابی میں جو لکھنے والے شامل نہیں تھے، انھیں سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔ کئی لکھنے والے علاقائی عصبیت کے شکار ہوئے۔

ایک صاحب ہوتے ہیں فہیم اعظمی۔ ان کے بارے میں بھی اب کچھ لکھنا ناگزیر ہے۔ یہ صاحب پاکستان ایر فورس میں ہوا کرتے تھے۔ پھر سعودی عرب تشریف لے گئے۔ وہاں ریاض میں خوب پیسے کمائے شائد اسی نشے میں انھیں شاعر و ادیب بننے کی سوجھی۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی سجاد باقر رضوی پانچویں چھٹی دہائی کے دوران شاعری اور تنقید میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محض چھوٹے بھائی سجاد باقر رضوی کے ادبی مرتبہ سے حسد کے نتیجے میں بڑے بھائی امداد باقر رضوی (فہیم اعظمی) نے ۱۹۷۸ء کے دوران ریاض سے کراچی آ کے کچھ دن کے عارضی قیام کا فائدہ اٹھایا۔ اس طرح کہ احمد ہمیش سے ملاقات کر کے اپنے افسانوں کی اصلاح کروائی۔ اور ایک انتخاب شائع کروا کے ادیب بن بیٹھے۔ احمد ہمیش اور ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی سے اداراتی استفادہ کی مطلب براری کے بعد فہیم اعظمی اکدم بزعم خویش جدیدیت کی مچان پہ جا بیٹھے۔ اور پھر ریاض سعودی عرب سے کافی دولت کمانے کے بعد جب کراچی مستقل قیام کے لیے لوٹ آئے تو چھپنے چھپانے کے کچھ لالچی لکھنے والوں سے مل کے ماہنامہ "صریر" کا اجراء کیا۔ مزید نشہ چڑھا تو فہیم اعظمی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی لابی میں شامل ہو کے بطور ایک ایجنٹ ساختیات، پس ساختیات، ردِ تشکیل اور مابعد جدیدیت کے مغرب میں مرے کھپے رجحانات پر مشتمل مغربی تحریروں کے ترجمے دھڑا دھڑ کرنے لگے مگر مترجم کی بجائے اور جینئل مصنف بن بیٹھے۔ اس طرح کم علم اور جاہل لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے ماہنامہ صریر کے صفحات پر "رائدین جدیدیت" کے اعلاچی بن کے دندنانے لگے۔ یہاں تک کہ اسی بلے میں نثری نظم کی بحث میں بے بد دیانتی کے باقاعدہ ہم نوا بن گئے۔ اور یہ

بھول گئے کہ کوئی سر پھرا ان کی لاف زنی، جھوٹ اور منافقت پہ نظر نہیں رکھے گا اور ان کی لا علمی کو چیلنج نہیں کرے گا!

اور اب سہ ماہی "ذہنِ جدید" دہلی کے زبیر رضوی کی ملی بد دیانتی سے ملاقات اور اس کے شکار ہونے کی تفصیل میں نہ جا کے "ذہنِ جدید" کے صرف اس شمارہ پر ایک نظر کرنا ہے، جس میں "ادب پیما" کے عنوان سے بیسویں صدی کی اردو شاعری، افسانہ اور تنقید کی فہرست سازی بطور پیمائش کی گئی اور ملی بد دیانتی کے مقرر کردہ جعلی منصفین سے فیصلے طلب کرائے گئے۔ بالکل اس مثال کے مصداق کہ ایک احمق اور ظالم بادشاہ کے انعام واکرام دینے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے محل کے باہر باکمال لوگوں کو قطاروں میں کھڑا کروا کے درزی کے فیتے سے سب کے قد کی پیمائش کرواتا، ایسے میں بادشاہ کے مقرر کئے ہوئے قد کے ناپ سے جس کسی کا قد چھوٹا یا بڑا ہوتا، اس کے جسم کے اتنے حصہ کو وہیں کھڑے کھڑے ترنت جلاد کی تلوار سے کٹوا دیتا۔ اس طرح قطاروں میں کھڑے لوگوں میں سے کئی صاحب کمال اپنے سروں اور گردنوں سے محروم ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ بادشاہ کے مقرر کردہ پیمانہ پر اترنے والے بیشتر گدہے اور خچر نکلے۔ جیسا کہ زبیر رضوی ماضی قریب میں مشاعرہ کی اسٹیج کے بادشاہ ہوا کرتے تھے، ناچ ناچ کے شعر گایا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کا سود مند کاروبار تھا۔ اور اسی کاروباری پس منظر سے زبیر رضوی سہ ماہی "ذہنِ جدید" کے اجرا تک آئے۔ اب انہیں پرنٹ ورڈ (Print word) میں بھی کثیر شہرت کی طلب تھی۔ اس کے لئے ملی بد دیانتی نے انہیں بیسویں صدی کے اردو شعر وادب کی فہرست سازی اور پیمائش کا شارٹ کٹ سجھایا۔ تاہم زبیر رضوی پیمائش کرنے اور فیصلہ صادر کرنے والے منصفین سمیت یہ بھول گئے کہ کوئی شاعر ادیب ایسا بھی ہو گا، جو ادب پیمائی اور فہرست کی قطار سے دور اپنی تنہائی کے گوشہ میں بیٹھا ملی بد دیانتی کی ظالمانہ کاروائی پر نظر رکھے ہوئے اپنے فیصلہ سے مطلع کرنے کے موقع کا منتظر ہو گا۔ جبکہ دہلی میں ہی رہتے ہیں مشرف عالم ذوقی۔ کئی اچھی کہانیاں لکھیں اور "بیان" جیسا ناول لکھا۔ مگر زبیر رضوی کے مقرر کردہ پیمانہ پر وہ بھی پورے نہ اترے اور اپنی گردن گنوا بیٹھے۔ اور ادھر پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے بہت سے چیلے چانٹے بہ شمول محمود واجد جیسے کا کروچ بھی آج کل اردو ادب کی اسی قبیل کی فہرست سازی اور قد پیمائی کے پروجیکٹ کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔

۵۔ قصہ ایک ڈھونگی شاعر اور جعلی ناول نگار کا۔

صلاح الدین پرویز کیسے شاعر ہیں۔ اس کا اندازہ ماہنامہ شاعر کے ایک ہی شمارے دسمبر ۱۹۹۹ء میں چھپے چند خطوط سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ چند اقتباسات حاضر ہیں۔

(الف)　　صابر زاہد۔ مالی گاؤں

"صلاح الدین پرویز کی نظموں کے تعلق سے آپ (افتخار امام صدیقی) کی (خراب) رائے سے میں صد فی صد متفق ہوں کہ اخلاقی جمالیات ایسی فحاشی کو بنام ادب کبھی بھی قبولیت کا درجہ نہیں دے گی ذہن پر نظم پڑھنے کے بعد فوری تاثر، کھجراہو کی برہنہ اعصاب شکن مورتیوں کا ابھرتا ہے۔ شاعری فنونِ لطیفہ کی ماں ہے۔ کیا کوئی ماں برسرِ محفل جوان بیٹوں بیٹیوں کو اپنے سامنے برہنہ کرنا پسند کرے گی۔ شاعر (رسالہ) کے آیئنہ آسا شفاف بدن پر یہ نظم کوڑھ کا مکروہ دھبہ ہے۔ آپ نے یہ اچھا ہی کیا کہ موصوف کی باقی ماندہ نظمیں نہ چھاپ کر شاعر کے صفحات کو کوک شاستر ہونے سے بچالیا (موصوف کے گھگھیائے اصرار کے باوجود)۔ اس قدر وا شگاف برہنہ شعری اظہار کی مشرقی تہذیب وادب میں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

(ب) مشتاق احمد نوری۔ پٹنہ

صلاح الدین پرویز اپنے آپ سے مطمئن کب ہونگے؟ انہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں، اس لئے بہت چونکا دینے والی شاعری کرنے پہ مجبور ہیں تاکہ کاروانِ ادب کا ہر راہ گیر ان کی جانب مڑ مڑ کر دیکھے۔ لیکن اس سے ان کا فن پائندہ نہیں بن سکتا۔ نہ جانے کچھ لوگ (جانے) فنکار ڈھونگی کیوں بن جاتے ہیں؟ بھائی ادب تحریر (تخلیق) کر و ڈھونگ کرنے کا (کیا) فائدہ؟

(ث) حفیظ آتش۔ امروہہ

ادھر میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ صلاح الدین پرویز اچھے شاعر ہونے کا اردو کے ہر رسالے میں ڈرامہ رچائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نظم آپ نے اپنے منفی ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کی ہے جیٹھ، اساڑھ تک تو سمجھے مگر یہ سہیلی کے ساتھ خود کا اتنے بھیتر تک جانا کہاں تک درست ہے...... پرویز یہ کوئی نیا کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہندی میں (یہ کام بہت عرصہ قبل لوگوں نے بہت کیا ہے.................. تم نے اپنی ذمہ داری موصوف کی باقی نظمیں نہ چھاپ کر) بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

(ج) اندر پرتاب نیر۔ لدھیانہ

صلاح الدین پرویز کی غلاظت اور عفونت پھیلائی ہوئی جدید نظم پڑھ کر گہرا صدمہ ہوا ہے۔ آپ بھی (رسالہ شاعر) اپنے معیار سے گرے ہیں ایسی فحش نظم چھاپنا آپ کے مزاج اور سیمابی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ آیندہ سے (موصوف کی شاعری سے سخت) پرہیز کریں۔

۶۔ پانچ خطوط بطور دستاویز

آئی یو جرال، ابراہیم اشک، منشاء یاد، افتی نسیم بنام احمد ہمیش اور جمال اویسی بنام صلاح الدین پرویز

صحافت کے رواج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مضامین لکھ ڈالے۔ ظاہر ہے، ادارہ سہ ماہی تشکیل نے افتخار نسیم کے نام ایک خط میں مضامین کی اشاعت سے پرہیز اور معذرت کا اظہار کیا۔ محض اسی لئے افتخار نسیم نے احمد ہمیش کے نام اپنے جوابی خط میں انہیں بزدل قرار دیا۔ قارئین خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ افتخار نسیم کی نظر میں بزدلی کیا ہے اور بہادری کیا ہے! اب اگر کسی وجہ سے افتخار نسیم کا مضمون غالب گے تھا علی احمد فاطمی کی زیر ادارت شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ نیا سفر میں چھپ گیا تو اس سلسلے میں ترقی پسندوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ یہاں محلِ نظر ہے کہ احمد ہمیش کے نام افتخار نسیم کے کئی گزشتہ خطوں میں احمد ہمیش کو بہادر مدیر قرار دیا گیا ہے۔

آئی یو جرال بہ نام احمد ہمیش

میر پور آزاد کشمیر (پاکستان)

15 جون 2000ء

محترم بھائی احمد ہمیش

اسلام وعلیک: مزاج

پہلے کچھ اپنے بارے میں...... پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم کرنے کے بعد روزنامہ "دی پاکستان ٹائمز" لاہور۔اسلام آباد کے خاتمے تک عظیم قائد کی اس نشانی سے منسلک رہا۔ تیس سالہ صحافتی کیریئر میں وطن عزیز کے کسی گوشے میں کچا گھر بھی نہ خرید سکا پہلے صرف مالک مکان کی گھرکیوں کا سامنا رہتا تھا اب کرائے کی چھت سے بھی محروم ہو کر میر پور میں اپنے خونی رشتوں کی منافقتوں اور بے حسی کا شکار ہوا تو دوستو فسکی کے "ذلتوں کے مارے لوگ" کا ایک ایسا زندہ کردار بن چکا ہوں کہ جس کے چھوٹے سے کنبہ کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔

اسلام آباد سے 1996ء میں ایک ادبی کثیر الزبان ماہنامہ "The Expressions" کے چار بھرپور شمارے شائع کر چکا ہوں جس میں پاکستانی ادب کے یونیسکو زبانوں کے علاوہ فارسی اور جاپانی زبان میں بھی تراجم کروا کر شائع کر چکا ہوں۔ ان چار شماروں کو میں نے اسلام آباد میں 102 سفارتخانوں اور دنیا کی قومی لائبریریوں کو مفت بھیجا ہے۔ ایڈیٹر اور پبلشر بھی خود ہوں۔ مختلف زبانوں کے مقامی نامور اساتذہ کرام کا مجھے مخلصانہ تعاون حاصل ہے۔ اور بہت سے مستند اہلِ قلم دوست بھی میرے ساتھ خونِ جگر جلانے کو ہر وقت تیار بیٹھے ہیں۔ کیونکہ میرے اِس پرچے کی دنیا بھر میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ مل ہی نہیں سکتی۔

بھائی احمد ہمیش، ادبی رسالوں کی کہکشاں میں آپکا "تشکیل" واقعی ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ اور بجا طور پر

زندہ اور نمائندہ شاک انگیز استعارہ بھی جو مادہ پرست معاشرہ کی جبر و قہر میں حق گوئی کا پرچم بلند کئیے ہوئے ہے۔

بھائی احمد ہمیش، آپ اپنے عہد کے ژاں پال سارتر ہیں جو اپنے قلم سے ادبی جاگیر داروں کے چہروں سے منافقت کے نقاب نوچ رہے ہیں۔

افتخار عارف سے میری یاد اللہ 1998ء سے ہے۔ جب میں "دی پاکستان ٹائمز" اسلام آباد کا سینئر ادارتی رُکن تھا۔ اور اس میں کتابوں کی منگائی کے سلسلے میں تبصرے کیا کرتا تھا۔ افتخار عارف پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے ڈی۔ جی تھے۔ اپنے اِس منصب کے طفیل وہ اسلام آباد کی تمام وزارتوں کے بیورو کریٹس کو اپنی منافقانہ پی آر کے شکنجے میں مظبوطی سے جکڑے ہوئے تھے اور جو ادیب و شاعر اور صحافی انہیں کوئی حق بات منہ پر کہہ دیتا تو اُسے وہ رسیلے رسیلے جملوں میں انتباہ کر دیتے کہ اُن کے کئی عزیز دوست آئی ایس آئی میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں جو اُن کے ایک اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ بے بضاعت اہلِ قلم کو ڈرانے دھمکانے کے لئیے جس طرح کی مشق سخن کیا کرتے تھے اُس کا میں گواہ ہوں۔ وہ ایسی کاروائی کرنے کا اُس وقت اظہار کرنے کے ماہر ہیں جب اُس کا مد مقابل کے ساتھ دوستی عروج پر ہوتی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ وہ ایسی دلسوز نثروں میں یہ کاروائی ڈالتا کہ ہم اُس کے لانگ ٹرم سازشوں کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

"دی ایکسپریشنز" کے اجراء پر افتخار عارف نے اپنے مطبوعہ کلام کے انگریزی اور فارسی میں تراجم چھپوانے کے لئیے مجھ سے رابطہ رکھا۔ میں بھی گاہے گاہے اُن کے پاس جایا کرتا۔ جب انہیں اپنا پہلا لاؤلا شمارہ دینے گیا تو بھائی احمد ہمیش اوہ مجھے گیٹ پر لینے کے لئے آئے اور پھر جب کافی دور رچا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے میرے ہاتھ کو تین بار چوم کر مبارک باد دی تھی۔ اور یقین دلایا کہ اگر میں اِس پرچہ کو جاری رکھوں تو اگلے سال 98ء میں وہ "Guinnease book of world Record" میں اسے شامل کرنے کی سفارش کریں گے۔ وہ اس بک ریکارڈز کے پاکستانی باب کے سیکریٹری ہیں۔ اِس پر میں نے انہیں بتایا اگر کوئی مجھے Investor مل گیا تو یہ سلسلہ جاری رکھوں گا۔ اگر نہ ملا تو ڈمی نکال کر اس کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش کرونگا۔ فی الحال یہ چار شمارے بھی بنک سے قرضہ لیکر شائع کئیے ہیں جس کی اقساط آج تک دے رہا ہوں mark-up کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ مجھے صحافت، ادبی صحافت اور دنیا کی نگاہ میں پاکستان کا نام سر بلند رکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ بھائی احمد ہمیش! آپ تمانہیں ہم بھی ان اہلِ جنوں میں شمار کئیے جا سکتے ہیں جو اپنے وطن سے محبت اور اس کے ادب کو غیر ملکی زبانوں کے فروغ کا فریضہ ادھار کی مے پی کر ادا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ دل زنداں میں یہ سودا سمایا رہا کہ وطنِ عزیز میں اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی اور دیگر

علاقائی زبانوں میں جولازوال ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کا ابلاغ ہو سکے۔

افتخار عارف مقتدرہ کے چیر مین مقرر ہوئے تو "The Expressions" کی اشاعت معطل ہو چکی تھی (تاہم میں ابھی تک ایک Investor کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اللہ کرے۔۔۔)۔ بہر حال ایک شام انہوں نے مجھے فون کیا کہ "فرنٹیئر پوسٹ" پشاور کا مالک و مدیر رحمت شاہ آفریدی ان کا دوست ہے اگر مجھے متذکرہ اخبار میں ملازمت کرنا منظور ہو تو اس کے نام درخواست کے ساتھ کل دفتر میں ٹھیک دس بجے ملوں۔ دوسری صبح میں وقتِ مقررہ پر انہیں ملنے گیا تو سیکریٹری سے کہا افتخار عارف صاحب کو میرے آنے کی خبر کر دو تو جواب ملا کہ صاحب ایک غیر ملکی وفد سے بات چیت میں مصروف ہیں۔ آپ پھر کسی وقت آجائیں۔ (غالباً موصوف کو "The Expression" کی معطلی کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ میں چپکے سے سیڑھیاں اتر کر مقتدرہ کے پی آر او سید پیرزادہ کے پاس آ بیٹھا۔ اتنے میں پیرزادہ کے فون کی گھنٹی بجی تو میرے لئے چائے کا کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔ واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ کہاں گئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ افتخار عارف صاحب نے بلوایا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ان کے پاس کون سا وفد بیٹھا ہوا ہے۔ پیرزادہ نے کہا کوئی غیر نہیں ثمینہ راجہ تشریف فرما ہیں۔ پیرزادہ صاحب سے میں نے ایک کاغذ لے کر افتخار عارف کو لکھا کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ آپ کے سیکریٹری نے بتایا کہ آپ ایک غیر ملکی وفد سے میٹنگ کر رہے ہیں جبکہ پی آر او سے معلوم ہوا کہ آپ کے پاس ثمینہ راجہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ پھر میں نے اردو، پنجابی اور انگریزی میں بڑی موٹی اور مغلظ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ خط میں نے ان کے سیکریٹری کے ذریعہ اپنی موجودگی میں اندر بھجوا کر واپس چلا آیا۔ 1997ء کا واقعہ ہے۔ رات کو افتخار عارف کا فون آیا تو کہنے لگا "انعام بھائی آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، ہم بھی اس شہر میں بستے ہیں، زندگی رہی تو ملاقات ہو گی۔ انہوں نے یہ جملے نہایت ہی دھیمے اور نرم لہجے میں ادا کیئے اور فون بند کر دیا۔

اب اس ادبی بیوروکریٹ کے چہرے کا دوسرا رخ آپ کو دکھاتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ ملک میں کیسی کیسی مکروہ ہستیاں ادب اور قومی خزانے پر بھاری بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ ادیبوں، شاعروں اور ایماندار صحافیوں کا نہ صرف استحصال کرتے ہیں بلکہ ان کو ذلتوں کے گڑھے میں دھکیلنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ گذشتہ سال دوستو فسکی کا یہ زندہ جاوید کردار جب تین ماہ کا کرایہ اسلام آباد میں ادا نہ کر سکا اور گھر میں ایک طوفان کا سماں تھا۔ انگلش اسکولوں میں پڑھنے والے میرے پانچ بچوں کی فیس کی ادائیگی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ سسرال والے اس ڈاکو سیٹھ کے ہمنوا نے ہوئے تھے جس نے مجھے گولڈن ہینڈ شیک میں ملی آٹھ لاکھ کی رقم ہتھیالی تھی تو اس دوران مجھے اطلاع ملی کہ مقتدرہ کے بیوروکریٹ چیر مین افتخار نے بیسویں صدی کی پچاس بہترین کتابوں کے اردو تراجم شائع کروانے کی سیریز کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ جس کا معاوضہ بھی

وہ خوب دیتے ہیں۔ مرتا کیانہ کرتا میں نے ایک جونیئر اردو صحافی کی خدمات حاصل کیں۔ اور افتخار عارف صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات کے لئے چلا گیا۔ انہوں نے میرے دوست کی سفارش پر دو کتابوں "Revolty of masses" جس کے ۹۰ صفحات تھے۔ اور دوسری 407 صفحات پر مشتمل کتاب "Poverty and development" کا ترجمہ کروانے کا وعدہ کیا۔ کتاب "عوام کی بغاوت" کا ترجمہ میں نے صرف پندرہ دن میں دوبار نظر ثانی جناب رانا نصر اللہ خان عزیز ثانی سے کرانے کے بعد مقتدرہ کے متعلقہ پنڈت کے حوالے کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد عید کی آمد آمد تھی اور میں تھا تہی دست۔ عید سے قبل عارف صاحب کو فون پر بتایا کہ عید سر پر ہے۔ آپ ادائیگی عید سے ذرا پہلے کرا دیں تو نوازش ہو گی۔ افتخار عارف صاحب نے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی کہ میں کہہ دوں گا اس پر میں نے کہا" آپ سے میں کوئی بھیک نہیں مانگ رہا۔ یہ میرا محنتانہ ہے۔ عید سے قبل جس کی ادائیگی آپ کو کرنا چاہیئے"۔ اس پر بھی انہوں نے ایک بار پھر جان چھڑانے کی کوشش میں دوبارہ کہا" انعام بھائی کہہ جو دیا ہے اور پھر فون بند کر دیا" مجھے "عوام کی بغاوت" کا معاوضہ 4,866 روپے میں سے ایک ہزار روپے ٹیکس کاٹ کر عید کے بعد ادا کئے اور وہ بھی یوں کہ گویا مجھ پر احسانِ عظیم کر رہا ہو۔ (بھائی احمد ہمیش، اس مکار اور جھوٹی شانوں والے عہد میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ پندرہ روز بعد دوسری کتاب کے ترجمے کے لئے میں پھر جناب افتخار عارف کے پاس گیا تو موصوف نے فرمایا کہ ان کو مقامی بیورو کریٹس کے عزیزوں اور پیاروں کو بھی oblige کرنا ہوتا ہے۔ اور سفارشیوں کے رشتہ داروں کو بھی نوازنا ہوتا ہے۔ میں ایک شاعر بیورو کریٹ ہوں مجھے اوپر والوں کے منہ بند کرنا ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ اگر وہ دوسری کتاب "Poverty of Development" کا اردو ترجمہ مجھ سے کرواتے تو دن رات ایک کر کے میں ایک ماہ کے عرصے میں کم از کم 45،46 ہزار روپیہ کما کر اپنی معاشی پریشانیوں سے کسی حد تک نجات حاصل کر سکتا تھا۔ اور اس طرح میری ذات اور میرے بیوی بچوں کو تقسیم نہ کیا جا سکتا۔ میرے بچوں کا Personality Cult مسخ کر دیا گیا۔ میں زندہ درگور ہو گیا۔ دن میں کئی بار مرتا اور جیتا ہوں۔ یہ ہیں پاکستانی شاعر بیورو کریٹ افتخار عارف صاحب جن کا تذکرہ کرنا تاریخ علم و ادب کیلئے بہت ضروری ہے کہ یہ "صاحب" بھی حیات اور میں بھی جبکہ قرآن حکیم کا یہ فرمان بھی...... "سچ بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ اور اگر تمہیں سچائی کا علم ہو تو اس کو جان بوجھ کر اپنے تک نہ روکے رکھو"۔

اور آپ اِس فرمان کی پیروی کرنے میں باکمال اور لاجواب ہیں جو میرے لئے Source of inspiration بھی......

بھائی احمد ہمیش، میں نے شہرِ نگاراں لاہور میں زندگی کے بھرپور بیس سال گذارے ہیں جہاں ملکی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ یوں جانیں کہ میں نے جوانی لاہور میں بسر کی ہے۔ بچپن سے ادبی و صحافتی ذوق رکھتا ہوں کیونکہ گھر میں اپنی "بوجی" (ماں جی) کا بھانجا اور ریاست جموں کشمیر کا نامور شاعر مرزا مطیع اللہ رعنا نظامی راجوروی اور جناب شفقت تنویر مرزا (ڈان۔ لاہور) کی قربتوں کے حصار میں بچپن کے دن گذارنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی۔ بہر حال اس دوران لاہور کے ادبی ٹھکانوں پاک ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس (دی مال)، فرلیش ٹی ہاؤس (نیلا گنبد) اور وائی ایم سی اے کے ریستورانوں میں اہلِ فکر و دانش کی مجالس میں خاموشی اور سنجیدگی سے راہبری حاصل کرنے کیلئے شرکت کرتا رہا۔ پروردگار کا کرم کہ مجھے سینئر شاعروں، ادیبوں اور سنیئر "کھبے" صحافیوں کی محبت و شفقت بھی حاصل رہی اور آج بھی ہے۔ جن میں جناب فیض احمد فیض، منیر نیازی، حبیب جالب، اقبال ساجد، سلیم شاہد، عباس اطہر، مسعود منوّر، ڈاکٹر ایوب مرزا اور قبلہ حسین نقی، مظہر علی خان، سلیم عاصمی، (اب ایڈیٹر ڈان) بابا ظہیر کاشمیری، صفدر میر (Zeno) محمد ادریس، ظفر اقبال، مرزا (Zim)، نثار عثمانی اور عبدالحمید چھاپڑا اور بہت سارے۔ ایک ہزار رتجگی راتیں چوک نواب صاحب اندرون موچی دروازہ میں نواب فتح علی مرزا کی اولاد میں سے نذر علی مرزا کی حویلی کی فرشی بیٹھک میں گذاری ہیں۔ جہاں پر مقامی منتخبہ فکر کے دوستوں کی شب گئے تک مجالس بپا ہوتی تھیں۔ قیام پاکستان کے فوری بعد گلوکار مہدی حسن بھی شریک ہوا کرتا تھا جب وہ میکلوڈ روڈ پر کہیں مکینک کا کام کرتا تھا (ایک شام نذر علی مرزا نے انکشاف کیا کہ جب ساغر صدیقی نے ہجرت کے بعد لاہور، موہنی روڈ پر رہائش اختیار کی تو جناب احمد ندیم قاسمی اپنے چند خاص ساتھیوں سمیت اُس کے ڈیرے پر ہر شام کو جایا کرتے تھے۔ کسی ایک روشن دن ساغر صدیقی پر یہ عقدہ کھلا کہ اُن کی بیاض چوری ہو گئی ہیں۔ اُس شام انہوں نے اتنی پی لی کہ آخری دم تک میو ہسپتال کے گیٹ اور دوسرے مختلف فٹ پاتھس کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔ اُس کی بیاض کے "نامعلوم چوروں" کی ابھی تک شناخت نہیں ہو سکی۔ لیکن اسے کیا کہیں لوگوں کا "منہ" اللہ کے سوا کوئی بند نہیں کر سکتا وہ جناب احمد ندیم قاسمی کو اس "خصوصی کاروائی" کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ (واللہ عالم بالصواب)۔

بھائی احمد ہمیش، اللہ تعالیٰ نے آپکو سیّد عبداللہ کی طرح اردو ادب کی تاریخ کا قبلہ درست کرنے کا قرض بطور فرض عطا کیا ہوا ہے۔ اور ہمیں ان حشرات الارض کا مواخذہ کرنے کا حوصلہ بخشا ہے اس لیئے اب کچھ دبستان سرگودھا کے سرخیل ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں چند حقائق سے پردہ وا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ہی کیا سارا عالم جانتا ہے کہ یہ سب درباری شاعر و ادیب ہیں جو ہمیشہ مصلحتوں سے سمجھوتہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ آپ ادبی دنیا کے آمین ہیں اس لیئے آپکو میں اس "سرخیل" سے متعلق سچے اور ناقابلِ فراموش واقعات سے

آگاہ کرنا چاہتا ہوں جن کا گواہ میں خود ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے دو سوتیلے بھانجے شمس آغا اور جمال درّانی ہیں۔ افسانہ نگار حمید قیصر نے جمال درانی سے مجھے متعارف کرایا جو بعد میں میرے گہرے دوست بن گئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ جمال درانی نے مجھے بتایا کہ اُن کا بڑا بھانجا شمس آغا تقسیم ہند کے دو تین سال قبل مولانا صلاح الدین احمد کے پرچے میں دھڑا دھڑ چھپ رہا تھا۔ ایکبار کرشن چندر نے مولانا صاحب کو خط لکھا کہ شمس آغا کو میری پیروی کرنے سے روکیں۔ شمس آغا کو مولانا اپنے پرچہ میں اس لیئے چھاپتے تھے کہ وہ کرشن چندر کے مقابلہ میں اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار تھا۔ چنانچہ مولانا نے شمس آغا کے حق میں حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ایک ہفتہ وار اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا اور بعد ازاں اُسے اپنے میگزین میں شائع کر کے کرشن چندر کے خوب لتے لیئے۔ اور واضح کیا کہ شمس آغا واقعی تم سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ جس پر کوئی کلام کیئے بغیر کرشن چندر نے چُپ سادھ لی تھی۔ مولانا کا یہ مقالہ چھپنا تھا کہ وزیر آغا کے پیٹ کے اندر اندر ہی مروڑ اُٹھنے لگے تھے۔ شمس آغا اور وزیر آغا (اب ڈاکٹر) تقریباً ہم عمر تھے۔ جب وزیر آغا کو شمس آغا کی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس ہوا تو اس وقت شمس آغا نے اپنے دادا کی وفات کے بعد گجرات سے ہجرت کر کے اپنے ننھیال یعنی ڈاکٹر وزیر آغا کی سرگودھا جاگیر میں جا کر پناہ لے لی تھی۔ اُدھر وزیر آغا نے شمس آغا کیلئے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اُس نے وہاں دوبار خودکشی کرنے کی ناکام کوشش کی جہاں اُس نے اپنے ہاتھوں سے پودوں کی نرسری تیار کی تھی۔ پودوں کو پانی وہ خود دیتا تھا اور وہاں پر موجود دُکھی "کمیوں" کے دُکھ درد بانٹتا تھا۔ اُسے اللہ نے بچایا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ریکارڈ پر ہے شمس آغا آخری بار جب لاہور سے دہلی کے سفر پر روانہ ہوا تو اُس نے اپنے غیر مطبوعہ ناول اور افسانوں کے مسودات مولانا صلاح الدین احمد کے حوالے کر گئے تھا۔ اور پھر شمس آغا لمحہ موجود تک نہیں آیا اور شاید اب کبھی واپس نہ آئے۔ علامہ مشتاق شاد مرحوم نے شائد اسی لیئے کہا تھا......

جنگل میں سانپ، شہر میں بستے ہیں آدمی
سانپوں سے بچ کے آئیں تو ڈستے ہیں آدمی

بھائی احمد ہمیش، پھر وہ وقت آن پہنچا جب میرا جگری دوست جمال درّانی مری سے واپس راولپنڈی آتے ہوئے سڑک کے ایک حادثہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اور شہر ویران کر گیا۔ خدا اُسے غریق رحمت کرے۔ آج وہ فیض آباد = پیر ودائی روڈ سٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہے میں ہفتہ دو ہفتے بعد وہاں سے گذرتا ہوں تو اُسے با آواز بلند سلام بھیجتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے سلام کا جواب دے رہا ہے۔ جمال درّانی نے اپنے ددھیال اور ننھیال کا شجرہ نسب بھی دے رکھا تھا تاکہ اُسے میں اپنی

سرگزشت میں حوالہ کے ثبوت کے طور پر بیان کروں وہ جانتا تھا کہ میں نذر علی مرزا کی درستی حوالہ سے نواب نوازش علی خاندان کا ایک فرد متصور ہوتا ہوں۔ اور وہ ان دونوں بھائیوں کے قریبی عزیز تھے۔ شمس آغا اور جمال درانی (شاعر) کے والد بزرگوار ایم ای ایس کے گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ آغا وراثت علی (وع) ان دونوں بھائیوں کے نانا ہیں جو وزیر آغا کے گھوڑی پال اور جاگیر دار والد ہیں۔

(ڈاکٹر وزیر آغا کے سوتیلے بڑے بھائی کے بیٹے آغا نجابت علی ہیں۔ جو جاگیر کے جائز وارث تھے تقسیم جاگیر کے موقع پر وزیر آغا نے ایسے ہاتھ دکھائے کہ آغا نجابت علی گذشتہ چالیس سالوں سے سرگودھا نہیں گیا۔ یہ آج کل حکمت کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں اپنی پہلی بیوی کی جوان سال اولاد کے پاس رہتے ہیں۔ آغا نجابت علی کی کہانی اُس کی اپنی زبانی میں "سرگزشت" میں شامل کر رہا ہوں کیونکہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔

بھائی احمد ہمیش، اب آخر میں تین باتیں: آپ "تشکیل" میں جہاں ہندوستان کے اہلِ قلم کی سکونت کے ساتھ لفظ بھارت لکھتے ہیں وہاں آپ پاکستانی شاعروں، ادیبوں اور کشمیریوں کیلئے صرف لفظ پاک کی بجائے لفظ پاکستان لکھا کریں۔

میرے اِس خط کو جاری سمجھیں تاکہ میں پوٹھار کے ادبی ٹولے یعنی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر اعجاز راہی اور ڈاکٹر رشید امجد اور میرے واقفکار دیگر اہلِ قلم کے بارے میں "تشکیل" کے ذریعہ اپنے تجربات اور مشاہدات کا اظہار کر سکوں۔ یہ جملے لکھتے ہوئے مجھے اپنا بچھڑا دوشت احمد داؤ بھی یاد آیا کہ وہ بھی کمال کا انسان اور بڑا تجریدی افسانہ نگار تھا۔ وہ میری یادوں میں ہر وقت زندہ ہے۔ اُسے بھی یار ماروں ڈاکٹر خالد سعید بٹ اور کشور ناھید نے وقت سے پہلے اِس جہان سے رخصت کر دیا تھا۔ ادبی و صحافتی دنیا کے ایسے بہت سے واقعات کو میں "تشکیل" اور "سرگذشتِ جرال" میں محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ دُعا کریں جلدی منظر عام پر لا سکوں۔

رب راکھا

آپ کا

آئی، یو، جرال

ابراھیم اشک بہ نام احمد ہمیش

"ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

ازابراھیم اشکؔ۔ ممبئی

دانشور احمد ہمیش، خلوصِ بیکراں

میں نے "تشکیل" کی جلدیں افسانہ نگار انور خاں اور مدیر "نیا ورق" ساجد رشید تک پہنچا دی ہیں۔ آپ کا پیغام بھی زبانی ان سے کہہ دیا ہے۔ محسوس یہ ہوا کہ یہ حضرات آپ سے خوش نہیں ہیں۔ نارنگ صاحب سے تو آپ کا یارانہ بہت پرانا ہے۔ میں نارنگ صاحب کے مضمون کے تعلق سے کچھ اہم باتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون "نیا ورق" میں ساجد رشید شائع کرنے والے ہیں۔ پورا مضمون مابعد جدیدیت اور نئی نسل کے تعلق سے ہے۔ وہ مابعد جدیدیت کا یہ تاج نئی نسل کے سر پر بطور اصلاح رکھ کر "کنگ میکر" بننا چاہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا شدید احساس ہو چلا تھا کہ انہوں نے اُن کے ہم عصر بڑے نقادوں نے نئی نسل کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی تو یہی کی کہ تیس برس گذر جانے کے باوجود انہوں نے اس نسل کو کوئی نام تک نہیں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں وقت کا مورخ ہمیں اس کے لئے کبھی معاف نہیں کرے گا...... "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"۔

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اب اس نسل کے نامگرن کے لئے ڈاکٹر نارنگ بغیر نئی نسل کے ادب کو پڑھے اور چھان پھٹک کرنے کے اسے بدیسی اصطلاح سے نوازنے کے لئے پہل کرنے لگے ہیں۔ جو ڈیڑھ سو سال پرانی اصطلاح ہے اور جس کا موجودہ ادب کے ذہنی رویہ اور تخلیقی رجحان سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اپنے اس مضمون میں انہوں نے بار بار جو ایک خاص بات دوہرائی ہے اس پر میرے مضامین تفصیل سے "شاعر" "رنگ و بو" حیدرآباد اور "تخلیق" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین نارنگ صاحب کی نظر سے بھی ضرور گزرے ہونگے۔ وہ خاص بات یہ ہے کہ جدیدیت کی لایعنیت کے خاتمے کے بعد نئی نسل میں جو ذہنی رویہ پیدا ہوا ہے اس میں سب سے اہم "معنی آفرینی" ہے۔ یعنی نئی نسل گذشتہ تیس برس سے جو ادب تخلیق کر رہی ہے وہ معنی افریں ہے۔ میں نے اُن سے پوچھ ہی تو لیا کہ اِس عہد کا تمام ادب اگر معنی آفریں ہے تو اس عہد کو "معنویت" کا عہد کہنے میں کیا برائی ہے......؟ نارنگ صاحب میرے اس سوال کیا جواب دیتے کہ ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب تھا ہی نہیں۔ وہ تو مابعد جدیدیت کی ڈیڑھ سو سال پرانی انگریزی ادب کی بھوٹن اُردو زبان و ادب کے تخلیق کاروں کی زبردستی کھلانے پر بضد ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ باسی اور جھوٹن کھانے سے بیماریاں پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے علم و ادب کی دنیا میں بیماریاں نہ پھیلیں اس کا خیال ناقد اور تخلیق کار دونوں کو رکھنا بہت ضروری ہے......

ایک خاص بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غزل کے تعلق سے گزشتہ تیس برس کے نئی نسل کے ادبی سرمایہ پر کسی بھی بڑے ناقد نے کھل کر بحث نہیں کی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی غالب اور میر کی الجھنیں سلجھانے میں مصروف رہے، وارث علوی منٹو، بیدی اور عصمت آپا کے گن گاتے رہے اور ڈاکٹر نارنگ

تھیوری پر کام کرتے رہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اردو زبان وادب کے تین بڑے نقاد تیس برس کے ادبی سرمایہ پر تیس حروف بھی نہیں لکھتے ہیں اور پھر بھی اردو زبان کے عظیم ناقد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ دھاندلی اردو زبان ہی میں چل سکتی ہے دنیا کے کسی بھی زبان میں ایسا نہیں ہوتا کہ اُس زبان کا ناقد تیس برس تک "کمبھ کرن" کی نیند سویا رہے، سارا ادبی منظرنامہ بدلتا رہے اور پھر بھی اسے اس زبان کا نقاد کہا جائے۔ نارنگ صاحب اب نئی نسل کو یہ مشورہ بھی دے رہے ہیں کہ بھئی ہم لوگوں نے تو نہیں لکھا اب آپ خود اپنے ناقد پیدا کیجئے۔ میں اُن سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ علم وادب میں ٹھہراؤ کبھی نہیں آتا یہ تو بہتا ہوا دریا ہے نئے ناقد بھی پیدا ہو جائیں گے "غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں"

جمال اویسی بہ نام صلاح الدین پرویز

"استعارہ سے استعارہ تک"

(محمد صلاح الدین پرویز کے نام کھلا خط)

مائی ڈیئر صلاح الدین پرویز!

تمہارا خط مل گیا تھا۔ تم نے تخلیقات مانگ بھیجی تھیں۔ مگر میں نے سوچا کہ "استعارہ" کے لئے کوئی مضمون لکھ بھیجوں۔ دو مضامین لکھے پڑے بھی تھے۔ ان کو نقل کر کے بھیج سکتا تھا۔ مگر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ مجھے تم سے کچھ مفصل گفتگو کرنی تھی۔ ادب پر۔ ادب کے موضوعات پر۔ شخصیات پر اور خود تمہاری شخصیت پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لئے بہت مناسب تقاضا تھا کہ ایک نیا مضمون لکھا جائے اور اس میں ان تمام مسائل سے بحث کی جائے۔ مگر مضمون کی نوعیت کیا ہو؟ تو میرے بھائی یہ خط اسی مضمون کی ایک شکل ہے۔ اجمالاً میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے تمہارا "استعارہ" شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ چند باتوں اندوہناک احساس ہوا۔ تمہارا استعارہ ادب استعارہ تو خیر کیا ہے، یہ تمہاری ذات اور تمہاری شخصیت کا استعارہ البتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کس دور میں لے آئے ہیں کہ تم جیسے مشہور و معروف لوگ خود اپنے ڈھنڈورچی بن گئے ہو۔ تم خود اپنے اظہار کے لئے رسالہ نکال رہے ہو۔ کبھی تم احمد ہمیش کو ٹریپ کروا کر گن پوائنٹ پر "دوسرا نروان" جیسا مضمون لکھواتے ہو اور کبھی حقانی القاسمی جیسے مالی مشکلات سے مجبور اور بے سہارا لوگوں کی ادبی صلاحیت کا ناجائز استعمال کرتے ہو۔ بھائی! تم نے اتنی شہرت پائی۔ کیا اب بھی ہوس پوری نہ ہوئی۔ تم کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا اور یہ بہت پہلے مل گیا۔ تمہاری تمنا کی شہرت بہت زیادہ ہوئی۔ یہ سب تمہیں نصیب نہ ہوتا اگر گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی وغیرہ تمہارا ساتھ نہ دیتے۔ گوپی چند نارنگ نے

بڑے علمی وادبی کارنامے انجام دیے ہیں جس کا میں دل کی گہرائیوں سے معترف ہوں۔ ان کی ایک کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" کو میں، اردو تنقید کے باب میں بہت اہم مقام دیتا ہوں اور ان کی تازہ ترین کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" سے زیادہ۔ لیکن ظاہر ہے تمہارا اور نارنگ صاحب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تو پھر تم فیض یاب کیوں نہ رہو۔

"استعارہ" پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ رسالہ تم نے پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، احمد ہمیش اور ان ہی جیسی چند مشہور ادبی ہستیوں پر نشانہ سادھنے کے لئے نکالا ہے۔ میرے بھائی آل احمد سرور کی عزت کرو کہ وہ تم سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں چھوٹے بڑوں سے اور بڑے چھوٹوں سے مراتب کا خیال رکھ کے گفتگو کرتے ہیں۔ سرور صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصہ اردو تنقید کی تراش خراش میں لگایا ہے اور بلاشک وشبہ اردو تنقید کو انہوں نے سائنسی آوٹ لُک دیا ہے۔ اردو تنقید کے تناظر کو پھیلایا بھی ہے۔ ہاں یہ بحث دوسری ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اردو کے نظریاتی ادب میں کتنا پر خلوص حصہ لیا ہے؟ یا ان کی خدمات کس درجہ اور معیار کی حامل ہے؟ لیکن تم نے جس طرز گفتگو کو رائج کیا ہے وہ اپنی روایت اور آداب کے سراسر خلاف جاتا ہے۔ تم نے شمس الرحمٰن فاروقی کے خلاف ایک بار پھر نئے سرے سے محاذ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون اس بات کی چغلی کھا رہا ہے۔ تمہارا لکھوایا ہوا کالم...... "حد سے گزرنے والے تیری یہی سزا ہے" جدیدیت کے انحراف سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ کہ تم جدیدیت کو کس انداز سے دیکھتے ہو، کیوں کہ میرا ماننا ہے کہ تمہارے اندر ادب کی جانچ پرکھ کا صحیح شعور نہیں ہے۔ ادبی ذوق تم نے نہیں پایا ہے ورنہ ایسی بچکانہ باتیں تم اپنے رسالے میں نہیں کرتے۔ تمہاری نثر ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنے کے لئے ذہن وشعور کو طاق پر ہی رکھ دینا بہتر ہے۔ جس فاروقی کے خلاف تم نے محاذ آرائی کی ہے اگر ادب میں Dedication والے جذبہ کے تحت فاروقی صاحب کی ذات کو سمجھتے تو بعید از عقل باتیں تم نہ لکھتے۔ فاروقی صاحب کے موقف میں تبدیلی آنی چاہئے یہ اصرار میرا بھی ہے لیکن تم نے جس جذباتیت کے اندھے ہو کر پورے رسالے کو ان کے خلاف نکالا ہے وہ ادبی اصول، ادبی نظریہ اور کمٹ منٹ اور علمی استعداد کے بل بوتے پر نہیں ہے۔ "استعارہ" میں تمہارا علم وادراک کہیں جھانکتا نظر نہیں آتا۔ ہمارے یہاں جب عورتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں تو لے بہنا دے بہنا کرتی ہیں، تم نے بھی سرپھری جھگڑالو عورت کی نفسیات سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے۔ تم نے فاروقی اور نارنگ کے تنازعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کی علمیت، قابلیت اور تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور میری نظر میں اس تنازعہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ اس تنازعہ کو ہوا دینی چاہئے۔ تم اس آگ کو بھڑکا کر اپنی نقلی عزت وشہرت کی روٹی سینکنا چاہتے ہو!

محمد صلاح الدین پرویز! نیا ادب جس گہرے ادارک و شعور کا استعارہ ہے چاہتا ہوں تمہاری ذرا اس سے ملاقات کرادوں۔ جدید دور میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ انسان کے کھوئے ہوئے وقار کی حالی کا ہے۔ ہمارا وقار کب کھویا؟ تمہاری ہی جیسی زبان میں اگر کہنا چاہوں تو کہوں کہ جب آدم اور ہوا جنت سے نکالے گئے۔ لیکن ٹھہرو! یہ بات مجھ سے اور تم سے بہت پہلے علامہ اقبال لکھ گئے ہیں۔ ان کی پوری شاعری انسان کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ فراہم کرتی ہے۔ اقبال جب زندہ تھے تو پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی۔ انسان سے انسان کا فاصلہ بڑھا۔ پھر انیس بیس سال کے انترال کے بعد دوسری عالمگیر جنگ ظہور پذیر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم زیادہ عرصے تک محیط رہی۔ اس جنگ میں کیسے کیسے لوگوں نے حصہ لیا اس بات کا اندازہ تمہیں ہے؟ شاید نہ ہو۔ ایک شاعر جو دوسری جنگ عظیم میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑا اس نے ایک عبرت ناک ناول لکھا۔ ایک سپاہی کے یہ یہ مصرعے دیکھو۔ تمہاری روح لرز جائے گی اُن تجربات کو محسوس کر کے:

We had no understanding of death
And yet its name,like salt and bread .like snow in a
day in December,
Lay about us,and mourning was as commonplace to us
As sleep was,as hunger, as year in the hour of twilight.
(Poem of an unknown German soldier
Fallen in tha winter of 1941-42)

میں تمہیں باور کرانا چاہتا ہوں کہ موجودہ دور ایٹمی تجربوں کی نذر ہو رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اپنے عوام کا جائز حق مار کر تمام پیسے اسلحے کی خرید و فروخت میں لگا رہی ہیں۔ کشمیر مسئلہ پر دونوں ممالک روزانہ کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں۔ ایسے وقت میں ہماری یعنی شاعر و ادیب کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ تم چند ہم نوا شاعروں ادیبوں کے ساتھ اپنی ذات کی تنہائی کا نوحہ پڑھ رہے ہو اور اس تنہائی کے اظہار کے لئے نثری نظم سے زیادہ دوسری ہیئت نظر نہیں آرہی ہے یہ سب کیا ہے؟ صلاح الدین پرویز! یہ سب فریب ہے۔ ادب کے قاری کو فریب ہے اور خود کو بھی فریب دینا ہے۔ تم نے شاید گلزار کی وہ نظم سنی ہوگی جو ان کے نئے کیسٹ "مراسم" کے شروع میں ہے۔ نہیں سنی ہے تو "مراسم" خرید کر سن لو۔ کیا کہتے ہیں وہ؟ نظم کے ذریعہ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ پھر تم پلٹ کر دیکھو حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری"

میں کیا پیغام دیا تھا۔ وہی پیغام کہ شاعری میں بڑی قوت ہوتی ہے۔

نئے ادیب کے استعارے میں امر تا پریتم سے لے کر صلاح الدین پرویز تک کی شاعری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ صلاح الدین پرویز! بڑی جتن کے ساتھ نرگسیت آمیز جملے لکھ لینے سے نظم نہیں بن جاتی۔ ہندی کے نرم ونازک اور شعریت انگیز الفاظ کا استعمال کر لینے سے خوبصورت نثر تیار نہیں ہو جاتی۔ تم کہتے ہو تم نے اقبال، غالب، راشد وغیرہ کو نہیں پڑھا ہے۔ ان کی جگہ میرابائی، خسرو، کالیداس، تلسی داس، کبیر وغیرہ کو پڑھا ہے۔ کیا ادبی اسٹنٹ تم کھیلنے نکلے ہو۔ یعنی ہندوستان کی حکومت کے وزارت عظمیٰ سے تمہیں پھر کوئی بڑا ادبی ایوارڈ مل جائے۔ ان شاطرانہ چالوں سے باز آؤ۔ اور اگر تم نے واقعی غالب وبیدل واقبال کو نہیں پڑھا ہے تو پڑھ کے دیکھو۔ تم غالب، اقبال اور مہدی افادی کی نثر بھی پڑھ کے دیکھو۔ یقیناً فائدہ پہنچے گا۔

صلاح الدین پرویز! نئی نسل کے ادیبوں کو ورغلانے سے بھی بچو! جدیدیت کے بعد کیا؟ یہ مرحلہ اپنے آپ طے ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ تم نے بڑی چالاکی سے اپنے آپ کو مابعد جدید شعرا میں شامل کر کے اپنا نام سرفہرست لکھوانے کی کوشش کی ہے۔ کیا بچکانہ حرکتیں ہیں۔ جدیدیت کے خاتمے کے بعد چند نام جو ابھرے ہیں وہی اس کے نظریہ ساز بھی ہیں اور وہی نئے ادب کی تشکیل کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کے پروجیکشن کے لئے کسی "استعارہ" کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عالم خورشید، نعمان شوق، احمد محفوظ وغیرہ کا تم نے کیا حشر کر دیا ہے ان کی ایک ایک غزل چھاپ کر۔ گرچہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے نئے ادیبوں کے لئے "استعارہ" نکالا ہے۔ میں تمہیں اپنا کوئی مضمون بھیج سکتا ہوں۔ نظمیں، غزلیں اور رباعیات اسلئے نہیں بھیج سکتا ہوں کہ ان کے صحیح پروجیکشن کی جگہ "استعارہ" کے صفحات نہیں ہیں۔ "استعارہ" ایک ایسا جنگل ہے جہاں گم ہونے کا امکان زیادہ ہے اور خود کو پانے اور جنگل سے نکل جانے کے امید نہ کے برابر ہے۔ ویسے میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ "استعارہ" دوچار شماروں سے آگے نہیں جاسکے گا۔ تاوقتیکہ تم اس کے مشمولات میں صحتمند تبدیلیاں نہ پیدا کر لو۔

تمہارا

(جمال اُویسی)

دربھنگہ (بھارت)

۵۱

منشاء یاد بہ نام احمد ہمیش

[illegible] اسلام آباد (44000) فون نمبر 277371

تاریخ ۲۸ راپریل ۲۰۰۰ء

احمد ہمیش

میرا خیال تھا تم نے اپنے خط میں آئندہ میرے خلاف کچھ نہ لکھنے کا جو وعدہ کیا تھا اس پر قائم رہو گے۔ مگر تم باز نہیں آئے۔ لیکن ایک لحاظ سے تم نے اچھا ہی کیا کہ میرا خط چھاپ دیا۔ مرزا حامد بیگ مجھے طعنے دیتا ہے کہ میں نے ایسا لجاجت آمیز خط کیوں اور کیسے لکھ لیا۔ کم از کم اس سے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں نے تمہیں کیسا خط لکھا اور تم نے میری فراخ دلی، محبت اور خلوص کا کیا جواب دیا۔ کیا تمہارے قارئین، دوستوں اور عزیزوں میں سے کسی نے بھی تمہاری توجہ اس امر کی طرف نہیں دلائی کہ جب رشید امجد، مرزا حامد بیگ اور منشا یاد نے وقتاً فوقتاً تمہارے افسانوں کی تعریف کی ہے تو تمہارا مسئلہ کیا ہے اور جواب میں تم اپنا ذہن کیوں بگاڑ رہے ہو؟

ادیبوں شاعروں کے ساتھ تمہارے وحشیانہ اور خونخوار رویے سے باور آتا ہے تم افسانے کے شیر یا ایسا ہی کوئی درندہ ضرور ہو گے۔ مگر بھیا تمہارا جنگل اور ہے اور ہم اگر لگڑ بگڑ بھی ہیں تو ہمارا جنگل کوئی دوسرا ہے۔ تمہارے مارے ہوئے شکار کو ہم (اپنے اوپر) حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا تم بتا سکتے ہو تم نے کونسا شکار مارا جو لگڑ بگڑ اٹھا کر لے گئے۔ کیا کوئی کہانی یا نادر خیال چوری ہو گیا؟ کیا کسی نے خدانخواستہ تمہارے اسلوب کا چربہ کیا۔ یا کونسا ایسا اعزاز یا ایوارڈ ہے جس کے تم حقدار تھے اور ہم میں سے کسی کو مل گیا؟ تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ انعام و اکرام کی نوازشیں کرنے والی لابی کونسی ہے اور کہاں واقع ہے اور ہم سب ان سے محروم ہیں۔

ایک بات تو صاف ظاہر ہے تم نے بھی انور سجاد کی طرح 'پنڈی وال گروپ' کے افسانوں کو بالکل نہیں پڑھا۔ (اگر ایسا کوئی گروپ ہے تو تم دونوں افسانے کے شیر بادشاہ اسے کوئی اچھا سا دلی یا مروجہ نام کیوں نہیں دے دیتے مثلاً شہر افسانہ۔ ہم نے تو کبھی انور سجاد کو لوڑ یا افسانہ نگار نہیں سمجھا) ورنہ صفت در صفت اور تشبیہ در تشبیہ والی تہمت سب پر نہ لگاتے اور ایسی بے خبری کی باتیں نہ لکھتے اور جانتے ہوتے کہ ان کے آپس میں کیا کیا فنی اختلافات رہے ہیں اور وہ اسلوب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کتنے الگ ہیں۔ انور سجاد تو خیر معروف اور ہر فن مولا آدمی ہے۔ صرف افسانہ نگاری اس کا پرابلم نہیں۔ اس کے درجنوں مشاغل میں سے ایک ہے۔ مگر تم تو شعر و ادب کے خالص آدمی ہونے کے دعویدار ہو اپنے علاوہ بھی کچھ پڑھتے ہو گے تمہیں تو ایسی بے سروپا باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم میں سے کسی کے پاس اپنا اخبار یا رسالہ نہیں اور ہوتا بھی تو ہم اسے علم و ادب کی خدمت اور ترویج کے لیے استعمال کرتے۔ تمہارے پاس ہے اور تم اسے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کر رہے ہو۔ تم نے اب تک جن شرفا کی پگڑیاں اچھالی ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ کیا یہ ادبی غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں؟

میں نے اپنی کتاب تمہیں تبصرے کے لیے نہیں بھیجی مہربانی کر کے اس پر تبصرے کی زحمت نہ کرنا۔ میں یہ خط بھی اپنے پیڈ پر دستخطوں کے بغیر بھیج رہا ہوں کہ یہ کوئی سرکاری چٹھی نہیں۔ اور نہ تمہارے سوا کبھی کسی دوست نے ایسی بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔ تم چاہو تو یہ خط چھاپ سکتے ہو۔ اللہ تمہیں ہدایت دے۔

منشا یاد

۷۔ تعلیم مافیا

ہمارے سماج کو دانشوروں کی ضرورت نہیں رہی

پروفیسر ن۔ م دانش

(ایم اے فرسٹ کلاس فرسٹ گولڈ میڈلسٹ)

"یہ میرے لئے بہت تکلیف دہ بات ہے کہ میں یہاں (پاکستان) سے جاؤں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اگر یہاں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں امریکہ کے کسی اسٹور میں کام کرنا پسند کرلوں گا لیکن موجودہ سوسائٹی میں دانشور اور پروفیسر کہلانا مزید افورڈ نہیں کر سکتا کیوں کہ میرے خیال میں یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ ہمارے سماج کو اب دانشوروں کی ضرورت نہیں رہی......

......میں نے جامعہ کراچی کے اردو شعبہ میں تقرری کیلئے 1998ء میں انٹرویو دیا تھا۔ بورڈ میں چار جید افراد تھے۔ ان میں پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر عبدالسلام اور سندھ پبلک سروس کمیشن سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری (جو عالی کے چیلے ہیں) شامل تھے۔

(مختصرا یہ کہ) ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی بیٹی عظمیٰ فرمان اور احمد ہمدانی کی بیٹی کا تقرر کردیا گیا۔ یوں میرٹ کا قتل کیا گیا۔ مجھے اقرباپروری کی بھینٹ چڑھادیا گیا۔ یہ بات میرے دل پر آج بھی بوجھ ہے کہ میں اس ناانصافی پر عدالت میں نہ جاسکا۔"

(روزنامہ ایکسپریس میں ن۔ م دانش کے انٹرویو سے اقتباس)

• اس سے قطع نظر کہ سحر انصاری خود جمیل الدین عالی کے ظالمانہ وغاصبانہ رویہ کے شکار ہوئے۔ مگر باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر وزیر آغا نوبل پرائز حاصل کرنے کے لئے سویڈن کی اکیڈمی اور امریکی لابی تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔ خدانخواستہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نوبل پرائز مل گیا تو کرہ ارض کا یہ ایک عظیم المیہ ہوگا۔ اسی طرح ادبی مفادات کو ایک لے جانے کی مہارت سے آصف فرخی اور پاک وہند کی بیوروکریسی اور انگلش DAWN کراچی کے ادبی صفحہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انتظار حسین...... دونوں آج کل ادبی سماجیات کے جنگل کا بادشاہ بننے کی کوشش کررہے ہیں اور امریکی لابی کے توسط سے جرمنی، کناڈا اور امریکہ کے سیر سپاٹے کررہے ہیں۔ تاہم آصف فرخی نے انتظار حسین کو کس طرح اپنے کاروباری معاملات کا شراکت دار بنایا...... اس کا انکشاف سہ ماہی تشکیل کے آئندہ شمارہ میں ہوگا۔

(ادارہ)

اب میں تھا، وہ روشنی تھی۔ خلا تھا۔ کیا وہ خلا ہی میرا حاصل تھا؟ وہ دیوار کیا تھی؟ میری ماں، میری بیوی، میرے بچے، میرا سارا مال متاع، میری دوستیاں، میری دشمنیاں ......وہ کیا خواب تھیں...... یا یہ خواب ہیں؟

کیا واقعتاً میں مر چکا ہوں؟ اگر مر چکا ہوں تو یہ کہانی کون لکھ رہا ہے؟...... یہ عجیب سی گتھی ہے، کبھی سلجھا سکا تو بتا سکوں گا۔ فی الحال تو یہ بتانا چاہوں گا کہ خلا میں دھوئیں کی ایک نئی دیوار میرے آگے اٹھ رہی تھی اور میرے ہاتھ خالی تھے۔ میں سب کچھ تو زمین پہ چھوڑ آیا تھا۔

(اردو اور ہندی کے جانے مانے کہانی کار حسن جمال کی کہانی "دیوار" کا اختتام)

شہناز کنول غازی کے نام

کہانی

احمد ہمیش

مرقعِ ذات

تخلیقی کہانی لکھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کے لئے کہانی کار کو اپنی ذات کے تشخص کو قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے انفرادی اسلوب ناگزیر ہے۔ مگر افسوس اس کو کیا کیا جائے کہ حال ہی میں ڈاکٹر انور سجاد نے ایک بنیاد پرست مذہبی پارٹی جوائن کر لی پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی اداکار، اداکارائیں اور گانے والیاں بھی مذکور پارٹی کے ثقافتی ونگ میں شامل ہو گئیں گو اداکاروں، اداکاراؤں اور گانے والیوں کی کوئی اپنی ذات، اپنی شخصیت، اپنا چہرہ اور اپنی زندگی نہیں ہوتی۔ تاہم ڈاکٹر انور سجاد تو اول اول کہانی کار ہونے کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے رہے جبکہ اداکاری تو انہوں نے محض ضمناً کی۔ پھر یہ کہ اداکاری کرتے ہوئے خواہ چہرہ پر کوئی بھی مکھوٹا یا ماسک چڑھا لیا جائے، اصل چہرہ تو اہلِ نظر سے نہیں چھپ سکتا مگر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ اصل چہرہ چھپانے کی شروعات تو انتظار حسین نے کی۔ وہ بھارت سرکار کی بنیاد پرست ہندو ونگ سے مالی مراعات اور انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے اپنی کہانیوں میں ہندو مت اور ہندو دیومالائی کتھاؤں کی پیوند کاری کرتے رہے۔ مگر اپنی اس ہندو بنیاد پرستی کو موصوف نے کیمو فلاج اس طرح کیا کہ لفاظی کے ہیر پھیر اور کچھوے والی آہستہ رفتار چالاکی سے اپنے قریبی حریف ڈاکٹر انور سجاد کو ان کی افسانہ نگاری سمیت مسلم بنیاد پرستی کے کنوئیں میں دھکیل دیا اور خود بہ زعم خویش روشن خیال بن بیٹھے مگر مشکل یہ ہے کہ لکھنئو کے درباری ماحول میں مقامی سطح کی نشستوں اور ستائش باہمی سے منصوبہ بند انٹرویوز میں نیر مسعود جیسے منفرد کہانی کار کو انتظار حسین کے سوا کچھ بھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں ادبی دیانت داری معلوم نہیں کیسے "اڑن چھو" ہو جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ جس سطح پر عبدالصمد اور اختر آزاد تخلیقی کہانی سے علاقہ رکھتے ہیں، وہیں کہیں شاہد اختر باصلاحیت ہوتے ہوئے بھی کہانی کی تنقید یا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آنکھیں کھلی نہیں رکھتے۔ اس سے تو بہتر وہ سادہ رویہ ہے جو امین جالندھری اور ڈاکٹر شمیم انصاری کے یہاں پایا جاتا ہے۔ حوصلہ افزائی بھی ناگزیر ہے البتہ گذشتہ دہائیوں کی رجحاناتی قید تو صرف غیر تخلیقی کہانیاں لکھنے والے منشیوں کے لئے ہے۔ خیال رہے کہ تخلیقی کہانی دہائیوں کی رجحاناتی قید سے بالکل آزاد ہے۔ تخلیقی کہانی اور غیر تخلیقی کہانی کے درمیان خطِ تنسیخ کھینچنا اس لئے ضروری ہے کہ اردو سمیت مختلف زبانوں میں لکھی جا رہی بے شمار ڈیڑھ دو صفحات والی غیر تخلیقی کہانیوں سے ڈھیروں رِم کاغذ تباہ ہونے سے بچ جائے۔

عارضی جنگ بندی

کہانی

عبد الصمد

غنیمت تھا کہ اُنہیں ایک ایسی جگہ میسر آگئی تھی جہاں کوئی کھڑکی نہ روشن دان...... یہاں تک کہ کوئی سوراخ، کوئی پتلی سی لکیر بھی نہیں۔

اور اس سے زیادہ غنیمت تھا کہ کچھ ہم زبان ایک ہی جگہ پر جمع تھے اور ایک دوسرے سے اپنے دل کی کہہ سکتے تھے لیکن بس اُنہی لمحوں میں جب وہ ڈر، خوف اور تشویش کے جال سے کچھ دیر کے لئے نکل پاتے ہاں ان میں سے کچھ تو مسلسل اس بات پر مامور تھے کہ وہ بس دیکھتے رہیں کہ کسی کمزور لمحے میں کہیں سے وہ اندر داخل نہ ہو سکیں، اُنہوں نے آپس میں گروپ بنا لئے تھے، ایک گروپ تھک جاتا تو اُس کی جگہ دوسرا گروپ آجاتا وہ تھک جاتا تو......

بات کچھ ایسی تھی کہ اُس کے بارے میں سوچتے ہی سے وہ کپکپا اُٹھتے اور اُن کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔

"یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا بھائی...... تمہارے درمیان سے وہ چیز اُٹھ جائے گی تو ایک ایسے ہی مخلوق......"

مذہبی نظر

آنے والے شخص نے دیر سے جمی برف کو بڑی آسانی سے توڑنے کی کوشش کی۔

"ہمارے درمیان سے......؟ ہم تو خود درمیان کی چیز ہیں، ہمیں اتنی ذلیل ترین......؟" عاجز نظر آنے والے شخص نے فریاد کی، اس پر وہ دیوانہ زور سے ہنس اُٹھا جو یوں تو دیوانہ کہا جاتا، لیکن اُس کا ہنسنا، اُس کا رونا۔ اُس کی اکثر باتیں فرزانگی کہ آنگن میں پتھر کی طرح جا گرتیں۔

سب اُسے گھورنے لگے، وہ بے پرواہ بس ہنستا ہی رہا اور جب خوب ہنس چکا تو خود ہی خاموش ہو گیا۔

"ہوں...... یہ سازش بہت دنوں سے ہو رہی تھی اچانک اس قدر منظم انداز میں یہ چیز ممکن ہی نہیں۔"

نہتا نظر آنے والے شخص نے اظہار خیال کیا۔

"کیا کوئی غیر ملکی سازش......؟؟"

اخباری نمائندہ کی شکل وصورت والے شخص نے دھیرے سے سونگھنے کی کوشش کی۔

"کیا ملکی اور کیا غیر ملکی......؟ سازش ملکی نہ ہو تو اُس پر غیر ملکی رنگ چڑھ ہی نہیں سکتا......"

بے پرواہ نظر آنے والے شخص نے سرزنش کی۔

"مارے گئے گلفام......"

شاعر نما شخص گنگنا اٹھا۔

اچانک دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا، سارے لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، ان کے چہرے پیلے پڑ گئے۔

"شاید...... کوئی مصیبت کا مارا آگیا ہے، اُسے فوراً اندر بلا لینا چاہیئے......" زیادہ تر لوگوں کی رائے تھی۔

"اُس کے ساتھ کہیں وہ بھی......"

کچھ لوگ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے، دروازہ مسلسل پیٹا جارہا تھا۔

"ارے لوگوں کی انسانیت کہاں مر گئی......؟ ایک انسان مصیبت میں گھر گیا ہے اور آپ ہیں کہ......"

دیر سے چُپ چُپ ایک شخص چیخ اٹھا۔ وہ سب کے سب یقین اور بے یقین کے کرب میں بدحواس بس ایک دوسرے کو دیکھے جارہے تھے، دیوانہ سب سے الگ تھلگ دیوار سے لگا پڑا ہوا رہا تھا، اچانک اُٹھا اور سب کو پھلانگتے ہوئے تیر کی طرح سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس سے قبل کہ کسی کو کچھ سوچنے کا موقع ملے، اُس نے دروازہ کھول دیا، زخموں سے چور ایک شخص تیز جھونکے کی طرح اندر گھسا اور بے ہوش ہو کر گر گیا دیوانے نے جتنی تیزی سے دروازہ کھولا تھا اتنی ہی تیزی سے اُسے بند بھی کر دیا۔

اُس آدمی کو اُنہوں نے بے رحمی کے ساتھ سر سے پیر تک کتر ڈالا تھا، جگہ جگہ زخم رس رہے تھے اور وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی کراہ رہا تھا، اُنہوں نے جلدی جلدی اُس کے زخم صاف کیئے، اپنے پانی کے ذخیرے سے کئی بوندیں اُس کے حلق میں ٹپکائیں، اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی یہ حالت دیکھ کر غم و غصہ سے اُن کی مٹھیاں بھنچ گئیں، آنکھوں میں چنگاریاں سی اُڑنے لگیں، کچھ دیر یہی کیفیت رہی، پھر آہستہ آہستہ سب کچھ شانت ہو گیا، مٹھیاں کھل گئیں، اور چنگاریوں کی جگہ پیلی ڈوریاں دوڑنے لگیں۔

"اُف...... ایسی ذلت...... کبھی سوچا بھی نہیں تھا......"

سوچنے والے شخص نے سب کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی۔

"سزا ہی ملنی تھی تو اس کی اور شکلیں بھی......"

مدبر نظر آنے والے شخص نے بہت آہستہ سے کہا لیکن جن لوگوں تک اُس کی بات پہنچنی تھی، پہنچ گئی۔

"یعنی......؟؟"

استفسار میں سب شریک ہو گئے۔

"بے شمار شکلیں...... کچھ تو پہلے سے موجود ہیں، اکثر دہرائی بھی جاتی رہی ہیں......"

"واہ صاحب...... ہم آپ ہر چیز میں کچھ نیا پن ڈھونڈتے رہیں اور وہ......"

دیوانہ اس گفتگو سے دُور تھا لیکن اچانک ٹپک پڑا۔

"کہنے کا مطلب ہے...... یعنی یہ کہ......" مدبر نے ہاتھ اٹھا کر وضاحت کی کوشش کی، شاید فوری طور پر اُس کے ذہن میں کوئی بجلی نہیں چمکی تھی

"ہاں...... ہاں، کہئے کہئے...... کیا مطلب ہے......؟"

دیوانے نے بالکل ہوش وحواس کے انداز میں پوچھا۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے...... آپ شیر کے مقابلے میں ایک چوہے کے ہاتھوں مرنا پسند کریں گے کیا......؟"

اُس نے جلدی سے گلو خلاصی کرلی۔

"لیکن ہم سے کسی نے پسند تو نہیں پوچھی......؟"

ایک بے بس شخص نے دھیرے سے کہا۔

بے ہوش کے ہوش میں آنے کے آثار نظر آئے، سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے، ایک شخص نے اُس کے تلوے رگڑنے شروع کر دیے، دوسرا اُس کا سر اپنی گود میں لے کر دبانے لگا، تیسرے نے پانی سے تر رومال اُس کی پیشانی اور چہرے پر پھیرا، چوتھے نے روئی کا ایک پھاہا لے کر اُس کے رستے زخموں کو...... دیوانہ یہ ساری کاروائی بڑی تمسخرانہ انداز میں دیکھتا رہا۔

بالآخر بے ہوش نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے خوف کے جن سایوں کو سمیٹ کر اپنی آنکھیں بند کی تھیں، وہ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک دندنا رہے تھے، وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا، اپنے اردگرد اجنبی نگاہیں ڈالیں، اُس کی پتلیوں سے سائے نکل کر اُس کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔

اُس نے کپکپاتی ہوئی زبان اپنے لرزتے ہونٹوں پر پھیری اور اپنے آپ سے سرگوشیوں میں مخاطب ہوا۔

"......وہ ہمیں گھیر چکے ہیں...... ہماری نجات کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا......"

سب نے ایک دوسرے کو ہونقوں کی طرح دیکھا، اتنی بات تو وہ جانتے ہی تھے۔ لیکن اپنے آپ کو پیچھے دھکیلنا بھی وقت کی ایک مصلحت ٹھہری۔

"کون ہیں وہ......؟"

ایک بزرگ نے بڑے سکون سے پوچھا، بے ہوش نے اگرچہ اب وہ ہوش میں آچکا تھا، بڑی اُلجھن سے اُس

کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے چاروں طرف کھڑے سایوں پر نگاہ ڈالی، سفید سادے کاغذ...... کہیں پر کچھ لکھا ہوا نہیں۔

"چوہے، چھچھوندر، مکڑے، کاکروچ، چھپکلیاں، چیونٹے، مکھیاں، مچھر......اور ستاؤں اور ستاؤں......"

اس کی آواز بہ تدریج بلند ہوتی گئی اور اس پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، اس وقت سب کا خاموش رہنا ہی مناسب تھا، سو وہ خاموش رہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنے آپ میں واپس آیا۔

"......انہوں نے کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑی، کیا ایوان، کیا دیوان، مملکت، بازار، عمارتیں، سڑکیں، گلیاں......وہ چپے چپے پر پھیل گئے ہیں، بالشت بھر جگہ بھی اُن سے بچی نہیں رہی......اُنہوں نے اُن فضاؤں پر بھی قبضہ جمالیا ہے جہاں تک ہمارے ہاتھ جاسکتے ہیں......"

کوئی نئی جانکاری تو نہیں ملی البتہ جو کچھ لیکر وہ یہاں بند ہوئے تھے، اُنہیں مزید استحکام پہنچا اور نئے سرے سے ہذیانی باتوں کا سلسلہ جاری کرنے کا ایک وسیلہ......

"سمجھ میں نہیں آتا کہ......پانچ، دس، پچاس، پانچ سو، ہزار، دس ہزار......کی بات ہوتی تو......لیکن یہاں تو......یہاں تو......" جھنا کی آواز تفکر سے بھری ہوئی تھی۔

"عجیب بات ہے......زمین کے نیچے اور آسمان کے اُوپر یہ اتنی بڑی تعداد میں تھے۔ اور ہمارا علم......زمین میری، آسمان میرا......"

مفکر نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

"شاید......شاید......انسانوں سے بھی زیادہ......"

اخباری نمائندے نے جیسے استفسار کیا۔

"یقیناً......یقیناً......"

بے پرواہ شخص نے زوروں سے سر ہلایا۔

"ارے بھائی......وہ آپس میں مل کر......ہم انسان اُن سے کہیں زیادہ ہیں بھائی......"

مذہبی شخص نے بہت دیر کے بعد اپنی زبان کھولی۔

"کالے......اُجلے......لمبے......ناٹے......انسان......جانور......اُونہہ......"

دیوانہ بڑبڑایا۔ سب نے اُسے گھورا، پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا، اُس کی باتوں کا جواب دینا کوئی پسند بھی نہیں کرتا تھا۔

درمیان بلاوجہ کی خاموشی چپ چاپ آکر بیٹھ گئی، لوگوں نے اتنی نکیلی نگاہیں اُس پر گاڑیں کہ اُسے بھاگتے ہی بنی۔

"ارے..... ارے..... آپ سب یہاں حالاتِ حاضرہ پر تبصرے فرما رہے ہیں اور اُن کم بختوں نے ہماری برسوں کی قیمتی محنت کو برباد کر دیا تو.....؟"

اتنی دیر سے خاموش بدحواس، سائنس دان نظر آنے والا شخص اچانک بڑے زور سے چلایا۔

"ارے واقعی..... اُن حرام زادوں میں زیادہ تر تو کترنے ہی والے ہیں..... انہیں دیر ہی کتنی لگے گی۔۔؟"

بہت دیر سے ایک کتاب میں گم عجیب و غریب شخص نے اُس کی مکھی پر مکھی ماری

"اچھا ہے..... غلطی سے کچھ ادھر اُدھر ہو جائے اور سب سالے فنا کے گھاٹ....."

ایک پراسرار شخص نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔

"وہ بھی اُس طرح مرتے ہیں کیا..... ؟؟ اور کترنے سے اُن کا کیا بگڑے گا، وہ ہماری ساری فتوحات پر....."

سائنس داں بے حد فکر مند تھا

"کسی چیز کو نہیں چھوڑا انہوں نے..... کسی چیز کو نہیں، کچھ بھی باقی نہیں بچا اُن سے....."

بے ہوش کراہا۔

"ہم پر اتنی بے بسی کبھی نہیں آئی تھی..... سب مقدر ہیں ہمارے....."

مذہبی شخص نے اُونچی آواز میں کہا۔

"تو زمین پھٹ جاتی اور ہم اُس میں سما جاتے، آسمان تنگ ہو جاتا لیکن یہ..... اتنی ذلت..... یہ ذلت تو بنی نوعِ انسان کی۔

چپ چپ شخص نے مذہبی کو گھورا۔ سب نے خاموش رہ کر گویا اُس کی تائید کی۔

"پٹے پر کوئی ہاتھ نہ دھرے، ناک پر کوئی مکھی نہ بیٹھے..... اُونہہ..... لو سالو بند رہو اور بند بند مر جاؤ..... کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں ہے..... ؟ کب تک بند رہو گے، کب تک..... ؟ اپنی ہتھیلیوں کے دانے پانی سے کب تک جی بہلاتے رہو گے اب بولو..... ؟ بولتے کیوں نہیں..... ؟؟"

دیوانہ چیخنے لگا، اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا، کئی آدمیوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

اُس عالم میں اُس کی بات کا جواب دینا نامعلوم خطرات کو دعوت دینا تھا، چنانچہ اُنہوں نے روٹھی ہوئی خاموشی کو چمکار چمکار کر اپنے پاس بلایا، وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

بیٹھے بیٹھے اُس کی ہلکی پھلکی شخصیت پھر بوجھ بننے لگی، اس چیز کو اس نے خود ہی محسوس کر لیا اور چپ چاپ

اُٹھ کر چلی گئی۔

"آخر ہو گا کیا......؟"

اخباری نمائندوں نے اُوب کر پوچھا۔

"ہو گا کیا......؟ ہم تو نامعلوم جزیروں میں قید ہو گئے ہیں اور ہماری رہائی کی کوئی صورت ہی نہیں......"

مفکر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو پھر ہمارے بھائی نے ٹھیک ہی کہا...... یہاں بہ بہ بہ ہم مر جائیں گے اور کوئی ہمیں پوچھنے والا بھی نہیں ہو گا......"

بیکار شخص نے بے حد سپاٹ لہجے میں ایک عام بات کہی

"یعنی ہم اسی وقت تک زندہ ہیں جب تک ہماری زنبیلوں میں ہمارا دانہ پانی باقی ہے...... دانہ پانی ختم اور ہم ختم...... اس لئے کہ باہر سے تو......"

اخباری نمائندے نے خلافِ معمول اپنی بات کا خود ہی جواب فراہم کر دیا۔

ہم اُن کی بہت بڑی ضیافت کرنے جا رہے ہیں...... عام دعوت...... پوری قوم کی...... ایسی دعوت نہ کسی نے سنی نہ دیکھی......"

دیوانے نے جیسے دُور کی کوڑی لائی، پھر اپنی ہی بات پر دل کھول کر ہنسا۔

سب لرز گئے، اُن کی آنکھوں میں الٹے سیدھے سائے

"بھائی کی بات تو صحیح ہے...... اس سے بہتر ہے کہ ہم اُن کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کر ہی لیں......"

مدبر نے چوکنی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے دبی زبان سے کہا لیکن بات ہر جگہ پہنچ گئی، جہاں براہ راست نہیں پہنچی وہاں کانوں کان...... فوراً ہی دو زاویہ نگاہ قائم ہو گیا، ممکن ہے کچھ اور زاویے بھی ہوں۔

ایک کا کہنا تھا کہ ابھی جو صورت حال ہے، اُسے قائم رہنے دیا جائے، ممکن ہے آگے کوئی صورت ایسی نکلے......

دوسرے کا خیال تھا کہ اس سے تو موت بہتر ہے، اس لئے......

دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں، کس نے اس سلسلے میں کیا کہا، پتہ نہیں چل سکا، دیوانہ ایک الگ زاویہ نگاہ بن کر اپنے حال میں مست کچھ گنگنانے میں مصروف تھا۔

دونوں زاویوں کی نگاہیں اس پر بار بار پڑ رہی تھیں،

"یوں بھی انہوں نے کافی کچھ نقصان پہنچا ڈالا ہے اور اگر انہیں مزید موقع ملا تو وہ کسی چیز کو ہمارے لائق

نہ چھوڑیں گے......؟

یہ ایک نئے آدمی کی آواز تھی جو بتدریج بلند ہو چکی تھی، اس بات پر سر ہلانے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔

"اور جب وہ سب چیزوں کی مٹی پلید کر لیں گے تو ان کی نگاہیں یہیں اُٹھیں گی...... ہمارے اس عارضی گوشہ عافیت پر......"

بیکار شخص نے بھی بہ آوازِ بلند اُس کا ساتھ دیا۔

"اور وہ نگاہیں آخری ہوں گی......"

شاعر نما شخص نے ہانک لگائی۔

ایسے موقع پر لاتعلق اشخاص ہمیشہ توازن بنائے رکھتے ہیں۔

یعنی وہ جو اندر باہر...... ہر جگہ موجود رہتے ہیں، ان کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی لیکن خاص موقعوں پر اُن کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ حلقہ ایک طرف کو جھک گیا ہے اور......

سب لوگ بیزاری سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، جو ڈر رہے تھے وہ بھی، جو دلیری دکھا رہے تھے وہ بھی ...... مسئلہ اب بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا تھا جس کے لئے بظاہر کوئی تیار نہیں تھا۔

ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اُن کی نگاہیں دیوانے پر پڑیں، وہ سب سے بے پرواہ اور لاتعلق اپنی دنیا میں مگن تھا، بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑنے کا اس کا انداز مفقود تھا اور اُسے چھیڑنے کا خطرہ مول لینے کو بھی کوئی تیار نہیں تھا۔

اچانک ایک تبدیلی سی محسوس ہوئی، شاید دروازے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ سب کے چہرے فق ہو گئے۔

"میں کہہ رہا تھا...... اب وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں......"

مدبر نے فاتحانہ انداز میں سب کو دیکھا۔

"شاید...... شاید، اب اُن کی ساری قوت اِدھر ہی لگے گی اور وہ بس چند لمحوں میں ہم پر ہلہ بول دیں گے۔"

ایک نامعلوم شخص نے آگے کا ایک نقشہ کھینچا۔

"کھول ہی دینے میں ہماری نجات ہے...... ہم باہر نکلیں گے تو ہر چار طرف پھیل جائیں گے لیکن اس طرح تو ہم بڑی آسانی سے اُن کے شکار ہو جائیں گے......"

مذہبی شخص نے دنیاوی معاملات میں ایک صائب رائے دی۔

دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، جو لوگ حفاظت پر مامور تھے، اُنھوں نے اپنی سیٹوں کو تختہ بنا لیا تھا۔

"اگر وہ دروازہ نہیں اکھاڑ سکے تو کتر دیں گے...... لاکھوں، کروڑوں اس کام میں لگ گئے تو کیا مشکل ہوگی......؟"

سب نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سب کے چہرے پر ایک ہی جواب تھا......

جن کے چہروں پر نہیں تھا وہ بھی اس میں گم ہو گئے تھے اور جو کچھ ہونے والا تھا، وہ گویا متفقہ فیصلہ تھا۔

لیکن دروازہ کھلنے پر ایک عجیب بات ہوئی۔

شک و شبہ کی دیوار کے آرپار وہ ایک دوسرے کے سامنے عارضی جنگ بندی کی حالت میں کھڑے تھے۔

کوئی آگے نہیں بڑھ رہا تھا، ایک دوسرے کو پلک جھپکائے بغیر ٹکٹکی دیکھے جا رہے تھے۔

اس صورت حال سے دیوانے کو پتہ نہیں کون سی گدگدی ہوئی کہ اس نے جو ہنسنا شروع کیا تو ہنستا ہی گیا...... ہنستا ہی گیا۔

عبدالصمد۔ سکونت، پٹنہ بہار (بھارت)

سائمسی ٹوئنز Siamese Twins

کہانی

نیر جہاں

ظہیر علی کی وفات کے چھ ماہ بعد بھی جب اُس کے ذکر پر سارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو حبیبہ علی کے ذہن میں پہلی مرتبہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے ایک شے نے سر اٹھایا۔ آج بھی روز کی طرح شام ہی سے سارا اُس کے پاس آگئی تھی اور دونوں اپنے اپنے بچوں کو کھلانے اور سلانے سے فراغت پا کر باتوں میں مشغول تھیں پھر حبیبہ رات گئے اسے رخصت کرنے دروازے تک گئی۔ حسب عادت دونوں دروازے ہی کے پاس کھڑی ہو کر باتیں انگریزی ادب میں دکھ اور محرومی کے موضوع پر کر رہی تھیں۔ سارا نے Shelley کو دہراتے ہوئے کہا We look before and after

And pine for what is not

یہ کہہ کر اُس نے ظہیر علی کے نام کی تختی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

I wish there would be a device to erase memories

تب سانپ نے سر اٹھایا اور پھنکار ماری اور حبیبہ نے دل کو بہلاتے ہوئے دہرایا ان الانسان لفی خسر!

حبیبہ کا زرد اترا ہوا چہرہ رتجگوں کی گواہ سرخ آنکھیں آواز میں رچے ہوئے آنسو اور پورے وجود پر کرب کی مہر اپنے شوہر سے اُس کی بے پناہ محبت کی گواہی دیتی تھیں۔ سارا اُس کی پڑوسن اور بہترین سہیلی تھی اور بچپن کی سہیلی سارا لندن سے تھی اور ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم تھی۔ دراصل یہ duplex ان لوگوں نے سارا ہی سے خریدا تھا۔ سیامیز ٹوئنس کی طرح یہ دونوں گھر پشت کی مشترکہ دیوار سے جڑے ہوئے تھے۔ لیکن فرنٹ بالکل مخالف رخوں پر تھے۔ ظہیر نے یہ گھر بڑے ہی خفیہ انداز میں خریدا تھا ویسے بھی ظہیر خاموش طبیعت انسان تھا اس کے والد پاکستان میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے اور حبیبہ کے والد کسٹمز کلکٹر تھے۔ بچوں کا رشتہ خود بچوں کے لئے مناسب تھا یا نہیں لیکن والدین کے بزنس کی بقاء کا ضامن ضرور تھا لہٰذا جونہی ظہیر امریکہ سے چھٹیوں میں گھر آیا حبیبہ سے اس کی شادی کر دی گئی۔ کسی پسند ناپسند اقرار یا انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی۔ رہی حبیبہ تو امی نے گلے سے لگا کر صرف اتنا کہا تھا "بیٹی خوابوں کو آنکھوں تک ہی رہنے دینا" اور حبیبہ سمجھ گئی تھی کہ اگر کہیں خواب آنکھوں کی سیڑھیوں سے اتر کر دل تک پہنچ جائیں تو پھر ہر دھڑکن میں سما جاتے ہیں اور زندگی جیسے ہر وقت دھڑکتے ہوئے ٹائم بم کے سائے میں

گزرنے لگتی ہے کیا جانے کب کہاں کس جگہ یہ بم پھٹ پڑے اور عافیت کا گوشہ گوشہ تباہ کر ڈالے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ منظور احمد نے کالج میں سوائے ہنسی مذاق کرنے کے کبھی کسی قوس و قزح کسی کہکشاں یا کسی خوبصورت خواب کی طرف جھوٹوں بھی اشارہ نہیں کیا تھا۔ محبت کو یک طرفہ سڑک کی طرح یادوں میں تو چلایا جاسکتا ہے عملی زندگی میں نہیں۔ حبیبہ نے مڑ کر اپنی اماں خالہ اور اپیا کی طرف دیکھا۔ ہر چہرے پر ایک ہی کہانی لکھی تھی۔ خالہ کی ویران آنکھیں۔ امی کی بناؤ سنگھار سے بے نیازانہ برتاؤ اور اپیا کی زرد پھولوں جیسی اداس مسکراہٹ...... چلو اچھا ہوا سب نے تائم ہم سے بچنے کا راستہ ڈھونڈ لیا اور آنکھوں سے دل تک جانے والے زینے پر کہیں کسی کا کوئی نقشِ قدم ابھرنے نہیں دیا۔

حبیبہ کو شادی کے بعد پتہ ہی نہیں چلا کہ سمندروں کو پار کرتے کرتے وہ کب حبیبہ سے بالی بنی کب شلوار کی جگہ جینز اور لمبی چوٹی کی جگہ چھوٹے چھوٹے بالوں نے لے لی۔ نیاگرا آبشار کے قریب اس چھوٹی سی بستی میں رہتے ہوئے حبیبہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جب انسان اندر سے سمجھوتوں کے لئے تیار ہو تو باہر کی زندگی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ بڑے دنوں بعد جب ایک دن ظہیر کی بہن نے باتوں باتوں ہی میں حبیبہ کو بتایا کہ "بھیا کو تو بڑی گوری چٹی دلہن چاہیے تھی" تو حبیبہ کے سمجھوتوں نے کراہ کے ساتھ ایک کروٹ بدلی تھی اس کا دل اپنی سانولی رنگت پر بہت دکھا تھا اور وہ اس وقت تک گورے ہونے کے نسخے آزماتی رہی تھی جب تک روشن پیدا نہیں ہو گیا۔ پھر تو دن رات جیسے خالی فری وے پر دوڑتی ہوئی کاروں کی طرح گزرنے لگے روشن کی پہلی دوسری اور تیسری سالگرہیں آتی چلی گئیں۔ کہ اچانک حبیبہ کو احساس ہوا کہ اس کا شوہر کچھ بدل سا گیا ہے اب وہ اکثر دیر سے گھر آتا اور آنے کے بعد بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ڈوبا سا لگتا۔ عموماً ویک اینڈز پر بھی کام کے سلسلے میں باہر چلا جاتا ابھی وہ حالات کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ ایک شام وہ جلدی گھر آگیا۔ کہنے لگا

"جلدی سے تیار ہو جاؤ ایک جگہ جانا ہے"

"کہاں کس کے گھر...... کیا تقریب ہے" وہ بار بار بے تابی سے پوچھتی رہی مگر ظہیر چہرے پر بچھی ہوئی مسکراہٹ سے معاملے کو اور بھی پراسرار بناتا رہا یہاں تک کہ جب اسکائی وے سے انھوں نے نیاگرا فالز کی ex.t لی تو حبیبہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "یہ نیاگرا فالز جانا کب سے اتنی خفیہ بات ہو گئی" ان کا اپارٹمنٹ فالز سے بہت زیادہ دور بھی نہ تھا۔ یہ پورا شہر ہی بہت چھوٹا سا تھا۔ ظہیر نے خاموشی سے کار کو دو چار سڑکوں پر گھمانے کے بعد ایک گھر کے آگے روک دیا اور گھنٹی بجائی۔ ایک دراز قد خاصی خوش شکل امریکن لڑکی نے دروازہ کھولا اور بڑی خوشدلی سے بولی۔

"ہائے عالی"

"مس برٹن یہ میری بیوی یا بی اور بیٹا روشن ہے۔" پھر حبیبہ سے بولا یا بی یہ مس برٹن ہیں اور یہ انکی بیٹی مریم"

گوری سی بڑی بڑی کالی آنکھوں اور کالے بالوں والی چھوٹی سی بچی نے شرما کر ماں کے اسکرٹ کے پیچھے چھپتے ہوئے ہلکی آواز میں "ہائے" کہا

چار سال پہلے جب حبیبہ امریکہ سے آئی تھی تب کوئی اسے کنواری ماں بلاتا تو اس پر بجلی گر پڑتی مگر اب اسکی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں کی عورت کی زندگی میں مرد کار کے spare tyre کی حیثیت رکھتا ہے تب ہی تو اس ملک میں ہر فارم پر شناخت کے لئے صرف ماں کا نام ضروری ہوتا ہے

ان الانسان لفی خسر!

حبیبہ ابھی اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں سمجھی تھی کہ ظہیر نے سارا کے ہاتھ سے چابی لی اور اسے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہتا ہوا چکر کاٹ کے گھر کے دوسری طرف پہنچا تالا کھولا اور اندر داخل ہو کر انتہائی ڈرامائی انداز میں دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ہتھیلیوں کی طشتری پر چابی رکھ کے بولا۔

"مبارک ہو لینڈ لیڈی بننا"

حبیبہ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ مشرقی عورت کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ کسی قبر میں پاؤں لٹکائی ہوئی بڑھیا سے بھی پوچھیے تو وہ گھر ہی کی فرمائش کریگی۔ اور حبیبہ تو نہ صرف جوان تھی بلکہ ایک ایسے بچے کی ماں تھی جس کے لئے ایک بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں اب ٹرائیسکل چلانا ناممکن ہو گیا تھا۔

اگلے چھ آٹھ ماہ گھر کو سنوارنے اور پڑوسن سے دوستی بڑھانے میں گذر گئے۔ نئے گھر میں آنے کے بعد جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ اب ظہیر جلدی گھر آجاتا اور سوائے ویک اینڈز کے تقریباً تمام وقت گھر پر گذارتا۔ گرمیاں چلی گئیں جاڑے آگئے قیامت کی برفباری میں حبیبہ دروازے کھڑکیاں بند کئے شوہر کے لئے سوئیٹر بنتی رہتی اور سوچتی رہتی کہ اللہ کتنا مہربان ہے پڑوس کی سارا برٹن سے اسکی بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بھی روز کام پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی مریم کو حبیبہ کے پاس چھوڑ دیتی دونوں بچے مگن کھیلتے رہتے حبیبہ کو بھی مریم سے بہت محبت ہو گئی تھی دونوں بچے آدھی انگریزی اور آدھی اردو میں باتیں کرتے حبیبہ جہاں جاتی دونوں کو ساتھ لیجاتی بارہا ایسا ہوا کہ لوگ روک کے پوچھتے are these twins? اور حبیبہ ہنس پڑتی صرف ان ویک اینڈز پر جب ظہیر کو باہر جانا پڑتا وہ دکھی ہو جاتی ایسے میں اکثر سارا بھی اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی تو تنہائی بہت بڑھ جاتی لیکن اگر انسان اندر سے تنہا نہ ہو تو باہر کی تنہائی سے نبٹ سکتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ ظہیر کے برابر لیٹتی تو سارا کے اکیلے پن کا خیال آجاتا وہ کہتی "ظہیر دیکھو یہ دونوں گھر

بالکل ایک جیسے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں آپ جیسا شریف شخص ہے اور سارا کے گھر میں وہ کمینہ انسان نہیں"۔ حبیبہ کو اکثر اس پاکستانی لڑکے پر غصہ آتا جو سارا سے دل لگی کرتے کرتے ایک عدد بچی کا تحفہ دیکر وطن چلا گیا۔ کبھی کبھی وہ جھلا کر کہتی "ان کمبختوں کو خدا کا خوف بھی نہیں...... کیا انکی اپنی بہنیں نہیں ہوتیں" کبھی وہ سوچتی ظہیر سے کہیگی کہ آؤ یہ بیچ کی دیوار گرا دیتے ہیں اسلام میں تو دو شادیاں جائز ہیں کم از کم ایک بچی کو باپ اور ایک عورت کو معاشرے میں عزت تو مل جائیگی مگر دوسرے لمحے وہ اپنی بیوقوفی پر خود ہی مسکرانے لگتی عورت محبت میں شرکت کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ عجب بات یہ تھی کہ حبیبہ کو تو اس بیوفا لڑکے پر غصہ آتا مگر سارا ہمیشہ اُسکی طرفداری کرتی اور کہتی "یو نو تم اس کو نہیں جانتیں۔ ضرور کوئی مجبوری رہی ہوگی ورنہ وہ ایسا نہیں ہے"

کبھی کبھی حبیبہ جب تنہا ہوتی سارا اپنے ماں باپ کے گھر اور ظہیر کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہوتا تو اُسے سارا کا گھر اور ساتھ میں اپنا گھر عجیب آسیب زدہ لگتے۔ ہلکے ہلکے قدموں سے چلنے کی آہٹیں۔ دبی دبی سی ہنسی رات گئے برتنوں کے بجنے کی آوازیں نلکے کھلنے بند ہونے کی آوازیں جب آتیں تو حبیبہ سہم کر آیت الکرسی پڑھتی۔ چاروں قل پڑھ کے حصار باندھتی یا مولا مدد...... یا مولا مدد کہتی ہوئی روشن کو سینے سے چمٹا لیتی کبھی کبھی جب دن میں بھی یہ آوازیں آتیں تو وہ ہر آہٹ کو اپنا وہم سمجھتی اور ظہیر کی واپسی پر اُس سے اپنے خوف کا اظہار کرتی تو وہ ہنس کر مذاق اڑانے لگتا۔ سو یہ دونوں گھر ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے نہیں تھے مگر جس دن ظہیر علی کا حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوا اُس دن یہ دونوں گھر ایک جیسے ہوگئے سارا روزانہ کام کے بعد حبیبہ کے پاس آجاتی اور دونوں گھنٹوں بیٹھی ظہیر علی کو یاد کرتیں حبیبہ ایک دلگرفتہ بیوی کی طرح اور سارا بیوی کے غمخوار کی طرح۔ مگر آج سارا کے جانے کے بعد جب حبیبہ بستر پر لیٹی تو ایک ایک کر کے سارے پردے اُسکی آنکھ سے اٹھتے چلے گئے اعتماد کی پوری عمارت اڑا اڑا دھم کرتی ہوئی زمین پر آگری تھی اور وہ ہر اینٹ کے نیچے سے ایک آسیب چن کر نکال رہی تھی۔ حبیبہ کو پہلی مرتبہ اس پاکستانی لڑکے کو بُرا بھلا کہنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ مرنے والوں کو تو یوں بھی بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔

اُس نے کروٹ بدلی رات کے دو بجے تھے۔ صبح تک انتظار مشکل تھا۔ اُس نے سارا کا دروازہ کھٹکھٹایا جونہی سارا نے دروازہ کھولا ایک چیخ مار کر حبیبہ اُس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں کے درمیان بولی۔

We shared pleasure togather now we are partners in grief.

آج دونوں گھر صحیح معنوں میں سیاہ میز تونس ہو گئے تھے۔

نیر جہاں۔ سکونت۔ لاس اینجلس (امریکہ)

۶۷

بدلتے موسم کی تھاپ

کہانی

آثم میرزا

اس کے اندر کوئی چیخ پڑا

"اب کیسے بچ سکو گے؟ کہاں بھاگ سکو گے؟۔"

اس نے دانت کچکچا کر بازو فضا میں لہرایا۔ پھر یوں مٹھی بند کرلی...... جیسے ہوا کو گرفت میں لے لیا ہو۔

"نہیں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ لوگ...... سارے لوگ میرے لئے پناہ گاہ بن جائیں گے...... جو میری وجہ سے ماحول کو اپنا اسیر بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی میری حمایت میں مخالفین کو اپنا تابع بنانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہاں......"

موبائل کان سے لگا کر اس نے کسی سے پوچھا۔

"کوئی نئی خبر؟۔ میرا مطلب ہے...... قومی اسمبلی کے ممبر کی پوزیشن کیا ہے؟"

"جی اب جی۔!!۔ سچ۔!۔ تو کیا مخبری ہوئی ہے!۔ میرا نام بھی لیا جارہا ہے!۔ تو کیا مجھے واپس کوٹھی پر نہیں آنا چاہیے!۔ بہت بہتر۔ لیکن۔ تم مجھے حالات کی خبر دیتے رہنا...... منہ مانگا انعام دوں گا۔ ہاں۔" موبائل فون دائیں جیب میں رکھ کر اس نے بائیں جیب میں پڑے ہوئے پستول کو ٹٹولا...... اور ہوٹل سے باہر آکر جنرل اسٹور کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا......

"اب کیا ہوگا۔؟۔ لیکن یہ ہو کیسے گیا ہے! حکومت کا تختہ کیسے الٹ دیا گیا ہے! کیسے یکدم جگمگاتے ایوان میں گھپ اندھیرا ہو گیا ہے۔؟ عجیب بات ہے!"

قریب ہی ایک چمکیلی کار کو رکتے دیکھ کر اس نے نظروں کا زاویہ بدلا...... اور خواجہ فیضان کو باہر نکلتے دیکھ کر وہ اس کے تعاقب میں پھر ہوٹل میں داخل ہو گیا...... دیوار کے قریب میز پر جب خواجہ فیضان بیٹھنے لگا۔ تو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی۔

"یہاں پر نہیں۔ یہ سامنے والے کیبن میں۔ ہمارا بیٹھنا بہتر رہے گا۔"

خواجہ فیضان نے گردن گھمائی۔ اور اس کا ہاتھ دبالیا۔

"تم! قطب الدین۔ تم یہاں......؟"

"کیوں...... کیا مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا!۔"

"یہ بات نہیں ہے...... مجھے تو رانا توفیق نے اطلاع دی ہے...... کہ تم حراست میں لے لئے گئے ہو۔"
"بکواس ہے۔"
دونوں کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔
"بڑی عیش کی ہے...... اب...... خیر۔ کبھی ہمارا راج تھا...... پھر یہ بدل گیا...... اور راج گدی تم نے سنبھال لی...... بلکہ قبضہ کر لیا...... اب الٹ ہوا ہے۔ کیا کبھی ایسا سوچا بھی تھا۔؟"
قطب الدین نے نفی میں سر ہلا کر کہا
"تم حزب اختلاف کے ممبر تھے۔ مگر میں نے دوستی نبھائی تھی...... تمہارے مخالف کی مل میں آگ لگوادی تھی۔ منشیات کے معاملہ میں تمہاری ضمانت دی تھی...... پھر خلاصی کرادی تھی...... اب تم۔ میری کیامدد کر سکتے ہو؟"
"فی الحال تو مجھے حالات کا جائزہ لینا ہے...... ہوٹل کا مالک میرا ہم پیالہ ہے۔ یہاں پر تمہیں ٹھہرا سکتا ہوں۔ چند دن بعد حالات موافق ہو جائیں گے......"
"مجھے تو واقعی ایک محفوظ جگہ کی ضرورت ہے...... اپنی کوٹھی پر جا نہیں سکتا۔ دوسری کوٹھی پر جاؤں۔ تو شاید مخبری ہو جائے۔ فی الحال یہی مناسب ہے۔ کمرہ الگ تھلگ ہونا چاہیے۔"
"آؤ۔ میرے ساتھ۔ میں شہباز کو سمجھادوں گا۔"......
وہ اٹھ کر منیجر کے کمرہ میں آگئے...... خواجہ فیضان نے صوفہ پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔
"اسد صاحب۔ یہ میرے قریبی عزیز ہیں۔ چند دن یہاں آرام کریں گے۔ شہباز کو فون پر میں سمجھادوں گا۔ اگر کوئی ان کا پتہ معلوم کرنا چاہے۔ تو آپ کسی کے کان میں بھنک نہ پڑنے دیں۔ بات خفیہ رہنی چاہیے"
قطب الدین کو تسلی ہو گئی تھی...... کمرہ بالکل الگ تھلگ تھا...... یہ مسافروں کے لئے نہیں تھا...... بلکہ خاص مہمانوں کے لئے وقف تھا۔ جو ملازم اس کی خدمت پر معمور ہوا۔ قطب الدین نے اسے ایک ہزار کا نوٹ پکڑاتے ہوئے تاکید کی تھی۔
"دیکھو۔ رستم علی۔ یہاں پر میری موجودگی کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ اگر کوئی پوچھے بھی۔ تو صاف انکار کر دینا۔ شاباش...... اور بھی انعام ملے گا...... اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو...... تو فوراً مجھے اطلاع کر دینا۔"
...... وہ گھر پر فون نہ کرنا چاہتا تھا...... اسے روپوش ہوئے دوسرا دن تھا...... اور یہ تو معلوم ہو گیا تھا...... کہ۔ قومی اسمبلی کا ممبر۔ کسی نامعلوم جگہ پہ پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کا چہیتا تھانیدار بھی اس سے پہلے پکڑا جا چکا ہے۔ اور صرف ایک رات کی مار نہ برداشت کرتے ہوئے اس نے سارے راز اگل دیئے ہیں......

مگر اسے یقین تھا۔ کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکے گا۔ اس نے جو کام بھی کئے ہیں۔ وہ صرف قومی اسمبلی کے ممبر کی شہ پہ کئے ہیں۔ زبانی طور پر ہی حکم چلاتا رہا ہے۔ اور زبانی طور پر ہی پولیس مقابلہ میں مخالفین کے جنازے نکالتا رہا ہے...... "لیکن اب!" اور اس نے کپکپاہٹ سی محسوس کرتے ہوئے خود کو پلنگ پر گرا دیا۔

"لیکن۔ سبھی کو معلوم ہے۔ کہ میں ممبر صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔ یعنی۔ ہر کام میری وجہ سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچتا تھا...... اور منشیات فروشوں کے گرو میرے تابع تھے۔ جوئے خانہ کی مالکہ باقاعدگی سے نال مجھے پہنچاتی تھی۔ اور اب...... وہ لوگ...... ! کیا میرے خلاف گواہ نہیں بن سکتے؟...... ضرور مخالفانہ قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

وہ رات اس نے یوں گزاری تھی۔ جیسے ماتم والے گھر میں وہ ولایت سے آنے والے میت کا انتظار کر رہا ہو...... اگلے دن اس نے اپنی دوسری کوٹھی کے حالات معلوم کرنے کی خاطر نمبر ملایا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ مل سکا تھا۔

"تو کیا۔ وہاں بھی چھاپہ پڑا ہے!...... لیکن اس کوٹھی کا علم میرے اور گل نسرین کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ نہ ہی آج تک میری دوسری بیگم کا کسی کو پتہ چل سکا ہے۔ نہ ہی کسی نے چھان بین کی ہے۔ نہ ہی کوٹھی کے مالک نے سراغ لگانے کی کوشش کی ہے...... پھر...... پھر۔!"

شام تک اس نے کئی بار نمبر ملایا تھا...... اور ہر بار ناکامی ہوئی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے...... تو رستم علی چپکے سے کمرہ میں داخل ہوا...... پھر دروازہ اندر سے بند کر کے وہ قطب الدین کے پلنگ کے قریب بیٹھ گیا۔

"سر۔ جی۔ آپ ابھی کوئی اور ٹھکانہ تلاش کریں۔"

"کیا بات ہے کسی کو پتہ چل گیا ہے۔؟"

"جی۔ ہاں شہباز صاحب۔ ابھی اپنے ایک دوست کو فون کر رہے تھے۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد چھاپہ پڑنے والا ہے۔"

"سچ!۔ تو کیا باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہے؟"

"باورچی خانہ کا ایک دروازہ پچھواڑے کی طرف کھلتا ہے۔ آپ بستر کی چادر سے خود کو ڈھانپ لیں۔ لیں۔ میرے پیچھے قدم اٹھاتے جائیں۔"...... اس نے ایک ہزار کا نوٹ انعام کے طور پر اسے دے دیا تھا...... دھندلے راستہ نے اگرچہ رہنمائی کی تھی۔ مگر اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی...... کھلی جگہ پر

اسے رکشہ مل گیا تھا...... چادر اس نے ابھی تک اوڑھ رکھی تھی...... نئی آبادی میں اپنے دوست دلشاد کے مکان کی گھنٹی جا کر اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے...... کھڑکی کھول کر کسی نے پوچھا......

"کون ؟۔"

"میں۔ میں ہوں قطب الدین۔ دلشاد صاحب سے ملنا ہے......"

چند منٹ بعد دروازہ ذرا سا کھلا۔ اور قطب الدین زاویہ بدل کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا تھا "تم۔ یہاں ؟۔ میرا مطلب ہے۔ کیا رہائی مل گئی ہے۔ ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے چادر اتار کے صوفہ پر رکھ دی۔

"فی الحال مجھے پناہ کی ضرورت ہے۔ چند دن کے بعد میں یورپ چلا جاؤں گا۔"

"لیکن۔ تم جانتے ہو...... پناہ دینے والا بھی...... اتنا ہی مجرم ہے...... جتنا !......"

قطب الدین بات کاٹ کر بول پڑا......

"تم پر کوئی زد نہیں پڑے گی...... کسی کو علم نہ ہو سکے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... شاید۔ کوئی خفیہ کا آدمی۔ تمہارے تعاقب میں ہو۔"

"ابھی تک ایسا معاملہ پیش نہیں آیا ہے...... اور پھر...... میں تمہارا محسن ہوں......"

"جی...... یہ تو درست ہے...... مگر...... اس طرح میں بھی دھر لیا جاؤں گا۔"

"اور اگر۔ یہ معلوم ہو گیا۔ کہ جعلی رجسٹریاں بنا کر۔ میں نے بنک سے تمہیں اسی لاکھ کا قرضہ دلایا ہے۔ تو پھر......"

"لیکن۔ پچاس ہزار تو بنک والوں نے لے لئے تھے...... دس لاکھ تمہارا تھا...... اور باقی۔ !" "یہ کوئی نہیں پوچھے گا...... قرضہ تو تمہارے نام ہی جاری ہوا ہے نا۔"

"باہر والے دروازہ پہ دستک ہوئی...... اور دلشاد یکدم اٹھ کھڑا ہوا!

"دیکھو...... میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا ہے...... کوئی تعاقب کرتا ہوا۔ یہاں تک پہنچ گیا ہے...... خدا کے لئے...... میرا مطلب ہے۔ میں عقبی دروازہ سے تمہیں باہر نکال دیتا ہوں۔ کل صبح میں کوئی حل نکال لوں گا...... اسلئے اگلی رات کو اہم فیصلہ ہو گا۔" باہر آ کر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اسے دوسری کوٹھی میں رہ کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے...... اس کی نئی بیگم۔ گل نسرین۔ شاید کوئی بہتر مشورہ دے سکے...... کوئی حل نکل آئے۔"

اپنی دوسری رہائش گاہ سے اس طرف ہی وہ ٹیکسی سے اتر پڑا تھا...... پھر کرایہ ادا کر کے وہ دل کی تیز دھڑکن کے ساتھ آگے قدم اٹھانے لگا تھا...... بڑا گیٹ اندر سے بند تھا...... دائیں طرف دیوار کو ڈھانپنے والی

بیل کے ذریعہ وہ اوپر آکر دوسری طرف کود گیا..... دبے دبے قدم اٹھاتا..... وہ کاریڈور میں آکر ابھی کال بیل پر انگلی رکھنے ہی والا تھا۔ کہ کسی نے اس اس کی کنپٹی پر گن کی نال رکھ دی......

"کون ہو؟......"

یکدم نے سر کو گھمایا..... اس کے سامنے باڈی گارڈ طالب کھڑا تھا۔ اس نے چادر اتار دی۔

"سر۔جی۔آپ!۔آپ!۔"

"ہاں۔میں ہوں قطب الدین۔"

"لیکن۔اس وقت۔!۔یعنی ہمیں تو معلوم ہوا تھا۔ کہ آپ دوسرے ملک جا چکے ہیں"

"ابھی گیا نہیں۔لیکن چلا جاؤں گا۔ابھی کوئی پروگرام بنانا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہو۔طالب اس سے پہلے داخل ہو کر دوڑتا ہوا۔اس کے بیڈ روم کے دروازہ پر آگیا..... پھر زور زور سے دستک دے کر چلانے لگا......

"سر۔جی۔آگئے ہیں..... دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو......"

قطب الدین حیران کن نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اس کا بڑا بیٹا مشکور الدین گاؤن کی ڈوری باندھتا ہوا۔اس کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ یکدم لرزا تھا۔پھر جیسے اس کے اندر انگارے پھیل گئے ہوں......

"تم۔!۔تم!۔مشکور۔تم؟۔"

پھر اسے دھکا دے کر قطب الدین پاگلوں کی مانند اندر داخل ہو گیا..... گل نسرین بیڈ کی چادر سے اپنے بے لباس جسم کو ڈھانپ رہی تھی..... وہ اسے دیکھ کر چیختی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔اور قطب الدین کا ہاتھ جیب کے اندر چلا گیا۔

"تم۔جانتے ہو..... یہ کون ہے؟۔یہاں کیوں آئے۔؟"

"اس نے خود مجھے بلایا تھا۔اسے تحفظ کی ضرورت تھی..... یہ مجھے پہلے سے جانتی ہے۔"

"لیکن مجھ سے اس کا جو رشتہ ہے۔وہ بھی اس نے بتا دیا ہے؟۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جانتے ہو..... یہ میری منکوحہ ہے..... تمہاری دوسری۔!"

"نہیں..... ہر داشتہ کو۔میں کیسے اپنی ماں بنا سکتا ہوں۔"

"لیکن جب اس نے بتا دیا تھا۔تو پھر......"

"میں نے اسے مذاق سمجھا تھا۔"

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہیں بے غیرت نہیں بننا چاہیے تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے...... میں۔ یا آپ......"

"تو کیا۔ تم مجھے بھی باپ نہیں سمجھتے ہو!۔ مجھے بھی۔!"

انتہائی طیش کے عالم میں اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"یہ سوال مت کریں۔ جواب۔ بڑا تلخ سننا پڑے گا۔"

"حرام زادے...... تم...... مجھے بھی......!"

یکدم اس نے پستول نکال لیا۔ اور مشکور کے سنبھلنے سے پہلے ہی فائر کر دیا۔ گولی اس کے حلق کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی......

چند لمحے یوں گذرے۔ جیسے ہر چیز ساکت ہو کر رہ گئی ہو...... پھر قطب الدین لرزتے بدن پہ قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے۔ گل نسرین کو کمروں میں تلاش کرتا رہا۔ جب خوف زدہ ہو کر وہ باہر نکلا۔ تو کسی نے پستول والا ہاتھ دبوچ لیا تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا تھا......اور اس کے عقب میں گل نسرین۔ ہیڈ کی چادر لپیٹے دوسری طرف رخ کیے کھڑی تھی

آثم میرزا۔ سکونت۔ سیالکوٹ (پاکستان)

بیسوا

محمد الیاس کہانی

درجہ چہارم کے سرکاری ملازمین کے لیے برطانوی دور کی بنی ہوئی فوجی بیرکوں میں دیواریں کھڑی کر کے رہائشی کوارٹرز بنائے گئے تھے۔ کمروں کے اندرون کو شہری صورت دینے کے لئے ہارڈبورڈ کی سیلنگ کی گئی تھی لیکن اس آرائشی چھت اور بیرکوں پر ڈالی گئی نالی دار آہنی چادروں کی ڈھلوان چھتوں کے درمیان خاصہ وسیع خلاء رہ گیا تھا جو دس کوارٹروں پر مشتمل طویل بیرک کے ایک سرے سے دوسرے تک تاریک میدان کی صورت قائم تھا۔ تاہم یہ خلاء حشرات الارض اور خصوصاً چوہوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہاں رہنے والے چوہے کوارٹروں میں بسنے والی بنی نوع انسان کی نسل سے زیادہ تندرست اور توانا تھے۔ رات کے وقت جلسے جلوس نکالتے، لاٹھی چارج یا پکڑ دھکڑ ہوتی تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ چوہوں کی کالونی میں امن وامان قائم ہونے کی صورت میں خاموشی چھائی ہوتی تو دائیں بائیں ملحقہ کوارٹروں کے مکینوں کی سانسیں بھی سنی جاسکتی تھیں۔

شمالی بیرک کے آخری کوارٹر کا نمبر ۲۱۰ تھا لیکن کالونی کے مکین اسے صرف نمبر دس کہنا مناسب خیال کرتے تھے۔ حالانکہ اس کا رہائشی فخر مرزا جیسا بھی تھا کالونی والوں کے لیے برا نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ مہینے میں ایک دوبار دکھائی دیا کرتا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ کوارٹر کے اصل الائی نے قاعدے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ سرکاری رہائش فخر مرزا کو sub-let کی ہوئی ہے۔ بیشتر چھڑے ملازمین نے اضافی آمدنی کے لیے یہی ایک آزمودہ ذریعہ اپنار کھا تھا اور غالباً یہ ان کے درجہ چہارم کا فیض تھا کہ متعلقہ حکام چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

۲۰۹ میں رہائش پذیر عثمان رحمانی اس قدر شریف تھا کہ اس کی بیوی محض اپنے میاں کی غیر معمولی شرافت سے نالاں تھی۔ سرکاری دفتر میں چپڑاسی کی ڈیوٹی دینے کے ساتھ ساتھ رحمانی پان سگریٹ بھی بیچتا۔ گھر آکر تھوڑا آرام کرنے کے بعد اپنی دوکان گلے میں لٹکائے بس اسٹاپ پر چلا جاتا، جہاں سے رات گئے لوٹتا۔ اب وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ دونوں میاں بیوی ادھیڑ عمر تھے اور طویل ازدواجی عمر کا حاصل واحد اولاد بیٹی تھی جو شادی کے کافی عرصہ بعد پیدا ہوئی۔

رحمانی کی بیوی ان پڑھ اور بہری تھی۔ کوئی بری خبر سنا دیتا تو خوشی کا اظہار کرنے بیٹھ جاتی اور قابلِ

تحسین بات پرکف افسوس ملنے لگتی۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں سے اپنا ایک ہی دکھڑا بیان کیا کرتی کہ کسی حرماں نصیب کا خاوند رحمانی جیسا شریف نہ ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ کر یہاں تک کہا کرتی کہ کاش اس کا میاں بدمعاش ہوتا تو تھوڑی بہت بدمعاشی بیوی کے حصے میں بھی آجاتی۔ پھر وہ آہ بھر کر اپنی بیٹی شہزادی کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔ "نہ جانے خدا نے کس سعد گھڑی میں یہ مہربانی فرمادی ورنہ میں تو گھر میں اکیلی گھٹ کر مر گئی ہوتی۔

شہزادی کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ شوہر زیادہ شریف نہیں ہونا چاہیے اور اگر بدمعاش ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ وہ نو جماعت پاس تھی۔ قریبی لائبریری کی کئی بار دہرائی کر چکی تھی اور اس نے لائبریری والے سے کبھی گلا نہیں کیا کہ وہ اسے کیسی کیسی کتابیں تھما دیتا ہے۔ ابا پان بیچ بیچ کر جہیز بنا رہا تھا۔ اس نے عزمِ صمیم کر رکھا تھا کہ اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو دھوم دھام سے بیاہے گا۔ لیکن بے بسی کا یہ عالم تھا کہ زینت مارکہ ٹائم پیس خریدنے کے لئے پانچ ماہ کی بچت کل پچاس روپے جمع ہو چکے تو گھڑی کی قیمت پچپن روپے ہو گئی۔ ہر چیز اسی طرح ترس ترس کر بنائی جا رہی تھی۔ صبح سے رات نو دس بجے تک باپ جان مارتا۔ تمام دن اسی تصور میں گزارتا کہ اچھے خوش شکل امیر لڑکے سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ نیند کے لیے جو چند گھنٹے بچ رہتے ان میں خواب بھی ایسے ہی دیکھتا۔ بوڑھا نحیف شخص بیٹی کی شادی اور جہیز کے معاملے میں جنونی ہو چکا تھا۔ ایک پان بیچنے کا لیے کس کس کا انتظار اور کیا کیا جتن کیا کرتا۔ اور پھر پان پر پان بیچتے چلے جانے کی روداد کچھ اس انداز میں بیان کیا کرتا ہے جیسے معرکہ پہ معرکہ سر کرتا چلا گیا ہو۔ احمق شخص یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ جس طرح کا جہیز وہ بیٹی کے لئے اکٹھا کر رہا ہے، یقیناً دھوم مچ چکی ہو گی اور وہ لمحہ آنے ہی کو ہے کہ رشتہ مانگنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔

جلد از جلد دلہن بننے سے زیادہ شہزادی کو بے چینی اس بات کی تھی کہ اپنے باپ کو کسی طرح زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے سکے۔ لیکن رشتہ پوچھنے کے لیے چپراسیوں کے سوائے کوئی آتا ہی نہیں تھا اور رحمانی کو ایسے رشتوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ شہزادی یہ سوچ کر تلخ ہو جاتی کہ جدھر نگاہ اٹھتی ہے مرد ہی مرد دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سب کے سب چپراسی تو نہیں ہوں گے لیکن کوئی کم بخت اس کے حصے میں کیوں نہیں آتا۔ اسے کچھ وہم سا ہو چلا تھا کہ اس کا رشتہ لینے کوئی نہیں آئے گا۔ باپ کی جنونی کیفیت دیکھتی تو اس کا جی چاہتا کہ سوتے میں اس کا گلا دبا کر اسے ایک ایسے عذاب سے نجات دلا دے جس کی سنگینی کا اس معصوم شخص کو احساس ہی نہیں۔ کبھی کبھی وہ اس طرح بھی سوچتی کہ راہ چلتے کسی مرد کو اغوا کر کے لے آئے اور خنجر کی نوک پر اسے اپنے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور کر دے۔

کتابیں پڑھنے کے علاوہ شہزادی پڑوس میں ہونے والی گفتگو سننے کا شوق بھی رکھتی تھی۔ ۲۰۸ نمبر میں تو یہ سلسلہ جاری رہتا لیکن نمبر دس والا فخر مرزا مہینے میں چند ایک ہی بار دکھائی دیتا۔ کوارٹر میں اس کی موجودگی کا صحیح علم بھی شہزادی کے سوا کسی دوسرے کو مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ خصوصاً مرزا فخر کے ہاں تب دلی دلی رونق ہو جاتی جب رات کو دیر سے لالہ ایک عورت کے ہمراہ آیا کرتا۔ ہر کوارٹر میں ایک ہی بڑا سا کمرہ تھا۔ نمبر دس اور ۲۰۹ کے کمروں میں بنے آتش دان مشترکہ دُود کش سے منسلک تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی آگ جلاتا تو دھواں دوسرے گھر میں بھر جاتا۔ چمنی گویا اوپر سے بند ہو چکی تھی اس لیے آتش دان کا واحد مصرف اب یہی رہ گیا تھا کہ اس سے لگ کر بیٹھا جائے اور پڑوس میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سُن لیا جائے۔ ویسے بھی سیلنگ کے اوپر تو سبھی کوارٹر باہم ایک ہی تھے اس لیے ذرا ایکسو ہونے پر بھی یہ شوق پورا کیا جا سکتا تھا۔

ہر کوارٹر کے کمروں کے اندرون ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہی صرف سماعت کے وسیلے سے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔ تاہم پڑوس کے آنگن کا بھرپور نظارہ بھی بہت ممکن تھا۔ بیرکوں کے فرش سطح زمین سے تقریباً تین چار فٹ اونچے تھے جب کہ ہر کوارٹر کو ایک کچن، غسل خانہ اور بیت الخلا کی سہولت مہیا کی گئی تھی، جسے چار دیواری سے محصور کر کے آنگن کی ضرورت بھی پوری کر دی گئی تھی۔ لیکن صحن میں اترنے کے لیے فوجی سائز کی چار سیڑھیاں اترنا پڑتی تھیں۔ ہر پڑوسی کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا کہ وہ اپنے گھر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے منہ دھیان رہے یا گاہے گاہے پڑوس کے آنگن میں نگاہ ڈال کر حالات حاضرہ کا جائزہ لیتا رہے۔ گویا یہاں کے مکینوں کے دکھ سکھ اور دلچسپیاں ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔

شہزادی کو یہ سہولت میسر تھی کہ اپنے صحن میں کھلنے والا کمرے کا دروازہ نیم وا کر کے دس نمبر کے آنگن کا حال کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی۔ چونکہ اس کے بیت الخلاء، کچن اور باتھ تینوں کے دروازے ۲۰۹ کی طرف کھلتے تھے۔ کمرے کی بتی بجھا کر کواڑوں کی درز میں سے شہزادی آڈیو ویڈیو ذرائع سے لمحے لمحے کی روداد معلوم کر سکتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ وہ تساہل کا شکار نہ ہو۔

لالہ نے فخر مرزا کو بھائی بنا رکھا تھا اور ہر ملاقات پر وہ اپنے اس عزم کا اظہار برملا کیا کرتا۔ ''بس تو تم کو ایک بار بھائی بول دیا ہے۔ اب تم فکر مت کرو۔ تمہارا نُسکان (نقصان) ہمارا نُسکان...... گونگی ذرا سادہ ہے۔ ضرورت کا گل بات کرتی ہے۔ تم نے اس سے گانا تو نہیں سنا ناں.... '' فخر مرزا نے کئی بار اعتراض دہرایا کہ گونگی اسے بھائی بول دیتی ہے لیکن لالہ نے ہر بار اسے حوصلہ دیا اور وضاحت کی کہ وہ عزت کرتی ہے اس لیے بھائی بولتی ہے۔ بُرا مت مانو۔ ہم چاہتا ہے کہ تمہارا زیادہ نُسکان نہ ہو اور ہمارا بھی نُسکان نہ ہو، آخر تم کو ہم نے بھائی بولا ہے۔ تمہارا فیکٹری ابھی چری کے مواقف ہے۔ اپنا سفید پوشی چاؤ اور گونگی کے بھائی بولنے پر دل

چھوٹا مت کرو"..... لالہ اسے تسلی دلاسہ دے کر فوراً رخصت ہو جاتا اور پھر اگلے روز ہی دکھائی دیتا۔ وہ تب بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتا۔ فخر مرزا اسے چائے پانی کے لیے رکنے کو کہتا تو وہ بولتا۔ "بس تم نے مہمان کو خوب کھلا پلا دیا یہ بہت بڑا نیکی ہے۔ مزدوری کا وقت ہے، چائے کے لیے رُکے گا تو بہت نقصان ہو جائے گا۔

فخر مرزا سگریٹ بھی کچھ اس طرح کے پیا کرتا کہ بُو پھیل جاتی۔ گونگی کو بھی ایسے ہی سگریٹ مرغوب تھے۔ پہلا مطالبہ یہی کرتی۔ "بھائی ڈبل سگریٹ۔" کم سے کم الفاظ بولتی لیکن بے طرح اور بلا سبب ہنستی چلی جاتی۔ اس کے دانتوں کی درزیں سیاہ کالی تھیں جب کہ بتیسی خاصی سفید اور چمکدار۔ گویا تارکول سے لپے ہوئے دانتوں کو پٹرول کی پھریری سے صاف کیا گیا ہو لیکن درزیں صفائی سے محروم رہ گئی ہوں۔ یقیناً وہ کالا بیڑہ بھی استعمال کرتی ہوگی۔ بھاری بھر کم، رنگت گوری لیکن نین نقش مبہم مبہم، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ناک نقشہ کیا اور کیسا ہے۔ اگر وہ بد صورت نہیں تھی تو خوبصورت قطعاً نہیں تھی۔ جتنی کم فہم تھی، جسمانی طور پر اتنی ہی مضبوط تھی۔ کمرے سے صحن میں اترتے چڑھتے ایسے دھم دھم پاؤں مارتی جیسے فرش پر بھاری مگدر سے ضرب لگائی جا رہی ہو۔ ہر بات پر ہنستی، خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بلکہ جس بات کا جواب نہ دے سکتی، اس پر خوب ہنستی۔ ڈبل سگریٹ کو لمحوں میں پھونک ڈالتی۔ راشن بھی اسی طرح کھا جاتی۔ فخر مرزا بہت سی تلی ہوئی مچھلی، روٹیاں، تکے کباب اور بوتل لے کر آیا کرتا لیکن اس خاتون نے کبھی کسی نعمت سے منہ نہیں موڑا۔

مرزا فخر کو صرف یہی ایک چرکا نہیں کھانا پڑتا تھا کہ وہ اسے بے دریغ بھائی کہہ دیا کرتی۔ بلکہ اور بھی کچھ الجھنیں تھیں۔ وہ اسے ہر مرتبہ شانوں سے تھام کر صحن کے آخری کونے میں بنی لیٹرین تک لے آتا اور دروازہ کھول کر ملاحظہ کرواتے ہوئے اس کا اصل مصرف ذہن نشین کرایا کرتا۔ لیکن وہ ناگواری سے ناک منہ پر ہاتھ رکھ کر یک دم پیچھے ہٹ جاتی اور خوب ہنستی۔ فخر مرزا سو رہا ہوتا یا کوئی سودا سلف لانے باہر سے تالا لگا کر ذرا دیر کو چلا جاتا تو اس اثناء میں غسل خانے میں گھس جاتی اور پوری تسلی سے سرخرو ہو کر باہر نکلتی سیفٹی ریزر جہاں کہیں بھی چھپایا ہوتا، اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہتا۔ واپسی پر فخر مرزا کو ٹونٹی سے پائپ لگا کر بڑے زوردار پریشر کے ساتھ غسل خانہ دھونا پڑتا۔ اس کے علاوہ سیفٹی ریزر سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔ وہ احتجاج کرتا مگر جواب میں بھرپور ہنسی کا تحفہ ملتا۔

فخر مرزا کی غیر موجودگی میں کمرے سے صحن میں اترتے چڑھتے شہزادی کو متوجہ پا کر خوش ہوتی اور ہنس ہنس کر جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کیا کرتی۔ تاہم وہ شہزادی کے ادا کردہ الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے شاید قاصر تھی، اس لیے صرف ہنسنے پر زور دیا کرتی۔

شہزادی نے لالہ اور فخر مرزا کے مابین ہونے والی گفتگو کئی بار سنی تھی۔ خاص طور پر لالہ تو دھیمے لہجے میں بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہر مرحلے پر اپنے منہ بولے بھائی کو صبر شکر کے ساتھ اس عجیب و غریب ان چاہے رشتے سے سمجھوتہ کر لینے کی تلقین کی اور واضح کیا کہ رنجیدہ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کو نگی نے شومئی قسمت روز اول سے غسل خانہ دیکھ لیا ہے تو اب کوئی دوسرا دروازہ پار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح اس نے ایک دن مرزا کو بھائی کہہ دیا ہے تو اب زندگی بھر اس پر قائم رہے گی۔ شہزادی کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک کلو تلی ہوئی مچھلی تکے کباب اور بوتل میں سے مرزا کو مشکل ایک تہائی حصہ ملتا تھا۔ پندرہ سولہ گھنٹوں کے دورانیے میں بیس پچیس سگریٹ بھی پھونک ڈالتی جن میں سے چند ایک ڈبل ہوتے تھے۔ لالہ ایسے کسی بھی اعتراض کے جواب میں یاد دہانی کروانا ضروری سمجھتا کہ ابھی وہ چڑی جتنا فیکٹری کا مالک ہے۔ بھائی ہونے کے ناطے وہ نہیں چاہتا کہ دونوں بھائیوں کا نقصان ہو، اس لیے جیسی بھی بن پڑی ہے چپ چاپ جھیلتا ہے تاکہ سفید پوشی کا بھرم قائم رہے۔

شریف مرد کے برعکس بد معاش کا ایک عورت کے ساتھ نرم اور مصالحانہ رویہ شہزادی کی دانست میں قابل توجہ تھا۔ پھر وہ اپنی ماں کے دل پر لگے شرافت کے گہرے گھاؤ بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ چنگا بھلا مرد ذہنی طور پر انتہائی پس ماندہ عورت کی کس طرح ناز برداریاں کرتا ہے، جس میں رتی بھر کشش نہیں بلکہ بغور دیکھنے سے جی متلانے لگتا ہے۔ کسی بھی کراہت آمیز فعل پر نادم نہیں ہوتی جو باد شکم کی شورش بپا ہونے پر بھی ہنستی ہے۔ وہ کوئی سی بھی مخلوق ہو سکتی ہے لیکن صنف نازک میں اسے شمار کرنا حسن جمیل کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

بہرے شخص کو جنتی روح بھی کہا جاتا ہے، چونکہ وہ چغلی غیبت سن نہیں سکتا۔ شہزادی کی ماں کو فخر مرزا کے بارے میں لوگوں کی رائے کا علم ہی نہیں تھا اور رحمانی بذات خود مرنجاں مرنج شخصیت کا کامل نمونہ تھا۔ بقول اس کی بیوی کے آٹھ میں سے چھ سات پہر کام کرتا ہے، باقی وقت دیوار کی طرف منہ کر کے سویا پڑا رہتا ہے۔ میاں بیوی کو اتنا ہی معلوم تھا کہ پڑوس والا کوارٹر کسی امیر آدمی نے آرام کرنے کے لیے کرائے پر لے رکھا ہے، جس نے سڑک کے پار مغل آباد میں واقعہ ذاتی مکان میں ربڑ کی چپلیں سلیپر بنانے والی فیکٹری لگا رکھی ہے۔ رحمانی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک فیکٹری والا چپراسی کا داماد بنے گا۔ اس نے سوچا کہ سب خواہ اور حاسد ہوتے ہیں اس لیے کسی کو اعتماد میں لینا ہی نہیں چاہیے۔ وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ جس طرح کے خواب وہ دیکھتا رہا ہے، مجسم صورت میں ان کی تعبیر سامنے آگئی ہے۔

یہ سب کیسے ہوا، شہزادی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ تاہم اس کا کمال یہی تھا کہ ایک ایکٹ کے

ڈرامے کا ڈراپ سین اس وقت تک نہیں ہونے دیا جب تک نکاح ہونے کے بعد رخصتی نہیں ہو گئی۔ حالانکہ فخر مرزا نے بہتیری یقین دہانیاں کرائیں کہ نکاح بھی ہو جائے گا۔

مغل آباد میں سولہ مرلے کے پلاٹ پر بنی سادہ سی عمارت کی نچلی منزل فیکٹری کے طور پر استعمال ہو رہی تھی اور اوپر فخر مرزا کے والدین اور چھوٹے بہن بھائی رہائش پذیر تھے۔ شہزادی کے سسرال والوں نے کھلے دل سے بہو کو قبول کیا، اس خیال سے کہ شاید اُن کا بیٹا اب گھر میں ہی آرام کرنے کا عادی ہو جائے۔ کوارٹر اس نے صرف آرام کرنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا جس کی اب چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ مغل ہاؤس میں اس خوش گوار تبدیلی کو سب نے محسوس کیا۔

ہنی مون کا اثر گویا ساتویں مہینے تک یکسر کافور ہو چکا تو شہزادی سمجھ گئی کہ اس کے میاں نے آرام کرنے کے لیے پھر کہیں ٹھکانہ تلاش کر لیا ہے۔ اس نے زندگی گذارنے کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس کے پھول اور کانٹے خود ہی چننے تھے۔ باپ اپنی زندگی کے خوبصورت ترین خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے پر ہنوز نشے میں چُور تھا۔ وہ نچلی منزل کے احاطے میں پڑی بوسیدہ بدبو دار چپلیں اور ردی کی بے شمار گندی اشیاء ڈھیروں پڑی ہوئی دیکھتی، جو کوڑے کرکٹ میں سے نکال کر یہاں تک پہنچائی جاتی تھیں، تو سوچتی کہ ان ناکارہ چیزوں کی قسمت بھی بدل جاتی ہے، جب انہیں پگھلا گلا کر نیا روپ دے دیا جاتا ہے لیکن شادی شدہ عورت متروک ہو جائے تو کوڑے کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے وقعت ہو جاتی ہے۔

فخر مرزا سمجھتا تھا کہ شہزادی کچھ نہیں جانتی۔ ماضی قریب میں اُسے اپنے باپ کے کوارٹر کی دیوار کے پارے ۲۱۰ میں کیے گئے آرام کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ محض ایک نادار اور نزار چپراسی کی بیٹی ہے، جس نے کچھ خواب دیکھے ہوں گے، جس کی تعبیر اسے مل چکی ہے۔ وہ تو یہ بھی باور کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ گھر سے ایک دو روز کی عدم موجودگی کو بزنس ٹور قرار دیتا ہے تو اس کی بیوی تجارتی دورے کی نوعیت کو سمجھ رہی ہوتی ہے۔

ایسے ہی ایک تجارتی دورے سے فخر مرزا لوٹ کر گھر آیا تو شہزادی نے اُسے دھر لیا۔ فخر مرزا سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں باپ یا بہنوں کے کانوں میں کوئی ایسی آواز پڑے۔ اس نے بیوی کی توجہ اس طرف دلائی کہ رہنے کو پر آسائش گھر ہے، پہننے کو ہر قسم کا لباس اور کھانے کو سب کچھ پھر واویلا کیسا۔ شہزادی نے آگے بڑھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے گذری ہوئی عمر کسی چھت تلے ہی گذاری ہے۔ پہننے کو مناسب لباس بھی میسر رہا ہے۔ رہی کھانے کی بات تو میرے چپراسی باپ کے گھر میں زندگی بھر ایک فاقہ بھی نہیں ہوا۔ تم اپنی بات کرو، تمہیں

اب کس چیز کی کمی ہے۔ بھائی تو میں بول نہیں سکتی۔ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور فاحشہ عورتوں کا بول و براز دھوئے بغیر تجھے چین نہیں ملتا تو اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے چولہے چوکے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ بازار سے پکا پکایا لے آیا کرو۔ نان و نفقہ جائے بھاڑ میں۔ نقد و نقد حساب کر دیا کرو۔" فخر مرزا کا رنگ فق ہو گیا۔ ہکلا کر بولا

"کیا بک رہی ہو۔ یہ شریفوں کا گھر ہے۔ تمہیں اتنی زیادہ عزت راس نہیں آئی۔ آخر ہو نا چپراسی کی بیٹی اور وہ بھی رحمانی" ۔

شہزادی نے دبنے کے جائے مزید چمک کر کہا۔

"یہ مغلیہ عزت رکھو سنبھال کر کسی اور کے لیے۔ بیوی کو اتنی اہمیت تو دو جتنی ایک رنڈی کو دیتے ہو۔"

محمد الیاس۔ سکونت، میرپور (آزاد کشمیر)

سفاری پارک

محمد مظہر الزماں خان — کہانی

اُن سبھوں کی لنگڑاتی، پھسلتی اور دھوپ بھول زندگی میں دفعتاً ہوئے عجیب اور حیرت انگیز حالات پیدا ہو گئے تھے کہ سبھوں کہ مومی چہروں پر خوف اور ڈر کے لمبے لمبے بانجھ اور گہرے سائے اچانک پیدا ہو گئے تھے اور وہ سب کے سب جو مختلف لباس، مختلف رنگ مختلف نظریات اور اصولوں کے حامل تھے۔ تاہم ایک ہی خاندان کے افراد تھے لیکن اچانک ایسے حالات میں گھر کر رہ گئے تھے کہ اس ماحول سے بچ نکلنا اُن کے لیے فی الحال مشکل ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ ایک دوسرے سے گھلے ملے ایک دوسرے کے اندر اندر اُترے ہوئے، سبھی مطمئن تھے اور اطمینان اُن کے چہروں پر چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا حالانکہ یہ اطمینان کئی بار ٹوٹا، بکھرا اور زخمی بھی ہوا تھا۔ لیکن جوں ہی حالات بدل جاتے تھے وہ دُور ہو جاتا تھا اور وہ پھر مطمئن اور مسرور زندگی کے اُونچے نیچے راستوں پر بھی تیز اور کبھی سنبھل سنبھل کر چلنے لگتے تھے۔ تاہم شوریدہ راستوں اور نوکیلے پتھروں کی ٹھوکروں سے ان کے ہاتھ لہولہان بھی ہو جاتے تھے لیکن جلدی ہی وہ سنبھل بھی جاتے تھے اور چہروں پر آیا ہوا کرب ختم ہو جاتا تھا کہ یہ اُن کے خون میں شامل ازلی اُجالا تھا لیکن اس بار خوف کے گہرے گہرے بانجھ بادل اُن سبھوں کے چہروں پر آکر کچھ اس طرح سے جم گئے تھے کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے اور وہ سب کے سب ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر اندر اور باہر سے لرز لرز رہے تھے کہ اُن کا شیشوں سے بنا ہوا گھر اچانک درندوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا اور وہ اس چلتے پھرتے شیشے کے گھر میں بیٹھے غراتے ہوئے درندوں کو حیرت اور خوف سے دیکھ دیکھ کر سہم، سہم رہے تھے اور وہ درندے اُن کے اچانک رُکے ہوئے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے، مسلسل اپنے پنجے مار مار کر دھاڑ رہے تھے اور وہ سہمے، سمٹے ہوئے بوڑھے مرد، بوڑھی عورتیں، جوان مرد، جوان عورتیں بالغ لڑکیاں اور معصوم بچے سب کے سب اُن خوفناک درندوں کے کھلے ہوئے جبڑوں اور خونخوار پنجوں کو دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے سے جونک کی طرح چمٹ چمٹ کر رونے لگے تھے اور شیشوں کے گھر کو چلانے والا نوآموز اپنی سیٹ پر بیٹھا اُنھیں وقتی طور پر اطمینان دلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ "کچھ نہیں ہو گا۔ اس گھر کے شیشے بڑے مضبوط ہیں کہ ان درندوں کے پنجوں سے ٹوٹیں گے نہیں۔ اس لیے آپ خوف نہ کھائیے کہ خوف نسلوں اور قوموں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے کہ خوف بیج کو کونپل بننے نہیں دیتا کہ خوف چوں کو ٹھٹھرا

دیتا ہے کہ خوف زمینوں کو بیدار نہیں ہونے دیتا کہ خوف سے دلوں پر رات آکر ٹھہر جاتی ہے کہ خوف صریر خامہ کی روشنی پی جاتا ہے کہ خوف درختوں پر پھل پیدا ہونے نہیں دیتا کہ خوف ہتھیلیوں سے دستکیں نکال لیتا ہے کہ خوف پستانوں میں دودھ کو خشک کر دیتا ہے کہ خوف مرغانِ سحر سے ازان چھین لیتا ہے کہ خوف مردوں کو نامرد بنا دیتا ہے اس لیے خوف نہ کھاؤ کہ خوف مجاہدین کی دلیزوں پر اپنا ماتھا رگڑتا ہے، چنانچہ خوف صرف ہزار آنکھوں والے ہی سے کھاؤ کہ اُس کے سوائے کسی اور سے خوف نہ کھاؤ کہ خوف زوال کی نشانی ہے اور جو خوف کھاتے ہیں وہ باقی نہیں رہتے۔ لہذا وقت کا انتظار کرو کہ ہم سب بہت جلد درندوں سے بھرے اس جنگل سے آزاد ہو جائیں گے کہ یہ ایک وقتی خواب ہے۔ جسے ہماری سوئی ہوئی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

"ہم کب سے ان جانوروں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں؟ ہیک وقت سبھوں نے لرزتے ہوئے خشک لبوں سے کہا۔ لیکن تم یہی باتیں ہمیں مسلسل سُنا رہے ہو فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا اور ہم بہت جلد اس خوفناک جنگل سے نکل جائیں گے۔ لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور نہ کوئی ہمیں اس جنگل سے چھٹکارا دلانے والا آیا...... وہ دیکھو وہ بوڑھا شیر جس کے گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی مالا پڑی ہوئی ہے اور وہ بھوری آنکھوں والا چیتا۔ ہمیں دیکھ دیکھ کے کیسے غرّا رہے ہیں کہ ان کے ہر دانت میں ایک لہولہان رات پھنسی ہوئی ہے جو صبح ہونے نہیں دیتی اور...... ان کے ہر پنجے کا ہر ناخن تاریخ کے نرخرے میں دھنسا ہوا ہے...... وہ دن کہاں لد گیے جو گلاب اگایا کرتے تھے تو گھروں کے آنگنوں میں صبح مہکنے لگتی تھی۔ سورج کی وہ نرم نرم کرنیں کہاں غائب ہو گئیں جن کی کرنوں میں ہم زندگی کے موتی پرویا کرتے تھے...... مرغانِ سحر کہاں سو گیے جن کی کلغیوں پر شبنم کے قطرے یاقوت کی طرح دمکتے تھے۔ اب تو ہماری زندگی ببول کے خشک کانٹوں پر اٹکی ہوئی ململ کی بوسیدہ دھجی کی طرح لگ رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ خوف نہ کھاو۔ اگر کوئی شیشہ ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا؟...... تم محافظوں کو مطلع کیوں نہیں کرتے؟!

"کس طرح مطلع کروں اور کیسے کروں؟ بے زنجیر لبوں سے شیشہ کا گھر چلانے والے نے کہا۔ پتا نہیں وہ سب کے سب کہاں غائب ہو گیے ہیں کہ ہماری کوئی خبر ہی نہیں لیتا جبکہ ہمیں اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکلے خاصی دیر ہو چکی ہے اور بیسویں صدی کی آخری رات بج چکی ہے لیکن کوئی نجات دہندہ کہیں دکھائی ہی دیتا ہے اور نہ ہمیں آواز دیتا ہے۔ پتا نہیں میری آواز یا تمہاری آہیں اس تک یا ان تک پہنچ رہی ہیں کہ نہیں؟!

"مگر اب ہمارا کیا ہوگا۔ پھر سبھوں نے بلند آواز میں کہا۔ لگتا ہے کہ ہم سب کے سب ان درندوں کا لقمہ بن جائیں گے۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو گا"۔ شیشے کا گھر چلانے والے نے کہا۔ لیکن میں بھی تمہاری طرح مجبور ہوں اور چاروں طرف سے گھیرے ہوئے درندے ہماری مجبوری سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں ہیں۔

"پھر محافظوں کو بلاتے کیوں نہیں۔ آخر ہم کب تک ان کے درمیان گھرے رہیں گے۔ ایک جوان عورت نے اپنے ہونٹوں کی منڈیر پر زبان پہ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے روتے ہوئے بچے کے منہ میں اپنے پستان کی ایک کلی رکھ دی تو وہ چُس چُس چُسر نے لگا۔ لیکن سبھوں نے لرزتے ہوئے کہا۔ بلاؤ ان محافظوں کو جنہوں نے ہمارے تحفظ کا ہمیں یقین دلایا تھا۔

"آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ میں چاروں سمتوں میں مسلسل آوزیں دے رہا ہوں لیکن کسی بھی سمت سے کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ لگتا ہے کہ سب کے سب سناتن اپنے اپنے بھٹوں میں بیٹھے چین کی بین بجا رہے ہیں...... اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں" ان معصوم بچوں کو دیکھو اور ان کے ساتھ ان ضعیف عورتوں اور مردوں کو دیکھو کہ یہ خوف سے کیسے کانپ رہے ہیں "میں مجبور ہوں۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ شیشے کا گھر چلانے والے نے آنکھیں موند کر کہا۔ میں خود بھی تو ان کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

"آخر وہ لوگ گئے کہاں؟ جنہوں نے ہماری حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ ورنہ ہم کیوں اس خوفناک جنگل میں بنائے شیشے کے مکان میں چلے آتے" پکارو اُنھیں۔

"آپ سب لوگ دیکھ رہے ہیں کہ میں مسلسل آوازیں دے رہا ہوں۔ وہ بولا۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ پتھروں کے گھروں میں بیٹھے پھر اپنے اپنے چہرے بدل رہے ہیں کہ وہ ہر لمحہ ایک نیا چہرہ اپنے پُرانے چہرے پر چڑھا لیتے ہیں۔

"وہ دیکھو! دفعتاً سبھوں نے پھر چیخ چیخ کر روتے ہوئے کہا۔ لگتا ہے کہ اُس طرف کی کھڑکی کا شیشہ ان کے مسلسل حملوں سے ٹوٹ رہا ہے۔

"ڈرو نہیں۔ ابھی ٹوٹے گا نہیں۔ شیشے کا گھر چلانے والے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ لگتا ہے کہ اپنی جگہ چھوڑ رہا ہے۔ جس طرح سب اپنی اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑ چکے ہیں۔

"تم ہمیں جھوٹا دلاسہ دے رہے ہو۔ سبھوں نے پھر ایک زبان ہو کر کہا۔ دیکھو کہ یہ معصوم بچے کیسے زار زار رو رہے ہیں ہم اُنھیں چپ کیسے کریں کہ اب ہماری چھاتیوں کا دودھ بھی خشک ہو گیا ہے

"تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ مایوسی سے بولا۔ میں بھی تمہاری ہی طرح مجبور اور بے بس ہوں اور ہمارا شیشہ کا یہ گھر بیچ جنگل میں آکر ٹھر گیا ہے۔ لہذا چپ چاپ وقت کا انتظار کرو کہ کوئی نہ کوئی آنکھ والا ضرور آئے گا

لیکن وہ مسلسل چیخ رہے تھے۔ اور اُن کے چہروں پر ابر بیہ تاب کے دل کے دل آکر جما ہو گئے تھے اور شریانوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا اور ہونٹ زلزلا رہے تھے اور جسم طوفانوں میں خشک گھاس کی طرح جھوم رہے تھے اور اندھیرا اُن خوفناک جانوروں کے پنجوں میں بیٹھا عز عز رہا تھا لیکن دُور بہت دُور سے مرغ کی بانگ بھی سنائی دے رہی تھی مگر وہ سب کے سب ایک دوسرے سے گلے لگے، سہمے سہمے ہوئے حرف وِنے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک بادلوں سے موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں تو زمین سے پھر نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں اور پچھلا منظر غائب ہو گیا تھا!!!

محمد مظہر الزماں خان۔ سکونت، حیدر آباد دکن (بھارت)

رُوبہ زوال

اختر آزاد

کہانی

نئی نسل پرانی نسل کو نگل رہی تھی......

صدیوں کا سفر، صدیوں کی اور سفر کر رہا تھا کہ جڑواں بچے کی پہلی آمد نے تاریخ آدم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا.... ایک بچے کی ایک آنکھ نہیں تھی تو دوسرے کا ایک پیر کمر سے ہی الگ۔

زمین و آسماں حیراں

ذرہ ذرہ پریشاں

دونوں بچوں پہ جس شخص کی پہلی نظر پڑی تھی وہ دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور پاس کا ہجوم بھی آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا تھا۔ لوگ بچے کی پرچھائیں سے اس لئے خوف زدہ تھے کہ اگر اس کی پرچھائیں اس عورت پر پڑ گئی جو خود کو قید کئے بیٹھی ہے تو وہ بھی ویسے ہی بچے جنے گی۔ اندھے ..... لنگڑے ......

اندھے......!

لنگڑے......!!

ان بچوں کی وجہ سے سارے گاؤں میں افرا تفری مچی ہوئی تھی۔ جتنے لوگ اتنی باتیں۔

"یہ بچے اپنے ہمراہ مصیبتوں کا سمندر لے کر اس دھرتی پر وارد ہوئے ہیں۔ اس گاؤں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے دونوں بچوں کو زندہ دفن کرنا ضروری ہے".... سفید بال والے شخص نے بھیڑ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر ایسا کرنے پر ان کے ماں باپ راضی نہیں ہوئے تو......؟"

"یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے۔ اس لئے ہم سب مل کر ان کے گھر والوں پر دباؤ ڈالیں گے"

"چلو بھائیو! چلو...... چلو......"

بھیڑ بچے کے گھر کو گھیرے ہوئے تھی۔ ماں باپ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ پہلے تو دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوئے۔ لیکن جب بار بار گاؤں کو مصیبتوں سے بچانے کی دہائی دی گئی تو باپ جیسے تیسے کر کے مان گیا۔ لیکن وہ ماں جو نو ماہ تک اپنی کوکھ کا درد برداشت کرتی رہی تھی۔ سسک پڑی، سسکتی رہی......

وقت کب، کیسے گذرا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اور جب پتہ چلا تو اس وقت تک گاؤں والوں کو دونوں بچوں سے

کچھ نہ کچھ انسیت ہو ہی گئی تھی۔

وقت کے پیچھے پیچھے دونوں دوڑتے رہے......

دوڑتے دوڑتے چار ہو گئے......

اندھے......

لنگڑے......

گونگے......

اور بہرے......

پھر چاروں دنیا کی چار سمت پھیل گئے......

پورب......

پچھم......

اتر......

اور دکھن......

اب صدیوں کا سفر صدیوں کی اور سفر کرتے کرتے کچھ تھم سا گیا تھا۔

نئی نسل......! کسی کی ایک آنکھ نہیں تھی تو کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور۔ کسی کے دونوں پاؤں سلامت تھے تو کوئی سن اور بول نہیں سکتا تھا، اور کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا...... ہاتھ نہ پاؤں، آنکھ نہ ناک، سر نہ دھڑ۔

اور جب ایسا ہوا، تب سفید پوش شخص کی باتیں لوگوں کے ذہن میں ہتھوڑے برسانے لگیں۔ اور تب لوگ مضطرب و پریشاں عیبوں کی پوٹلی لئے نجات کا ذریعہ ڈھونڈنے لگے۔ ان کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ڈاکٹر اور حکیم کا گھر تک بھول گئے تھے...... بالآخر بھول کے اس سلسلے کو ایک عقلمند نے ختم کیا۔

جب گاؤں والے اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے ڈاکٹر اور حکیم کے گھر پہنچے تو لوگوں کے سر سے آسمان سرک گیا تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کے چشمے کا ایک گلاس سیاہ تھا اور حکیم بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔

دروازے ایک کے بعد ایک کھٹکھٹائے جاتے رہے۔

اور سارے دروازے اسی طرح سے کھلتے اور بند ہوتے رہے...... مگر سب بے سود......!

نجات کا یہ مسئلہ جب آہستہ آہستہ کافی گھمبیر ہو گیا تو اس سے چھٹکارا پانے کے لئے گاؤں والے ایک دن ایک جگہ جمع ہوئے۔ جہاں سب کو کھل کر اپنی رائے دینے کی اجازت تھی۔

"آج لولے، لنگڑے، گونگے، بہرے، اندھے اور کانے بچے کثیر تعداد میں پیدا کیوں ہو رہے ہیں۔

ہزاروں سال قبل تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہم آج ہی نسبندی کروالیں۔ پھر نہ ہی ہماری پاک دھرتی پہ ایسے جنوں کے گندے پاؤں پڑیں گے اور نہ ہی کبھی ہماری آنے والی نسل کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گی.....

مکھیا کی ان باتوں پر گاؤں والے رد وکد پر اتر آئے۔

"نہیں یہ بھگوان کی دین ہے۔"

"ہمارے مذہب میں ایسے جنوں کا قتل جرم ہے۔"

"اس طرح ہماری نسل دم توڑ دے گی اور ہم بے منزل، بے نشان اور بے سمت ہو کر رہ جائیں گے"۔

ایک رات......

گاؤں کے ایک شخص نے خواب میں ایک ایسے دیو قامت شخص کو دیکھا جس کے ناخن سے لے کر بال، چمڑے اور کپڑے بھی سفید تھے۔ وہ اُسے جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا......

"یہ لولے، لنگڑے، گونگے، بہرے، اندھے اور کانے بچے جو تمہاری اپنی نسل ہے، جواں ہو کر جب تمہیں نگل رہے ہیں تب تم اُن سے نجات کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہو۔ اب تمہیں ان اپاہج جنوں سے کبھی نجات نہیں مل سکتی ہے۔"

"کیا نجات کے لئے سارے راستے بند ہو چکے ہیں؟" اس شخص کی آنکھوں میں آنسو اتر آیا۔

"کیا زندگی بھر ہمارے بچے ہمارے لئے عذاب بنے رہیں گے؟"

"ہاں اب تم سب چاہ کر بھی اپنے عذاب کے حصار کو توڑ کر اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

نہیں، نہیں...... ایسا مت کہیے۔ وہ شخص پاؤں پکڑ کر گڑگڑانے لگا تھا۔ "ہمیں ہر حال میں اس سے نجات چاہیے......"

اچھا تو پھر وعدہ کرو......

ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ہماری نسل میں ایسے بچے پیدا نہیں ہوں گے، اور اگر غلطی سے ہو بھی گئے تو ہم اُسے زندہ دفن کر دیں گے۔"

ادھر سورج نکلا اور اُدھر بات روشنی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی......لوگ بھوکے پیاسے دیو قامت شخص کی تلاش میں نکل پڑے۔ گلی، کوچے، میدان، پہاڑ اور پتھار جہاں تک ممکن ہو سکا ڈھونڈتے رہے۔ لیکن...... آخر کار ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تھک گئے تو مایوسی کی چادر اوڑھے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے

دن میں مزدوری کر کے شام کو جب تھکے ہارے گھر لوٹتے تو سارے لوگ کہیں نہ کہیں جمع ہو جاتے۔ اور اُس شب بھی سارے لوگ ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے تھے۔ اُس شب بھی وہی ساری باتیں دُھرائی

جا رہی تھیں۔ اور اس شب بھی لوگ وہی سن رہے تھے کہ یکا یک دیو قامت شخص جس کے ناخن سے لے کر بال اور چمڑے سے لے کر کپڑے تک سفید تھے، ہجوم کے بیچ نمودار ہوئے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں مشعل تھی۔ یہ دیکھتے ہی لوگوں کے اُوسان خطا ہو گئے تھے۔ لیکن وہ شخص جس نے اُسے خواب میں دیکھا تھا، اُسے اپنے پاس دیکھتے ہی اس کے پاؤں پر گر پڑے۔ گرتے رہے اور اپنے اپنے آنسوؤں سے اُن کے پاؤں کو دھونے لگے۔ دھوتے رہے اور گڑگڑاتے رہے......

"ہمیں نجات چاہئے...... ہمیں نجات دلائیے......"

دیو قامت شخص نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔ مشعل کی لو بھڑک اُٹھی۔ دیو قامت شخص نے مشعل کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ کر پوچھا۔

"تمہیں ان شعلوں کے درمیان کچھ نظر آرہا ہے۔؟"

سب نے عالم تذبذب میں اپنی اپنی آنکھیں شعلوں میں ڈال دیں۔ ساری آنکھیں کچھ پانے کی تمنا میں جھلستی رہیں...... کئی ایک آنکھیں جب لوگوں نے گنوا دیں تو گڑگڑانے کے علاوہ اُن کے پاس اب بچا کیا تھا

"اے عالم ورہبر !ان شعلوں میں ایک وسیع پہاڑ، کھائی...... کھائی کے سینے سے گزرتا ہوا خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کا ایک پُراسرار راستہ......اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک فقیر بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے'

"اگر تمہیں ان مصیبتوں سے سدا کے لئے نجات چاہئے تو تم سب کل اس پہاڑ پر سورج کے طلوع ہونے سے قبل پہنچ جاؤ...... تمہاری ساری مصیبتیں وہاں پہنچتے ہی ختم ہو جائیں گی۔" دیو قامت شخص اتنا کہہ کر کہیں روپوش ہو گیا۔

لوگوں کے چہرے خوشیوں کی لالی سے بھیگ گئے......

رات کے جنم لیتے ہی لوگ اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے ہوئے پہاڑ کی ترائی میں جمع ہونے لگے...... لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔

پہاڑ کے پاس کھائی کے قریب پہنچ کر لوگ رک گئے۔ کیوں کہ آگے بڑھنے کے لئے کوئی سبیل نہیں تھی۔ ایک سبیل تھی جو کھائی کے درمیان تھی۔ جس کے وجود سے لمبی لمبی خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹے سر نکالے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی خاردار خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے لوگ دوسری سبیل کی تلاش میں اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ وقت کا بہاؤ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

اِدھر سورج اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ اور اِدھر ایک آواز گونج رہی تھی۔ "جلدی آؤ"۔ جس کی لپیٹ میں سارا

شہر چلا آیا تھا۔ لوگوں کی خوفزدہ نظریں پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے فقیر پر صاف پڑ رہی تھیں...... لوگ اب دوسری سبیل کی تلاش کرتے کرتے اب تھک گئے تھے۔ لیکن تلاش کا سفر جاری تھا۔

لوگ اب بھی دوڑ رہے تھے۔ گر رہے تھے۔ پھر دوڑ رہے تھے۔ اس آس میں کہ کوئی دوسری سبیل نجات کا ذریعہ بن جائے اور ان کا وجود چھلنی ہونے سے بچ گئے۔

سورج اب اپنا بستر چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اس کی پلکیں نیند کے خمار سے اب بھی بوجھل تھیں۔ وہی آوازیں ایک بار پھر پہاڑوں کے سینے میں اتر گئیں۔ پہاڑ لرز کر رہ گیا۔

جلدی آؤ...... جلدی...... ! ورنہ وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور تم...... تم اسی طرح سسکتے اور تڑپتے رہ جاؤ گے۔"

فقیر کے ہاتھ اس سمت اٹھے ہوئے تھے جہاں ہلکی ہلکی سرخیاں تیر رہی تھیں۔

اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تھا اور ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ اور جلد سے جلد چوٹی پر پہنچنے کے چکر میں لوگوں نے اپنی اپنی مشعلیں کھائی میں پھینک دیں...... کھائی سُرخ سمندر میں بدل گئی۔

سورج کے خوف سے لوگ خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کی سبیل پر اپنے اپنے وجود کو گھسیٹتے رہے کہ کہیں "وہ" نکل گیا تو کیا ہوگا۔ ؟

کھائی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز رک رک کر مسلسل آ رہی تھی۔ فضاؤں میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی بسی ہوئی تھی...... آسمان دھواں دھواں تھا۔

کہانی ختم ہو گئی...... راوی نے کہا۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لئے جیسے ہی اٹھ کھڑے ہوئے راوی نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

"بھائیو! کہانی ختم تو ہو گئی۔ لیکن کہانی اب بھی جاری ہے......"

لوگ دائرے میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو راوی نے کہانی جاری رکھی......

"وقت کے پر لمبے ہوئے تو میں بھی جوان ہو گیا۔ اور جب صدیوں بعد اپنی بند آنکھیں کھولیں تو میری چیخ نکل گئی کہ میرے چاروں بچے...... اندھے، لنگڑے، گونگے اور بہرے ہیں۔" یہ کہتے کہتے راوی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس نے لوگوں کو غور سے دیکھا، لوگوں کے آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ راوی نے رکیک آواز میں سوال کیا۔

"کیا نئی نسل ایک بار پھر پرانی نسل کو نگل رہی ہے......؟

"......اور صدیوں کا سفر صدیوں کی طرف سفر کرتے کرتے تھک گیا ہے۔"

راوی کے اس سوال پر سب خاموش تھے۔

اختر آزاد۔ سکونت، جمشید پور (بھارت)

ایک بلّی کی موت

(مُشتاق احمد یُوسفی کے نام)

شاہد اختر | کہانی

دسمبر شروع ہوچکا تھا۔ برفیلی ہواؤں کی وجہ سے اس بار ٹھنڈ پچھلے کئی سالوں سے زیادہ تھی سونے پر سہاگہ یہ کہ بارش بھی آگئی۔ آج تین دن ہو گئے تھے پانی رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا تواتر سے ایسی جھڑی لگی تھی کہ ایک لمحے کو نہیں رُکی، لوگ گھروں میں بیٹھے بیٹھے اوب گئے۔ آگ جلانے کے لئے سُوکھی لکڑی تک دستیاب نہیں تھی۔ باہر نکلنے کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی، سڑکوں پہ جگہ جگہ الاؤ کا انتظام کیا گیا تھا۔ باہر چھتوں کے نیچے خاصی تعداد میں ہاتھ تاپنے والے نظر آرہے تھے۔ گلی محلوں میں زیادہ تر سناٹا ہی تھا۔ کہرے کی وجہ سے آسمان پر صبح سے ہی شام کا منظر دکھائی دینے لگتا۔ بارش کی ٹپ......ٹپ...... کے علاوہ کسی گاڑی کے گذرنے کی آواز سے زندگی کی رمق کا احساس ہوتا ورنہ چاروں طرف موت کی سی خامشی نہاں تھی۔ ان تین دنوں میں شہر کا سارا انظام درہم برہم ہونے کے علاوہ ہر سمت ہُو کا عالم طاری تھا۔

پالے کے سبب اسکول کالج غیر معینہ مدت تک کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ بچے گھروں میں دُبکے بزرگوں سے سُن رہے تھے کہ ایسی سردی پینتیس برس پہلے پڑی تھی جب برتنوں میں رکھے پانی کی برف جمنے لگی تھی۔ نالیوں تک میں برف ہی دکھائی دیتی تھی۔ درجۂ حرارت اگر تھوڑا سا اور گرا تو اس بار بھی برف جم سکتی ہے۔

بابو رؤف کا خوف پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ویسے ہی اُلجھنیں کچھ کم تھیں اوپر سے کٹا کٹوا سردی نے مشکلات اور بڑھا دی تھیں۔ رہی سہی کسر بارش نے پُوری کر دی۔ گھر میں دو دن کٹنے محال ہو گئے کھڑکی دروازے بند ہونے کے باوجود لگتا کہ وہ ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ لحاف اوڑھ کر بستر میں گھسے رہتے تو وہاں یہ لگتا کہ زیادہ پانی رسنے کی وجہ سے چھت کسی بھی پل دھڑام سے ان کے اوپر گر سکتی ہے۔ کافی دنوں سے سوچ رہے تھے کہ ابکہ چھت کی مرمت کرانی ہے لیکن عین وقت پر وہی پیسوں کا مسئلہ سامنے آجاتا۔

آس پڑوس سے ٹین کی چادروں پر بڑی بڑی بُوندوں کی آواز ان کے خوف کو مزید بڑھا رہی تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود سونے میں ناکام رہتے، جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ چھت میں

سیلن کی وجہ سے چونے کی مدّ تیں اُدھڑ رہی تھیں۔ رُک رُک کر سفوف سا گرتا رہتا۔ غور سے دیکھنے پر چھت میں انسانوں کے علاوہ عجیب الخلقت شکلیں بنتی بگڑتی رہتی۔ شروع میں جو آدمی کی صورت نظر آتی، دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ لکڑ بگھا یا کسی اور جانور کا رُوپ دھار لیتا۔ باؤ کے لئے اب آنکھ بند کر کے رضائی میں گھسنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اتوار کے علاوہ دو روز کی چھٹی گھر پہ بتانے کے بعد آج وہ آفس گئے تھے۔ سخت سردی کے باعث بہت کم لوگ دفتر آئے تھے اور جو آئے بھی تھے تو پانچ بجنے سے پہلے ہی کھسک لیے۔ باؤ رؤف کو احساس ہوا کہ وہ اور چوکیدار ہی اکیلے بچے ہیں تو اُن کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اب تو کسی سے بات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ پانچ بجے سے قبل آفس چھوڑنا اُن کے اُصولوں کے خلاف تھا۔ اللہ اللہ کر کے کسی طرح پانچ بجے، یخ بستہ ہواؤں کا زور باہر نکلتے ہی اور بڑھ گیا۔ بس سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ کئی بار چونک کر پیچھے دیکھا۔ لوگ لبادوں میں ملفوف آس پاس سے گذر رہے تھے۔ اب راہگیروں سے انھیں خوف آنے لگا۔ حالاں کہ کسی سے اُن کی دشمنی نہیں تھی مگر بار بار ذہن میں ایک ہی بات آتی کہ کوئی ریوالور سے انھیں شوٹ ہی نہ کر دے یا بم پھینک کر کہیں پرخچے نہ اُڑا دے۔ اس خیال کے ساتھ ہتھیلیوں میں نمی کا احساس ہوا اسی کے ساتھ قدموں کی رفتار بڑھ گئی۔ گھر سامنے نظر آنے لگا تھا تبھی بجلی چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑے ہو گئے جیسے وہ بجلی سے ہی چلتے ہوں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ بہت آہستگی سے ایک بھدی سی گالی دی، ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ''بجلی بھی سالی چھنالوں کی طرح زیادہ تر گھروں سے غائب ہی رہتی ہے۔ اس کوشش کے ساتھ آگے بڑھے کہ پلک نہ جھپکے اور گھر پہنچ جائیں۔ پلک جھپکنے کی ساعت میں کہیں ٹکرا جانے کا ڈر لاشعور میں چھپا بیٹھا تھا۔ گو کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ سے نہیں تھی۔ پر ہر زاویے سے سوچنے کے بعد بھی شریانوں میں پگھلتے خوف وہراس کی کوئی وجہ اب تک نہ جان پائے تھے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ جب سے بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا ہوئے تب ہی سے موت کا خوف بڑھ گیا تھا ورنہ تین سال پہلے تک کہیں کچھ نہ تھا۔

دروازے کو دھکیل کر گھر میں داخل ہوئے تو نسرین ہانپتی ہوئی اُن کی طرف دوڑی آئیں۔ بستر سے کود کر منّو بھی۔ ویسے یہ بلّی ربعہ نے پالی تھی مگر باؤ رؤف سے بھی اُسے کم لگاؤ نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے نسرین کو بھی اس میں خاصی دلچسپی ہو گئی تھی۔ باؤ رؤف نے دیکھا کہ نسرین کی سانسوں کا توازن کچھ بگڑا ہے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے نسرین کے لبوں میں جنبش ہوئی "ربعہ اب تک کالج سے نہیں آئی ہے۔ اسکی تینوں سہیلیاں جو اس محلّے میں رہتی ہیں اُن کے گھر میں معلوم کر آئی ہوں۔ انہیں بھی کچھ خبر نہیں...... بڑے

بُرے بُرے خیال آ رہے ہیں۔" آگے کچھ اور بولنے سے پہلے وہ پھپھک پڑیں، گھبراؤ مت...... ربعہ کو کچھ نہیں ہوگا اور پھر وہ اب بچی تھوڑی ہے۔ کہیں کام سے ٹھہر گئی ہوگی۔ تم فکر مت کرو میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔" جیسے تیسے بیگم کو تسلی دے دی مگر اُن کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ منو بھی اُن کے پیروں کے پاس بے چینی سے ٹہل رہی تھی انھیں لگا جیسے یہ گربہ بھی وہی کہنا چاہ رہی ہو جو ابھی نسرین نے کہا ہے۔ وہ باہر آگئے۔ ربعہ بالکل دوسری طرح کی لڑکی تھی بلکہ وہ تو اسے اپنا بیٹا ہی کہتے اور مانتے تھے۔ کس کس طرح سے ماں باپ کو سمجھاتی اور حوصلہ دیتی تھی وہ، چار بجے تک ہر قیمت پر کالج سے واپس آجاتی تھی کبھی کسی کام سے کہیں جانا بھی ہوتا تو پہلے ہی بتا دیتی۔ کئی بار یہ صورت بھی آئی کہ وقت پر گھر نہ پہنچنے کے سبب پڑوس میں وکیل صاحب کے گھر فون پر اطلاع کر دیتی اس وقت تو ۷ بج رہا تھا، اب تک گھر نہ لوٹنا...... عجیب سے خیالات اتنی ذرا سی دیر میں دماغ میں کوند گئے تھے۔ بھوک پیاس بھی بھول گئے۔ قدم مَن مَن بھر کے ہو گئے۔ سوچا تفتیش وکیل صاحب کے گھر سے ہی شروع کی جائے۔ پھاٹک کھول کر داخل ہوئے، گیٹ کی آواز سُن کر وکیل صاحب کی بیوی کھڑکی پر آگئیں۔ باؤ رؤف کو دیکھا تو فوراً بول پڑیں...... کیا ہوا...... بھائی صاحب...... ربعہ کا کچھ پتہ چلا۔"؟

"نہیں میں تو آپ کے یہاں معلوم کرنے آیا تھا کہ کوئی فون...... وغیرہ......" "میرے یہاں فون آتا تو میں اسی وقت بتا دیتی۔ بھابھی کئی بار پوچھنے آچکی ہیں"۔ "اللہ جانے کہاں رہ گئی...... سرگوشی کے سے انداز میں کہا اور خود ہی سنا۔ مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ حمید میاں کے یہاں سے سائکل اُٹھائی اور اندھیرے میں بٹیا کی تلاش میں نکل پڑے۔

رات گیارہ بجے کے قریب گھر میں داخل ہوئے تو بُری طرح ہانپ رہے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ نسرین چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی منو بھی سر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی "کیا ہوا...... کچھ معلوم ہوا......"؟ نسرین کی بے ہنگم سی آواز نکلی۔ باؤ رؤف نے چھت کی طرف سر اُٹھا کر جانے کیا دیکھا اور دھیرے سے بولے...... "نہیں......" اتنا سُننا تھا کہ وہ زار و قطار رونے لگیں۔ باؤ نے گلے میں پڑا ہوا مفلر کرسی کے ہتھے پر ڈالا اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر بیوی کی آہ و بکا سُننے لگے۔ منو کی آواز کانوں میں پڑی تو لگا کہ وہ بھی گریہ کر رہی ہے۔ رونا تو وہ خود بھی چاہتے تھے پر کسی طرح صبر کا پتھر رکھے بیٹھے رہے۔ سرد ہوائیں کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھیں لگ رہا تھا جیسے شریانوں میں برف پگھل رہی ہو۔ اس کے برخلاف دماغ میں گرم تیز ہوائیں چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی ساری قوت جیسے ختم ہو گئی ہو۔ کالج میں چوکیدار نے بتایا تھا کہ بی بی تو تین ساڑھے تین بجے یہاں سے نکل گئی۔ اُلٹے پیر وہاں سے ربعہ کے دوستوں کے گھر گئے اور

ہر اُس لڑکی کے پاس بھی پوچھتے پاچھتے پہنچ گئے جس سے ربعہ کے رسمی سے بھی تعلقات تھے پر کسی سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ تھک ہار کر کنارے سائکل کھڑی کر کے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ آگے کیا کرنا چاہئے۔ پولیس کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے مگر اس کے علاوہ اب کوئی چارہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اُن کا دل کہہ رہا تھا کہ ضرور ربعہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ خیال کے ساتھ آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔ سڑک پر لیمپ پوسٹ تو تھے مگر لائٹ نہیں تھی جس کی وجہ سے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اِکا دُکا لوگ ٹھٹھرتے دانت بجاتے گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مظہر نے آنسو پونچھے اور مایوس ہو کر بھاری من کے ساتھ سائکل پر سوار ہو کر گھر واپس آگئے۔

نسرین اور منّو کا رونا بدستور جاری تھا۔ منّو ربعہ کی کرسی پر اب تک بیٹھی ہوئی تھی۔ عجیب لگاؤ تھا دونوں کو ایک دوسرے سے۔ بلیاں تو انہوں نے بہت دیکھیں تھی مگر منّو جیسی نہیں، ربعہ کے اشارے سمجھتی تھی۔ کرسی پر جب وہ دیر تک جاگ کر پڑھائی کرتی تو منّو پائے کے پاس بیٹھی جیسے اُسکی حفاظت کیا کرتی ربعہ کہتی بھی کہ جا سو جا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ربعہ کو پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑنی پڑتی۔ کھانے اور صفائی کا بھی ایسا خیال رکھتی کہ کیا کوئی اپنے بچے کا کر رکھے گا۔ جب کبھی بلے کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لئے غائب ہوتی، اس کے بعد دیر تک ربعہ کے سامنے آنے سے کتراتی، اِدھر اُدھر آنکھیں چراتی پھرتی اپنی حرکات و سکنات سے ربعہ پر حقیقت منکشف کر ہی دیتی۔ ربعہ اُسے بہت ڈانتی، وہ آنکھیں نیچی کیے خاموشی سے سُنتی رہتی ایک آدھ بار اس طرح نظر اُٹھا کر دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ میرا کوئی قصور نہیں وہ متواتر سے ایسی ایسی آوازیں نکال رہا تھا کہ مجھے ترس آگیا۔ بابو رؤف نے آنکھیں کھولیں تو خیالوں کا تسلسل ٹوٹا "نسرین خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں مگر ربعہ میری بھی تو بیٹی ہے اور پھر رونے سے کوئی مسئلہ حل ہوا ہے آج تک"۔ نسرین نے شال کا کونہ مُنہ میں اس طرح ٹھونسنے کی کوشش کی جیسے ہمیشہ کے لئے آواز بند کرنا چاہتی ہو۔ بابو نے ایک بار پھر اُوپر کی طرف دیکھا۔ ہونٹ ہلکے سے تھرتھرائے "یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہے تُو نے......" تبھی جانے کیا سوچ کر جھٹکے سے اُٹھے ٹنکی کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور مصلّیٰ بچھا کر خدا کے حضور کھڑے ہو گئے۔

ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ نسرین کی آواز کانوں میں پڑی، آپ پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کرتے؟ مصلّیٰ تہہ کر کے بکس پر رکھا پھر نسرین کی طرف مخاطب ہوئے۔ "رپوٹ تو شاید لکھانی ہی پڑے گی ...... میں سوچتا ہوں صبح تک انتظار کر لوں۔ پولیس کے پاس مدد کے لیے جانا بھی تو ہم جیسوں کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ بے چینی سے صحن میں ٹہلنے لگے۔ نسرین نے دیکھا تو جیسے کچھ یاد آیا۔ "آپ کے بھوک بھی تو لگی

ہو گی۔ کچھ کھا لیجئے..... اس وقت تو میں نے کچھ پکایا نہیں، صبح کے دال چاول پڑے ہیں۔" اسی وقت منو کرسی سے اتر کر بابو رؤف کے پیروں سے میاوں..... میاوں..... کر کے چمٹنے لگی۔ "یہ بھوکی ہے شائد..... اسے کچھ کھانے کو دے دو۔" دوبار گوشت رکھ چکی ہوں سامنے۔ پیالے میں دودھ بھی ڈالا مگر کچھ کھا ہی نہیں رہی ہے۔ سب سے زیادہ صدمہ تو اُسے ہی لگ رہا ہے، نسرین کے جواب پر بابو نے ایک گہری سانس لی۔ ربعہ بھی تو جان چھڑکتی ہے اس پر..... "اتنی دیر میں نسرین پلیٹ میں دال چاول نکال کر لائیں۔" کیوں اس بے زبان کے سامنے مجھے شرمندہ کرنے پر تلی ہے۔..... ؟ لہجے میں تھوڑی جھنجھلاہٹ بھی اتر آئی تھی کیا تمہیں لگتا ہے ایسے میں کھانا حلق سے نیچے اتر جائے گا۔ نسرین پشیماں ہوئیں۔ وہ سوچنے لگیں کہ اُنکی بات اور ہے وہ تو ماشاللہ ہٹی کٹی ہے جبکہ میاں بلڈ پریشر کی مریض۔ باورچی خانے میں پلیٹ ڈھک کر واپس کمرے میں آکر ہیٹر کا تار نکالنے لگیں۔

فجر کی اذان سے بابو رؤف کو صبح کی آمد کی اطلاع ہوئی ورنہ انہیں لگ رہا تھا کہ اس رات کی صبح شاید کبھی نہ ہو گی، دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دی بلکہ تینوں نے، منو بھی اپنی جگہ بہت مضطرب اور اُداس بیٹھی تھی، کئی بار کرسی سے اُتر کر نسرین اور بابو کے پیروں کے پاس بیٹھی، ان دونوں کی آنکھیں تو نصف شب کے بعد کچھ بوجھل بھی ہوئیں مگر منو کی روشن اور چمکدار آنکھیں تمام رات کار کی ہیڈ لائٹس کی طرح جلتی رہی تھیں۔ بابو رؤف مسجد سے نماز ادا کر کے آئے۔ جیسے تیسے آدھی پیالی چاء انڈیلی۔ منو کو دودھ پلانے کی بہت کوشش کی مگر ایک قطرہ بھی اسکی حلق نے قبول نہیں کیا۔ ربعہ سے فرمائش کر کے آئس کریم کھاتی تھی۔ کٹورا رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں ذرا تھانے تک جا رہا ہوں..... آس پڑوس میں کوئی کچھ پوچھے تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتا نہیں بچی پر کیا گذر رہی ہے "آخری جملہ اتنی آہستگی سے کہا کہ خود ہی سنا نسرین دہلیز تک آتے آتے پھپھک پڑیں۔ تمام رات کا روکا ہوا آنسوؤں کا بند بہہ نکلا۔ آنچل پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ بدرنگ میلا سا اجالا پھیل رہا تھا..... یا اللہ..... تو..... مجھے اُٹھا لے مگر میری ربعہ کو سلامت میری جھولی میں ڈال دے۔ اس عمر میں اتنا بڑا غم ہم نہیں برداشت کر پائیں گے..... تجھے کالی کملی والے کا واسطہ، روتے روتے وہیں بیٹھ کر بے دم سی ہو گئیں۔ یہ اگر کسی فلم کا منظر ہوتا تو کوئی معجزہ یقینی تھا مگر یہاں تو حقیقت سے سامنا تھا۔

ڈرتے کانپتے بابو روف تھانے میں داخل ہوئے۔ زندگی میں پہلی بار تھانے کی چوکھٹ پھاندی تھی۔ سپاہیوں کی گھورتی آنکھیں انہیں اندر تک ڈرا رہی تھی۔ کسی طرح نظر بچاتے قدموں کو سنبھالتے تھانیدار کی میز تک پہنچ گئے۔ تھانیدار غالباً موجود نہیں تھا، دیوانہ میز پر پیر پھیلائے کمبل میں ملفوف انھیں کھا جاتے

والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ "کیا ہے بے......؟ اتنی صبح...... صبح...... کس کی......ماں......" دیوان کے پہلے ہی جملے پر جگر لخت لخت ہو گیا جی میں تو آیا کہ پیپر ویٹ اٹھا کر اتنی زور سے ماریں کہ پیچھے سے نکل جائے لیکن دماغ کو ٹھنڈا رکھنے میں ہی عافیت تھی۔ "دیوان جی ایک F.I.R درج کرانی ہے...... ملتجیانہ انداز میں وہ بولے
......"وہ تو مجھے پتا ہے...... تبھی تو میں نے پوچھا تھا...... بولو...... کیا پرولم ہے......"؟

"میری بیٹی شام سے غائب ہے"......

"کتنی بڑی ہے"؟

"بیس سال کی...... ہے......"

"بیس سال کی لڑکی غائب نہیں ہوتی، بھاگتی ہے۔ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی...... یہ کتنے میں...... رہی ہے......"

"زبان سنبھال کر بات کریے مسٹر۔ بابو رؤف کے تیور ایکدم بدل گئے۔ میں بھی سرکاری ملازم ہوں اپنی بیٹی کو میں جانتا ہوں یا آپ...... اس کرسی پر بیٹھ کر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جو چاہیں گے کہیں گے۔ میں ایس ایس پی سے آپکی شکایت کروں گا۔ دیوان کو جیسے کرنٹ لگا ہو۔ میز پر سے پیر نیچے اُتارے "تیری...... تو ......مادر...... مجھے ایس ایس پی کی دھمکی دیتا ہے۔ یہاں سے فوراً بھاگ جا ورنہ مار مار کر بھوسا بھر دوں گا۔ کمبل جھٹک کر وہ کھڑا بھی ہو گیا۔ بابو رؤف کی سمجھ میں آ گیا کہ ابھی ذرا دیر وہ یہاں رُکے تو اُن کی پٹائی یقینی ہے۔ پولس سے براہ راست یہ پہلا سابقہ تھا مگر وہ پولس کے مزاج اور رویّے سے اچھی طرح واقف تھے۔ غصّے کی وجہ سے کانپنے لگے تھے۔ خواہش تو ہوئی کہ سپاہی کی بندوق چھین کر ڈھیر سارا بارود دیوان کے سینے میں اُتار دیں۔ مگر متوسط طبقے کے شریف آدمی کو اس کا ریک کا بھی تو اختیار نہیں۔ بے بسی جھلاہٹ میں کیسے بدلتی ہے اس کا اندازہ اس وقت بابو رؤف کی صورت دیکھ کر آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ حافظے سے زیادہ گالیاں اس احتیاط سے دیوان کی نذر کیں کہ اُسے شبہ بھی نہ ہو اور وہ مطمئن ہو جائیں۔

پھاٹک سے باہر نکلے تو لگا کہ کسی خطرناک جنگل سے جان بچا کر بس بھاگ ہی آئے ہیں۔ تیز ہوتی سانسوں سے بلڈ پریشر بڑھنے کا اندیشہ اور چاروں طرف سے جکڑے ہوئے موت کا وہ لامتناہی سلسلہ کب کیسے گم ہوا اس پر بھی دھیان اس وقت گیا جب سڑک پار کرتے ہوئے لاری کے نیچے آنے سے بچنے پر ڈرائیور نے بھی ایک گالی اُن کی طرف اُچھالی تھی۔ پہلے جیسا وقت ہوتا تو شاید اس منظر کا تصور ہی کام تمام کر دیتا مگر اب اندر کی صورتِ حال وہ نہیں تھی۔ رگ و پے میں سمائے ایک ڈرپوک اور بزدل شخص کی ہیئت لکڑ بگھے میں تبدیل ہو گئی تھی اس خیال کی قوت کے زیر اثر آگے بڑھ کر ایک پتھر اُٹھایا اور نشانہ سادھ کر ڈرائیور کی سمت

دے مارا، پتھر گاڑی کی پُشت پر گرا تو ایک آواز ہوئی، اس آواز نے بابو رؤف کے احتجاج کو بہت سکون پہنچایا۔

ربعہ کا ہنستا مسکراتا چہرا آنکھوں کے سامنے آگیا...... ابُو...... میرے...... ابُو...... ربعہ کی آواز کانوں میں پڑی جیسے وہ بالکل پاس ہی کھڑی ہو۔ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے، ربعہ کہیں نہیں تھی، ٹریفک کا شور بڑھنے لگا تھا لیکن یہ شور بابو رؤف کے باطن کے شور سے کہیں کم تھا...... کیسی اچھی شکل وصورت تھی ربعہ کی اکثر وہ اُسی سے کہہ دیتے...... ''کسے پڑی ہے رے، تیری ماں بھی بس عام عورتوں جیسی ہے، میرا شمار تو ان میں بھی نہیں۔ ذہن میں البتہ تیری جیسی خوبصورت، ذہین اور سمجھدار لڑکی کا تصور تھا مگر یہ اُمید تو میلوں نہیں تھی، سارا سارا دن دونوں میاں بیوی اُسی کے بارے میں سوچتے اور خوش ہوتے رہتے۔ اُس کی تعلیم اور دیگر ضروریات پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیا، فنڈ تک سے پیسے نکالے تھے۔ ''جمع بھی تو تیرے ہی لئے کیے تھے'' ربعہ کے پوچھنے پر بس اتنا سا جواب دیا تھا اور خاموشی سے دیکھتے رہے تھے اُسے۔ اُس نے آگے بڑھ کر والدین کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا تھا۔ سڑک پر مڑنے سے پہلے بابو رؤف نے اس جگہ پر اُنگلیاں پھیریں...... ''ابُو...... میرے ابُو...... بس کچھ دن اور...... ہر دُکھ اور محرومی کے عوض آپکی جھولی میں خوشیاں ڈالوں گی...... آپ دیکھئے گا...... میں آپکا بیٹا بن کر دکھاوں گی...... ابُو...... بس مصیبتوں کے سر پر اب تھوڑے سے ہی بادل بچے ہیں اس کے بعد دُھوپ نکل آئے گی...... اللہ کی ذات پر آپ سے زیادہ بھروسا کسے ہے۔''

سارا منظر بابو رؤف کی آنکھوں میں تازہ ہو گیا۔ پڑھائی میں مصروف ہو جاتے پر وہ اور نسرین کتنی دیر تک ربعہ کے جملوں کی بازگشت کے ساتھ فضا میں اُڑتے رہے تھے۔ خوشی اور افتخار سے دونوں کی آنکھیں گیلی ہو گئیں تھیں۔

آنکھوں میں پانی تو بابو کے اس وقت بھی اتر آیا تھا مگر کتنا فرق تھا۔ تمام خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہو کر بکھرتے نظر آرہے تھے، ایسا غم تھا کہ کسی سے بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ کیسی پارسا بنی پھرتی تھی، گوری چمڑی پر ایسا کالا داغ...... بابو نے سر کو جھٹکا دیا۔ انھیں معلوم ہے کہ اُن کی ربعہ کیسی ہے؟ ٹھیک ہے آج کے زمانے میں انسان کی شناخت بہت مشکل سہی مگر ربعہ کو وہ اپنے سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ کائنات میں سب کچھ غلط ہو سکتا ہے مگر اُن کی ربعہ...... نہیں...... رومال نکال کر آنکھیں صاف کیں۔ ہاتھ دے کر آٹو روکا اور سیدھے ایس ایس پی کے گھر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنا ہو گا، وہ بنچ پر بیٹھ گئے بھوک اور سردی الگ پریشان کئے ہوئے تھیں۔ وہ سوچنے لگے کہ کہیں ایس ایس پی بھی ڈانٹ ڈپٹ کر نہ بھگا دے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ بڑا افسر بُرائی بھی بڑے پیمانے پر کرتا ہے۔ پاس ہی رکھا ہوا اخبار اُٹھایا کہ کچھ وقت کٹے۔ خبروں پر نظر ڈالی تو لوٹ پاٹ، زنا،

قتل وغارت اور گھوٹالوں کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیا۔ طبیعت مکدر ہو گئی۔ اخبار رکھ کے کھڑے ہو گئے۔ حواریوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "ابھی لوٹ کر آتا ہوں۔"

سڑک پر آتے ہی چکر سا آنے لگا، سانسیں ایکدم سے بے ہنگم سی ہونے لگیں۔ دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئے، سب کچھ گھومتا سا محسوس ہو رہا تھا، دس پندرہ منٹ بعد کچھ راحت محسوس ہوئی۔ کسی طرح اُٹھے تو ٹانگوں میں شدید درد کا احساس ہوا پاس ہی ٹھیلے والے کے پاس جا کر چاء پی اور ایک بند کھایا اگر اب بھی یہ پیٹ میں نہ گیا تو اُن کا اسپتال پہنچنا یقینی تھا۔ گلاس ابھی رکھا ہی تھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بھاگنے سے سانسوں کا توازن پھر سے بگڑنے کا خطرہ تھا اس لئے سبک خرامی سے دوبارہ اندر آئے تو معلوم ہوا کہ صاحب جاگ چکے ہیں اور کمرے میں بیٹھے ہیں باؤ رؤف نے کارندے کے کہنے پر پرچی اندر بھجوائی۔ دس منٹ بعد بلاوا آیا، اندر داخل ہوتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، ایس ایس پی گوتم نے بزرگ کو روتے ہوئے دیکھا تو ڈھارس بندھانے والے چند کلمات ادا کیے۔ باؤ نے پوری داستان انہیں تفصیل سے سُنائی۔ ایس ایس پی گوتم کے چہرے پر ہمدردی کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں فوراً متعلقہ تھانے کو فون ملایا۔ تھانیدار کو زبردست گھُڑکی دی اور ساتھ میں یہ حکم بھی کہ "انہیں بھیج رہا ہوں آپ F.I.R اندراج کر کے فوراً کارروائی کریں اور اگر م کی سوچنا سے مجھے اوگت کرائیں"...... ریسیور رکھ کر باؤ رؤف کو بھی اطمینان دلایا تو اُن کی کچھ ہمت بندھی وہ دوبارہ تھانے گئے۔ دیوان شائد چھٹی کر کے گھر جا چکا تھا۔ تھانیدار نے شکایتی انداز میں کہا کہ وہاں کیوں چلے گئے تھے، باؤ نے پوری روداد اُسے سنائی۔ بہر حال رجسٹر کھول کر اس نے اپنے ہاتھوں سے رپورٹ درج کی اور کہا کہ آپ جائیے۔ جیسا ہوگا ہم آپکو خبر کریں گے۔ باؤ رؤف اس قدر خوش ہوئے جیسے ربعہ مل گئی ہو۔ تھانیدار کا اظہار تشکر کیا اور ٹیمپو سے گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔

گھر آ کر نسرین کو الف سے یہ تک کا قصہ سُنایا۔ منو ربعہ کی کرسی سے کُود کر پھر اُن کے آگے پیچھے چکر کاٹنے لگی...... میاؤں...... میاؤں...... کی آواز سے اُس کے تجسس کا اندازہ ہو رہا تھا پُچکار کر منو کو گود میں اٹھایا اور کہنے لگے کہ ربعہ مل جائے گی"۔ پریشان مت ہو۔ نسرین پھٹی آنکھوں سے شوہر کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ اطمینان کسے دلایا جا رہا ہے؟

محلے میں سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے کھُسر پھُسر کر رہے تھے۔ جو باؤ رؤف کے قریب تھے اخلاقی قدروں کو دیکھنے کی حد تک زندہ رکھنے کے سبب حال احوال لینے آ گئے تھے لیکن اندر اُن سب کے بھی وہی تھا جو دیوان کے زبان پر تھا۔

وکیل صاحب اور اُنکی بیگم البتہ باؤ کے تئیں کسی حد تک مخلص تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ربعہ بغیر فیس

کے اُن کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ شروع سے ہی ان لوگوں کا رویہ ربعہ کے لئے بطورِ خاص دوستانہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ خیریت معلوم کرنے آرہے تھے۔ ساتھ میں نیک مشورے بھی دے رہے تھے بانو روف کو سردی زیادہ لگی تو ہیٹر جلا کر بیٹھ گئے۔ تبھی وکیل صاحب کی بیوی ساتھ ٹرے لیے ہوئے اندر آئیں۔ بھائی جان ناشتہ کر لیجئے...... بھابھی آپ بھی آیئے...... بانو نے شکریے کے ساتھ بہت کوشش کی کہ کھانے سے کسی طرح بچ جائیں۔ مگر جیسے وکیلائن بھی طے کر کے آئی تھیں۔ انھوں نے دونوں کو مجبور کر دیا ابھی مشکل سے آدھی روٹی کھائی ہو گی کہ بانو کی نظر منو پر پڑی جو ٹانگوں میں سر چھپائے نیم وا آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ معاً اُن کے ہاتھ رُک گئے ، بانو روف کو لگا جیسے وہ چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ وکیلائن اس ماجرے سے بے خبر تھیں۔ بانو نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے ہم نے آپکی بات مان لی باقی ہم ابھی تھوڑی دیر بعد کھالیں گے۔ اس بار بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔ "اچھا چاء ابھی گڑیہ سے بھجواتی ہوں" کہہ کر وہ چلی گئیں۔ بانو روف لحاف میں دُبک گئے۔ ربعہ کی Study Table اب بالکل سامنے تھی۔ انھیں لگا ربعہ کتاب پر سر جھکائے مطالعہ میں منہمک ہے ، زیادہ دیر تک اُن سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا تو آنکھیں صحن کی طرف کر دیں ، گھڑونچی کے پاس منو کا گھر بنا ہوا تھا۔ انھیں یاد آیا کہ جب ربعہ نے یہ گھر تعمیر کیا تھا تو ایک طرف سے راستہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ منو ربعہ کے پیروں سے لپٹ کر پتا نہیں کیا بتانا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر تک کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا...... میاؤں...... میاؤں کی عجیب طرح سے نکلی آوازیں انھیں پریشان کر رہی تھیں۔ جب وو تین بار جلدی جلدی وہ اس کھلے ہوئے راستے سے آئی...... گئی...... تب کہیں ربعہ کی سمجھ میں آیا کہ بلے کے خوف کی وجہ سے یہ راستہ بند کروانا چاہتی ہے۔ ربعہ نے فوراً فصیل اٹھا دی اُس کے بعد منو ٹھُرتی سے اندر جاکر پیر پسار کر سو گئی تھی۔ ربعہ وہیں کھڑی دیر تک اُسے دیکھتی اور مسکراتی رہی تھی۔ منو کے اتنے نخرے ربعہ کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کھانے میں کبھی اُسے کچّا گوشت نہیں دیا۔ تھوڑا سا نمک مرچ ڈال کر اُبال لیتی اور فریج میں رکھ دیتی۔ منو کو جب بھوک لگتی گرم کر کے اُس کے پیالے میں بوٹیاں ڈال دی جاتیں۔ گرمی میں سونے کے لیے ایسا اہتمام کیا تھا کہ بانو روف اس سے قطعی متفق نہیں تھے کولر کے سامنے اسٹول پہ تکیہ رکھ کر بڑا آرام دہ بستر لگایا تھا جب تک گھر کے لوگ سوتے رہتے منو بھی ٹانگیں پھیلائے عیش سے پڑی رہتی۔ کئی بار تو کولر صرف اُسی کے لیے چلایا جاتا۔

بانو روف کی آنکھیں سکڑتی چلی گئیں۔ پتہ نہیں اس معصوم و عفیفہ پر کیا بیت رہی ہو...... جانے کس حال میں ہو...... ؟ ماضی ایک عفریت کی طرح زمین آسمان کی بیچ کھڑا دیر تک اُن کا مضحکہ اڑاتا رہا۔ جب برداشت سے باہر ہو گیا تو رضائی جھٹک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صحن میں آئے تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

کنڈی کھولی تو تھانیدار اور دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے "آیئے صاحب...... کیا...... کچھ معلوم ہوا......"؟"ہم تلاش کر رہے ہیں...... آپ پریشان نہ ہوں...... جلد ہی بر آمد ہو گی......"کرسی پر بیٹھتے ہوئے تھانیدار نے جواب دیا، وہ تینوں گھر کی ایک اک چیز کو بغور دیکھ رہے تھے، "ہم لڑکی کے بارے میں کچھ جانکاری چاہتے ہیں"؟"ہاں پوچھیے......"پولس نے یاد کر کر کے سوالات کیے کچھ سوالوں پر باؤ کو اعتراض بھی تھا مگر چوں کہ سوالات پولس نے کیے تھے اور شائستگی سے کیے تھے لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی جواب تو انہیں دینا ہی تھا۔ چلنے سے پہلے انہوں نے ربعہ کی ایک تصویر مانگی جو فوراً فراہم کر دی گئی۔ جاتے جاتے وہ اطمینان دلا گئے کہ جتنی جلد ہو سکے گا وہ لڑکی کو بر آمد کرنے کا پریاس کریں گے۔"

باؤ رؤف نے اپنے حافظے پر زور دیا کہ کبھی اُن کی کسی سے دشمنی تو نہیں رہی مگر ایک نام اُن کے ذہن میں ایسا نہیں آیا جس کی انہوں نے دل آزاری بھی کی ہو پھر یاد آیا یہ جو روز اخبارات میں ظلم و تعدو کی خبریں شائع ہوتی ہیں کیا ان کی سب کی دشمنی ہوتی ہے۔ آج کے حالات میں یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی غنیم ہو تب ہی نقصان پہنچے گا مگر یہ زیاں تو تمام ارض سما کی حصولیابی بھی پورا نہیں کر سکتی کیسی عجیب لڑکی تھی۔

پڑھائی کے ساتھ کمپیوٹر کا کورس کر رہی تھی۔ ادارے نے جلد ہی ایک معقول شرح پر نوکری کی ذمے داری لی تھی بس اسی بھروسے اٹھتے بیٹھتے ماں باپ کو حوصلہ دلاتی پھرتی...... میری شادی وادی کا خیال دماغ سے نکال دیں...... ابھی مجھے اس سے زیادہ ضروری کام انجام دینے ہیں باؤ اکثر سوچتے کہ اس عمر میں لڑکیوں کو کیسے اوٹ پٹانگ شوق ہوتے ہیں لیکن ربعہ تو کسی پھیر پھار میں کبھی نہیں رہی۔ نہ ٹی وی، فلموں کا شوق نہ زیور کپڑوں میں کوئی دلچسپی۔ دو تین لڑکیوں سے دوستی تھی وہ بھی اسی کے جیسی پڑھاکو قسم کی تھیں گھر پر خالی اوقات میں منو سے دل بہلاتی۔ اُسی سے باتیں کرتی۔ اسے ہی چھیڑتی۔ منو بھی اس کی تابع داری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی۔ کیا مجال کہ ربعہ کہے اور اس کی خلاف ورزی ہو جائے۔

اگلے دن تمام اخبارات میں ربعہ کی گمشدگی کی خبر چھپ گئی۔ باؤ رؤف یہ ہی نہیں چاہتے تھے مگر اب تک سب کچھ ان کی مرضی سے ہو رہا تھا جو آگے بھی پوچھ کر ہوتا۔ سوچتے سوچتے دماغ کی نسیں جیسے لگتا کہ کسی وقت پھٹ ہی جائیں گی، دوڑ بھاگ اور دماغی الجھن کے چلتے پچھلی رات طبیعت اتنی بگڑی کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا مگر نمبر آنے سے قبل سامنے طغرے پر نظر پڑی۔ "واِذا مرضت فھو یشفین"۔ (اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ ہی مجھے اچھا کرتا ہے)

اس سے پہلے متعدد بار یہاں آچکے تھے مگر ادھر نظر نہیں گئی لیکن آج یہ بھی ہونا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر کھڑے ہو گئے اور نظر بچا کر گھر واپس آگئے۔ نسرین پوچھتی رہیں کہ کیا ہوا۔ ڈاکٹر نے کیا کہا کسی بات کا کوئی

جواب نہیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تیزی سے صحن تک دو تین چکر لگائے۔ نسرین نے آگے کچھ بولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُن کی حالت تو سب سے زیادہ گھمبیر اور اُلجھی ہوئی تھی۔ جہاں اُن کا بھی لٹا تھا مگر وہ کسی سے کیا کہتیں ؟ ایک اک سانس بھاڑو تھی۔ لے دے کر ربعہ کی یادیں تھیں جو دل جگر چھلنی کیے دے رہی تھیں اور ان پر کسی کو اختیار بھی نہیں تھا دو روز اور گذر گئے۔ اس اثنا میں بابو رؤف نے دسیوں چکر تھانے کے لگائے ہونگے۔ ہر بار وہاں سے ایک ہی جواب ملتا۔ تلاش جاری ہے...... کوئی سُوچنا ملے گی تو آپ تک پہنچا دی جائے گی۔ ناامیدی کفر ہے مگر ہر ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دو دنوں میں دونوں برسوں کے مریض نظر آنے لگے تھے۔ منّو کی آواز بالکل بند ہو گئی تھی۔ اب وہ اُچھل کر کرسی سے کسی کے قدموں پاس نہیں آتی۔ مستقل ربعہ کی کرسی پر ایک کروٹ سے لیٹی رہتی۔ آنکھیں کبھی کُھل جاتیں...... کبھی دیر تک کے لیے بند ہو جاتیں۔

روروکر نسرین کی آنکھوں کے پپوٹے پُھول گئے تھے۔ بابو رؤف کس منہ سے منع کرتے، ان کا حال بھی ویسا ہی تھا۔ جانے کہاں کہاں سے لوگ ہمدردی جتانے آرہے تھے۔ بابو کے جی میں آیا کہ دروازہ بند کر کے چھت میں پھندا لگا کر لٹک جائیں یہاں مذہب آڑے آگیا۔ تین روز گذر جانے کے بعد تھانے سے ایک بار بھی بے عزت کر کے بھگائے گئے...... "ابے سالے...... تیری لونڈیا...... کہیں گل چھرّے اُڑا رہی ہو گی اور تو یہاں ہم لوگوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ دس بار بتا دیا کہ مل جائے گی تو خبر بھجوا دیں گے لیکن تیری سمجھ میں ہی نہیں آرہا...... صبح شام...... شکل دکھانے آجاتا ہے...... بھنچو...... ایس ایس پی صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا۔" ایک اک لفظ نیوکلیر بم کی طرح پھٹا تھا بابو رؤف کے دماغ میں۔ واپس ہوئے تو پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ گرتے سنبھلتے کسی طرح باہر آئے۔ پچھلی بار یہاں سے نکلتے وقت باطن میں لکڑ بگھا پیدا ہوا تھا پھر اسی مریل...... ڈرپوک کتّے کے خول میں آ دبکا۔ اس بار تیز تعفن کا شدید احساس ہوا۔ اپنے آپ سے حقارت ہونے لگی۔ آنکھ سے ایک قطرہ نہیں گرا۔ دریا میں دائمی صحرا کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔

وقت اپنی رفتار سے بھاگتا رہا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ربعہ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ تمام ذلت و رسوائی کے بعد بھی بابو رؤف تھانے جاتے رہے۔ ہر ایک کی منت سماجت کی۔ ہاتھ پیر جوڑے۔ جن سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اُن کی خوشامدیں کیں مگر سب بے کار۔ ایس ایس پی کے پاس گئے تو وہ وزیر اعلیٰ کی آمد کی تیاریوں کا جائزہ لینے گئے تھے۔ کئی بار جانے کے باوجود دوبارہ اُن کی زیارت نہیں ہوئی۔ تھک ہار کر دونوں نیم مُردہ سے بستر پر پڑے چھت کو تکے جا رہے تھے۔

اگلی صبح کرسی پر نظر گئی تو منّو وہاں موجود نہیں تھی۔ بابو رؤف نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی پر وہ اپنے کسی

ٹھکانے پر دکھائی نہیں دی۔ انہیں تشویش ہوئی۔ اُٹھ کر پورا گھر چھان مارا۔ منّو کا کچھ اتا پتا نہیں چلا۔ حالات کے پیشِ نظر منّو کا اس طرح غائب ہونا کسی حد تک حیرت انگیز بھی تھا۔ کتنی بار انہوں نے ربعہ کی کرسی سے ڈانٹ پھٹکار کر بھگایا تھا اُسے پر تھوڑی دیر بعد آلا بالا دے کر وہ کرسی پر واپس پہنچ جاتی۔ تنگ آکر انہوں نے ٹوکنا چھوڑ دیا تھا...... پھر...... یہ...... اس وقت کہاں غائب ہو گئی۔ ڈھونڈتے ہوئے سڑک پر آگئے۔

باہر منّو کی لاش پڑی ہوئی تھی...... کتّوں نے اُسے بھنبھوڑ کھایا تھا۔ بابو رؤف اندر تک لرز گئے۔ یقیناً منّو کی موت باہر ہوئی ہے۔ کتّوں نے مرنے کے بعد ہی نوچا کھسوٹا ہے کیوں کہ زندہ رہتے منّو اُن کے ہاتھ لگنے والی نہیں تھی سڑک پر اس کی موت ہوئی مگر وہ یہاں آئی کیوں تھی ؟! اس سوال کا جواب وہ نہیں تلاش کر پائے۔ تھک ہار کر اندر آئے اور کرسی پر لڑھک گئے۔ نسرین نے بُجھتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ''منّو مر گئی'' سرد آہ کے ساتھ لرزتی آواز میں وہ بولے تھے۔ کبھی کبھی...... لاش دیکھ کر بھی کتنا اطمنان ہوتا ہے اس کا اندازہ آج ہوا۔ نسرین پر ایسی ربودگی طاری تھی کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ہونٹ ضرور تھرتھرائے تھے۔ آنکھ کے کوروں سے دو موٹے بڑے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے تھے......

شاہد اختر۔ سکونت، کان پور (بھارت)

آج کے بعد

یوسف عارفی کہانی

وہ آئے تھے؟

ان کی تعداد......؟

پلکیں اٹھا کر دو آنکھیں پہلے ان کی گنتی کرتی ہیں ایک، دو، تین، چار...... پھر پہلی قطار۔ دوسری قطار اور تیسری قطار اور چوتھی قطار...... پھر ہجوم زبردست ہجوم!

پھر بھیڑ اتنی بھیڑ کہ اس بھیڑ کا وجود وسیع و عریض سمندر کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

تھک ہار کر دونوں آنکھیں پلکوں میں بند ہو جاتی ہیں۔ گہرے کالے اور سرخ رنگ کے ننھے ننھے غبارے ان آنکھوں کے سامنے ناچتے نظر آتے ہیں۔ غلطی! قطعی غلطی ہو گئی! یا وہ منظر جھوٹا ہے...... وہ منظر ان آنکھوں نے تو بس ایک ہی منظر دیکھا تھا ایک عام سا منظر کہ وہ آئے تھے ان کے چہروں پر بے وفائی اور ناراضگی صاف مترشح تھی۔ اپنے سیلن زدہ نیم تاریک گھروں کو لوٹ جانے سے قبل ان کی خواہش تھی کہ ان دو آنکھوں کی باریابی کا شرف انہیں حاصل ہو جائے۔ اور وہ عرضی پیش کر دی جائے جس میں بند بوتلوں کا مشکوک دودھ خریدنے سے لے کر سنسنی خیز خبروں والے اخبارات کے خریدنے کی خواہش بھی شامل تھی۔

ابھی وہ اپنی عرضی ان دو آنکھوں کی خدمات میں پیش بھی نہ کر پائے تھے کہ...... انہوں نے سنا۔

"تم سب کمزور رہ کر ہمارا ہاتھ بٹاؤ گے تو اس میں تمہاری نیک نیتی ثابت ہو گی پھر چین و سکون کی نعمت میں تمہارا اور ہمارا برابر کا حصہ ہو گا"

لیکن دو دونوں آنکھوں نے فوری دیکھ لیا کہ...... وسیع و عریض سمندر میں سب سے پہلے ہلکی ہلکی لہریں اٹھیں۔ پھر یہ لہریں قدریں اونچی ہوئیں پھر لگا کہ...... اب دم بھر میں کوئی بڑا طوفان آجائے گا...... اور وہ پر امن فضا جسے مشوروں اور لاٹھیوں سے مسلط کرنے کے لئے ان آنکھوں کو مامور کیا گیا تھا وہ پر امن فضا ٹھیک طوفان کی زد میں ہے۔ بڑے ہی تذبذب کے عالم میں ان آنکھوں نے چاہا کہ کوئی کاروائی کی جائے جو طوفان کا منہ موڑ سکے۔

سنو! ایک بیک ان دو آنکھوں میں انگاروں جیسی سرخی پھیل گئی۔ پل بھر کے لئے وسیع و عریض سمندر

کا طوفان قدرے تھم گیا۔

آج تک جتنے مظاہرے ہوئے جتنی عرض داشتیں پیش کی گئیں اور جتنا امن و سکون برباد کیا گیا...... اس کے عبرتناک انجام سے تم لوگ واقف ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مظاہرے یا ہر پیش کی جانے والی عرض داشت کی تعمیل کو ہم اپنا شعار بنائے رکھیں۔ تمہارا مجھ پہ یہ الزام ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ ذہن سے دیکھتا ہوں۔ بالکل درست ہے اس لئے میں تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ تمہارے قدموں کے نیچے گرم ریت بچھانے کا سارا انتظام طے پاچکا ہے۔ لیکن اس سے قبل کے تمہارے پاؤں لہولہان ہو جائیں اور تم آہ و بکا کرتے کرتے تڑپنے لگو اور اپنے انجام کو پہنچ جاؤ...... میری تم سب سے عاجزانہ گذارش ہے کہ تم سب اس منتظر آہنی دروازے میں داخل ہو جاؤ اور فرائض کی ادائیگی کو اپنی عبادت سمجھو ورنہ......"

ورنہ...... ؟ یک بیک وسیع و عریض سمندر پر چسپاں ہزاروں آنکھیں ایک ساتھ جگمگا اٹھیں۔ اس جگمگاہٹ میں باغیانہ پن کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور یوں لگتا تھا یہ ہزاروں آنکھیں پر شور نعروں اور چڑھتی اترتی سانسوں کے ساتھ کسی بھی وقت ان دو آنکھوں پر حملہ کر سکتی ہیں۔

"اپنی اپنی جگہوں پر رک جاؤ تمہاری سلامتی کے سارے انتظامات بھی ہم نے کر ڈالے ہیں"

"ہماری سلامتی"! ایک استفہامیہ گونج چہار جانب سے اٹھی پھر سکوت چھا گیا۔

"ہم تمہارے دشمن نہیں، ہم تمہارے حکمراں بھی نہیں ہم تو تمہارے دوست اور ساتھی ہیں ہمیں اپنا سمجھ کر ساتھ چلو...... وہ راستے ہم نہیں بھول پائے ہیں جن راستوں سے چل کر تم سب یہاں آئے ہو۔ یہ جو تم نے خود کو ایک سمندر کی شکل دے رکھی ہے۔ اس پر ہم بہت خوش ہیں اتنا خوش کہ ہمیں اپنی جیت کے ساتھ ساتھ شکست کا بھی شدید احساس ہونے لگا ہے۔ مگر ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی مسرت اور شکست کا اعتراف کر لینے سے قبل تمہاری اجتماعی طاقت کا اندازہ لگائیں۔

وسیع و عریض سمندر پر سکون تھا اور دو آنکھیں بڑے اطمینان اور مہربان انداز میں اس پرانی فرسودہ تحریر کا آخری حصہ پڑھنے لگیں جو شکستہ کمرے کے مدھم اجالے میں بیٹھ کر لکھا جاچکا تھا۔

ہم جانتے ہیں بازار کس قدر مہنگا ہو گیا ہے چیزوں کے معیار کے بدلے ان کے ظاہری حسن میں کتنی تبدیلی آچکی ہے اور سستی شراب صحت کے لئے کس قدر مضر ثابت ہونے لگی ہے۔ تمہاری عرض داشتوں میں ان مسائل کے حل ڈھونڈنے کی خواہش کا کہیں بھی ذکر نہیں بلکہ تم نے صرف زیادہ روپے کی مانگ کی ہے...... زیادہ روپے کی نہ صرف تمہیں بلکہ اس کی ہمیں بھی ضرورت ہے ہم چاہیں تو اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے وہ سارے بنیادی حقوق جن کے دار و مدار پر تمہارے رات اور دن چل رہے ہیں سلب کر سکتے ہیں اگر

کسی دن ایسا ہو جائے تو سمجھ لو...... وہ دن ہماری عظیم روایات کا آخری دن ہو گا۔

آخری دن کے الفاظ پر وسیع و عریض سمندر میں ایک ہلچل سی ہوئی۔

"ہمارا آخری فیصلہ یہ ہے کہ تم اس منتظر آہنی دروازے کو لات مار کر واپس جا سکتے ہو۔ لیکن سنو! یہاں سے لوٹ کر تم جاؤ گے کہاں؟"

"ہاں...... کہاں جائیں گے......؟ وسیع و عریض سمندر ایک بڑے سوال کی شکل اختیار کر گیا"

جیت!!؟ حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں...... پھیلتی گئیں...... پھیلتی گئیں......اور اس قدر پھیل گئیں کہ وسیع و عریض سوال میں گم ہو گئیں۔

ایک خبر:

23 فروری: کل یہاں فیکٹری کے مالکان اپنی خوبصورت کوٹھیوں میں مع اپنے رشتہ داروں کے مردہ پائے گئے۔ ان کی خفیہ اور اجتماعی موت کی وجہ ابھی تک معلوم نہ ہو سکی ہے لیکن معتبر حلقوں میں یہ افواہ بڑی شد و مد کے ساتھ گردش کر رہی ہے کہ ان کی موت فیکٹری میں مسلسل لاک آؤٹ کا نتیجہ تھی۔ یہ خبر بھی حیران کن ہے کہ فیکٹری کے سزا یافتہ نیم پاگل انقلابی اور محنتی اور مزدوروں نے فیکٹری کے مالکان کی موت کے بعد فیکٹری کو اپنی جائیداد قرار دے دیا ہے۔ سرکار نے فیکٹری کے باعزت مالکان کی نامعلوم موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آج کے بعد فیکٹری کی ساری جائیداد اور اس کا انتظام سرکار اپنی تحویل میں لے لے گی۔

یوسف عارفی۔ سکونت، بنگلور (بھارت)

کسبی

آغا گل

کہانی

ہماری زندگی ایک مسلسل گھٹن کا شکار تھی۔ ماں کسی سے ملنے جلنے نہ دیا کرتی۔ پاس پڑوس سے باپ مارے کا بیر تھا۔ کسی پڑوسی کا ذکر کرتے تو ماں اُسے صلواتیں سنانے لگتی۔ پتہ چلتا کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ پاس پڑوس سے بچوں کے کھیل کود کی آوازیں آیا کرتیں۔ آنکھ مچولی، اونچ نیچ۔ بازی، ٹیلو۔ بڑی قسم قسم کے کھیل وہ کھیلا کرتے۔ ہمیں استاد صاحب کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ہمیں دینی کتابیں پڑھایا کرتے۔ موٹے تازے لحیم شحیم سے انسان تھے۔ لباس بھی ہمیں اُن کی پسند کا پہنا پڑتا۔ لمبے کُرتے، چھوٹی شلواریں۔ ذرا پائینچہ ٹخنوں سے اونچا ہوتا تو استاد صاحب برس پڑتے۔ قیامت کا خوف دلا دلا کر ہمیں قہقہے لگانے سے بھی روک رکھا تھا۔ پڑوس میں قہقہے اُبلتے تو ٹھنڈی ہوا کی طرح ہمارے گھر پر بھی پھیل جایا کرتے۔ ہم بھوکوں کی طرح قہقہوں کی خوشبوئیں سونگھا کرتے۔ ایک چوکیدار بھی ہم پہ مسلط رہتا۔ کمر سے ایک جانب خنجر بندھا رہتا، دوسری جانب پستول۔ کندھے پہ دہشت ناک بندوق رہتی۔ ہمیں ڈرانے کو وہ اکثر بندوق چھتا لیا کرتا۔ پھر ہم توبہ کرتے، گڑگڑاتے، ماں کو پکارتے تو وہ ہمیں معاف کر دیا کرتا۔ گھر کے سامنے ندی تھی۔ مگر نہ تو ہمارے پاس کشتی تھی کہ نکل بھاگتے اور نہ ہی ہمیں تیرنا آتا۔

اکثر شام کے اندھیروں میں ایک کشتی آن رکتی۔ اس سے بہت سے گورے نکلتے، اُن کا بڑا قد آور سربراہ آگے آگے چلتا۔ وہ سب ہمارے گھر کے ہال میں چلے جاتے ہم انہیں سلام کرتے تو وہ روپے ہمارے لئے پھینک دیا کرتے، چاکلیٹ بھی پھینکا کرتے، چاکلیٹ اور ٹافیاں تو ہمارے حصے میں آتیں۔ مگر روپے استاد صاحب اور چوکیدار جھپٹ لیا کرتے۔ گورے یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتے۔ بعض اوقات اُن کی چھینا جھپٹی سے محظوظ ہونے کیلئے باربار نوٹ پھینکتے اور خوب قہقہے لگاتے۔ چوکیدار کے پاس اسلحہ ہوا کرتا۔ مگر کیا مجال کہ استاد صاحب سے ٹکر لیتا۔ مگر اس اسلحے کے ساتھ اسکا زمین سے نوٹ چننا، جھپٹ جھپٹ کر ہوا میں نوٹ پکڑنا ہمیں بہت معیوب سا لگتا۔ مگر اسکی بندوق کا بٹ مظبوط تھا، استاد کے تھپڑ بھی زناٹے دار تھے۔ اس لئے ہم سہمے سہمے سے یہ منظر دیکھا کرتے۔ ماں نے گھر کے چار حصے کر رکھے تھے۔ ہر بھائی کے پاس ایک گوشہ تھا۔ سر شام سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جایا کرتے۔ ماں گورے صاحبوں کا استقبال کرتی اور انہیں ساؤنڈ پروف ہال میں لے جاتی۔ جہاں ہمیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ماں ہمیں آپس میں میل جول بھی نہ رکھنے دیتی

رات بھر وہ گورے صاحبوں کے ساتھ رہا کرتی اسکا دن سو کے گذرتا۔ ناشتے کے جائے وہ الصبح گوروں کے ساتھ ڈنر لیتی۔ گورے تو اپنی کشتی میں روانہ ہو جایا کرتے۔ ماں خوابگاہ میں چلی جاتی۔ ہم ناشتہ کرتے اور استاد صاحب کے ہتھے چڑھ جایا کرتے۔ اُن کے تھپڑ اُن کی چھڑی، الحفیظ والامان۔

سہ پہر کے دوارن ماں بیدار ہوتی۔ ناشتہ کرتی۔ پھر ہم سے دن بھر کا سبق سُنتی۔ ہمیں شکوہ شکائیت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ماں کے رویے بہت تکلیف دہ ہوا کرتے۔ پھر رفتہ رفتہ بارودی سارندے بھی آنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں میں موسیقی کے آلات ہوا کرتے، وہ ہال میں جاکر سازوں کے سُر ملاتے، طبلہ نواز اپنے طبلے کی گت سنوارتے۔ شور اور ہنگامہ رہتا۔ اُس اذیت ناک خاموشی سے جو ہماری زندگی پہ پھیلی ہوئی تھی یہ شور بہتر تھا۔ اُس میں زندگی تھی۔ وجود کا احساس تھا۔ لیکن ہمیں بہت بُرا لگتا کہ ماں اب گورے صاحبوں کو رقص سے بہلائے گی۔ یوں بھی ہم اتنے سالوں میں باشعور ہو چکے تھے۔ اگلے روز جو سہ پہر میں وہ دینی سبق لینے بیٹھی تو ہم نے سولات کی بوچھاڑ کر دی۔

"ماں تم رقص کرتی ہو، رقاصہ ہو تم؟"

"ہاں!" اُس نے رسان سے کہا "میں رقص کرتی ہوں۔ پوری کائنات میں رقص ہے۔ ردھم ہے۔ دل اپنی تال پہ دھڑکتا ہے، "سمندر اپنی دُھن پہ تھرکتے ہیں۔"

"مگر ناچنے والی کو تو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔"

"مگر انھوں نے تو بڑے بڑوں کے سر اتروا دیئے۔ سلومی نے ناچ کے بادشاہ کا دل بہلایا۔ اور جب بادشاہ نے خوش ہو کر کہو کہ مانگو کیا مانگتی ہو تو سلومی نے جانتے ہو کیا کہا۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت یہ آپ کے لئیے ممکن نہیں ہوگا۔ بادشاہ جلال میں آگیا۔ اس نے بھرے دربار میں تین بار وعدہ کیا جو بھی سلومی مانگے گی وہی اُسے دیا جائے گا۔ جانتے ہو سلومی نے کیا مانگا؟ اس نے یوحنا نبی کا سر مانگا۔ بادشاہ بہت آزردہ خاطر ہوا۔ مگر سلومی کو خوش کرنے کیلئے جلاد کو حکم دیا کہ قید خانے سے یوحنا نبی کا سر اتار کے طشت میں پیش کرے ایسا ہی ہوا۔ یہ ناچنے والیوں کی طاقت ہے بیٹا۔ خود ناچ کے ساری دنیا کو نچاتی ہے۔ موسیقی سے میری محبت کا اندازہ اپنے ناموں سے کرو۔ تم با ہو، تم پا ہو تم سا، اور تم فا ہو۔ تم چاروں بھائی با، پا، سا اور فا ہو۔ یہ میوزیکل نوٹس ہیں، سنگیت کے سُر ہیں۔ جن پر دنیا قائم ہے۔ یہ انگریزی زبان میں سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ کے نام ہیں۔

ہمیں پہلی بار اپنے ناموں کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ "مگر یہ ناچنا گانا تمھیں چھوڑنا ہوگا۔ ہمارے لئیے شرم کی بات ہے۔" پا نے استدلال کیا۔

"تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا۔ استاد اور چوکیدار کو کون پالے گا۔"

"اب ہم بڑے ہو گئے ہیں، نہ تو ہمیں استاد کی ضرورت اور نہ ہی چوکیدار کی۔ جیسے بچے کو آیا کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ نوجوان کو نہیں۔ ہمارا شعور ہی ہمارا استاد ہے۔ ہماری استعداد ہی چوکیدار ہے۔"

اچانک دروازہ کھلا چوکیدار اور استاد صاحب ایک ساتھ گھس آئے۔ چوکیدار نے بندوق چھتائی، استاد صاحب نے چھڑی اُٹھائی۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم گھبرا کے باہر بھاگے۔ چاروں اپنے اپنے کمروں میں جا ڈبے۔ کیونکہ ایک ساتھ رہنے پہ ماں کو اعتراض تھا۔ اسکی خواہش تھی کہ آپس میں ہم چاروں کے تعلقات نہ رہیں۔ بلکہ ناراضگی زیادہ بہتر ہے۔

"اکیلا پن انسان کو طاقت بخشتا ہے، چونٹیاں اور کوے مل کے رہتے ہیں، شیر الگ الگ رہتے ہیں۔ گھاس بجوی بجوی رہتی ہے۔ درخت اکیلے اکیلے۔ بہادر پہاڑوں میں گھر بنا کر اکیلے رہتے ہیں، اور بزدل شہر بسا کر۔ محلے بنا بنا کر اکٹھے رہتے ہیں۔ طاقتوروں کو تو اتحاد و اتفاق سے غرض نہیں۔ یہ تو کمزوروں کا شیوہ ہے۔ میں تم چاروں کو انفرادی طور پر طاقتور دیکھنا چاہتی ہوں۔ لہذا آپس میں میل جول نہ رکھا کرو الگ الگ کمرے میں۔ سب الگ الگ رہا کرو۔ یہ کمرے گورے صاحبوں نے الگ الگ بنوا کر دیئے تھے۔ ورنہ میں تو ایسا کبھی بھی نہ کر پاتی۔"

رات کو جب ہال میں موسیقی کی گونج بڑھی تو ڈرتے ڈرتے ہم چاروں باہر نکلے اور اندھیرے میں درخت کے نیچے جمع ہونے لگے۔

۔ "یا! تم بڑے ہو تم کچھ ہمت کرو"

۔ "مگر میں استاد صاحب کی چھڑی سے ڈرتا ہوں۔ کاٹ ڈالتی ہے۔ کئی روز تک نیل باقی رہتے ہیں۔ توبہ توبہ! اور چوکیدار کی بندوق میں جانے کتنی گولیاں بھری رہتی ہیں۔ بھون کر رکھ دے گا۔"

سا بالکل نہ مانا "اس اذیت ناک زندگی سے تو عزت کی موت بہتر ہے۔ مل کر ہلہ بول دیں گے۔ ہم چار ہیں۔ ماں میں تو لڑنے کی سکت نہیں۔ باقی دو کو تو ہم سنبھال ہی لیں گے۔"

فا نے تجویز پیش کی "ماں نئے استاد نئے چوکیدار رکھ لے گی۔ لڑنے کا فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ ماں کا ہی سر اتار دیا جائے ورنہ یہ بھی سلومی بن کر سر اتارنا شروع کر دے گی" "فرض کیا ماں کو مار بھی دیا، تو کھائیں گے کیا؟ ہم تو گوروں کی خیرات پر پلتے آئے ہیں۔"

مجھے سخت غصہ آیا "ہم جوان ہیں، محنت کر سکتے ہیں۔ اسقدر وسیع حویلی ہے، اتنی زمین ہے، مویشی پال سکتے ہیں۔ باغ لگا سکتے ہیں، محنت کر سکتے ہیں۔"

"اور جو گورے صاحب ٹوٹ پڑے" فا نے سوال کیا۔

سانے جلدی سے جواب دیا "گورے صاحب مال کیلئے آتے ہیں۔ ماں ہی سج سجا کر انہیں بلواتی ہے۔ ماں ہی نہ ہوئی تو وہ کس کیلئے آئیں گے۔"

آخر کار بحث اور سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ماں کا قتل ضروری ہے۔ اتفاق رائے کے بعد ہمیں اپنے جسموں میں نرالی سی طاقت محسوس ہوئی، دل بھی تیز تیز دھڑ کنے لگا۔ آنکھیں بھی روشن ہو گئیں۔

ہتھیار نام کی کوئی شے گھر میں نہیں تھی۔ گوشت کاٹنے کی ایک چھری دستیاب ہوئی۔ وہ ہم نے پا کو دے دی کیونکہ وہ سب میں بڑا تھا۔ اُسے ہی مہلک وار کرنا تھا۔ سبزی کاٹنے کی دو چھریاں ملیں۔ وہ دونوں فا اور سانے سنبھال لیں۔ اور کوئی بھی ہتھیار نہ ملا تو مجھے ایک بڑی سی قینچی سے مسلح کر دیا گیا۔ کہ اِسے ماں کے پیٹ میں گھونپ دوں۔ طے پایا کہ سب سے پہلا وار پا کرے گا۔ وہ ماں کے دل میں چھری گھونپ دے گا۔ باقی دونوں بھائی سینے پر کاری وار کریں گے۔ اور میں قینچی اسکے پیٹ میں اتار دوں گا۔

رات کروٹیں بدلتے گزری۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حسب الحمول ہم نے استاد سے سبق پڑھا۔ درس کے بعد چھٹی ہوئی، ہم نے کھانا زہر مار کیا۔ اور سہ پہر کی راہ دیکھنے لگے۔ جب ماں بیدار ہو کر ناشتہ کیا کرتی۔

آخرِ کار وہ وقت آ پہنچا۔ دھڑکتے ہوئے دلوں سے ہم اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلے۔ ہتھیار ہم نے لباس میں چھپا رکھے تھے۔ ماں کی خوابگاہ کے باہر چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے ہمارے چہرے اور بدلے ہوئے انداز دیکھے تو ٹھٹھک گیا۔ "ٹھہرو!" اس نے للکارا "اپنی اپنی تلاشی دو۔"

۔"اپنی ماں کے پاس جانے کیلئے کوئی بیٹا تلاشی نہیں دیتا۔" ہم گرجے

"مگر میں چوکیدار ہوں"

۔"مگر میں بیٹا ہوں۔ سب سے بڑا بیٹا" پا گرج کر بولا

"ٹوٹ پڑو!" پا نے حکم دیا۔

ہم چاروں بھائی چوکیدار پہ ٹوٹ پڑے۔ اُسے گھونسوں پہ رکھ لیا۔ چوکیدار حیرت انگیز طور پر کمزور اور کم ہمت ثابت ہوا۔ دھم سے زمین پہ آ رہا۔ اور ہاتھ جوڑنے لگا

"مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو" وہ گھگھیانے لگا۔ اسکی بندوق ہم نے چھینی تو وہ نقلی تھی۔ اس میں پلاسٹک کی گولیاں تھیں۔ کمر سے بندھا خنجر ربڑ کا نکلا۔ پستول بھی جعلی تھا کمبخت زندگی بھر کھلونا ہتھیاروں سے ہم لرزاتا رہا۔ ہم نے ٹھوکریں مار مار کر اُسے باہر بھگا دیا۔

ہم دروازہ کھول کر ماں کی خوابگاہ میں مردانہ وار داخل ہوئے۔ وہ چونک اُٹھی۔

"یہ باہر شور کیسا تھا"

۔"ہم نے گوروں کے چوکیدار کو مار بھگایا ہے،"

"وہ تو میرا محافظ تھا" ماں برہم ہو گئی

۔"ماں کے محافظ بیٹے ہوا کرتے ہیں، وہ کمبخت تو بہروپیہ تھا۔ پلاسٹک کی بندوق اور ربڑ کا خنجر لیئے پھر رہا تھا" فا نے بتایا۔

۔"ہمارا باپ کون ہے، کیا نام ہے اسکا" پا گرجا

"گورے، تمہارے باپ ہیں،"

۔"اتنے شوہر ہیں تمہارے، اتنے باپ ہیں ہمارے۔" سالال پیلا ہو گیا، ہم چاروں غصے سے تھر تھرا اُٹھے ماں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "کم عقلو معاشرے دو قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک جسکا سربراہ مرد ہوائے PATRIARCHAL SOCIETY کہتے۔ اس میں مرد ایک سے زائد شادیاں بھی کر سکتے ہیں۔ وہاں POLYGAMY ہوتی ہے۔ ایک مرد کئی بیویاں۔ دوسری قسم کا معاشرہ وہ ہوتا ہے۔ جس کی سربراہ عورت ہوا کرتی ہے اُسے METRIARCHAL SOCIETY کہتے ہیں۔ وہ کئی شوہر رکھ سکتی ہے اسے POLYANDRY کہتے ہیں۔ یہ سارے گورے میرے شوہر ہیں۔" الفاظ کیا تھے آگ تھی۔ ہم غصے سے کانپنے لگے۔

پا نے بغل سے چھری نکالی اور برق رفتاری سے ماں کے دل میں گھونپ دی، پا چیخ مارتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اسکے ہاتھ میں خشک چھری تھی۔ اسکے اپنے سینے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ فا اور سا نے نعرہ لگایا ایک ساتھ جھپٹے اور ماں کے سینے میں دائیں بائیں چھریاں گھونپ دیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ کراہے اور لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ہٹے۔ اُن کے ہاتھ میں بھی خشک چھریاں تھیں۔ خون کا قطرہ تک نہ تھا۔ خون منجمد کر دینے والا منظر یہ تھا کہ اُن کے اپنے سینے پر کاری زخم لگے تھے۔ اب میری باری تھی۔ میں نے پوری قوت مجتمع کر کے نعرہ لگایا قینچی دونوں ہاتھوں میں مظبوطی سے پکڑ کر سر سے بلند کی اور ماں کے پیٹ میں پوری قوت سے گھونپ دی۔ میرا پورا جسم لرز اٹھا۔ درد کی لہر نے بھونچال مچا دیا۔ میرے اپنے پیٹ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا ہم چاروں بھائی خون میں لت پت پڑے کراہ رہے تھے۔

ماں بستر سے اُٹھی، اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ زرق برق لباس میں وہ بالکل ہشاش بشاش اور تر و تازہ تھی۔ "چند گھنٹے یہ تکلیف اور برداشت کر لو۔ شام کو تمہارے سارے باپ آئیں گے تو وہ تم سب کا علاج کر دیں گے۔ بڑی شفاء ہے ان کے ہاتھ میں۔"

آغا گل۔ سکونت، کوئٹہ (پاکستان)

محشرِ خیال

امین جالندھری

کہانی

بہت دن انتظار کے بعد اُسے اذنِ باریابی ملا تھا۔

اُس نے اپنی ترکی ٹوپی کو سر پر سجایا۔ شیروانی کے بٹن لگائے۔ صافے سے منہ کو صاف کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دربان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ محلسرا کے دروازے پر خود شاہ عالم بہ نفس نفیس اُس کے استقبال کو موجود تھے۔

"حضور غلام آداب بجالاتا ہے۔

حضرت...... آپ کیسے ہیں۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔ آیئے...... تشریف لایئے......

حضور...... آج غلام کا دل چاہا تھا کہ رخِ انور کا دیدار کرے۔ سو بے تابیٔ دل یہاں تک لے آئی ہے۔

"حضرت...... زہے نصیب...... آپ کے لئے چشم براہ ہونا ہمارے لئے لائق صد افتخار ہے۔

حضور...... بندہ پروری آپ کی سرشت میں شامل ہے ورنہ من آنم کہ من دانم؟

حضرت...... نفوسِ پاکیزہ سے ملاقات...... یہی ہماری عارضی زندگی کا اثاثہ ہے۔

حضور...... جب بے کلی بڑھتی ہے...... تو کچھ کرنے کی خواہش بے چین کر دیتی ہے۔

حضرت، یہی کیفیت یہاں بھی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے طفیل ہماری بھی عاقبت سنور جائے گی اور کوئی بڑی سعادت ہمارے حصے میں آئے گی۔

حضور...... بندگانِ الٰہی پر آپ کے بے شمار احسانات ہیں۔ ہم فقیروں کے لئے یہی کافی ہے کہ حضور ہم سے محبت کرتے ہیں......

حضرت...... آپ کے پاسِ ادب کے ہم قائل ہیں۔ پہلے یہ بتلایئے کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے تشریف رکھئے۔ اور تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حکم فرمایئے کہ خیال خاطر احباب کا سلسلہ کس طرح شروع کیا جائے۔

حضور...... آپ بندہ پرور ہیں۔ غلام کیا عرض کرے۔ جو منشاء حضور ہو اِس پر غلام آمنا صدقنا کہتا ہے۔

حضرت...... آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں۔ اور گن بھی آپ میں زیادہ ہیں۔ ہم تو بس آپ کی

نگاہ محبت کے اسیر ہیں۔ دستگیر ہیں......

حضور...... آپ ہندوستان کے مالک اور شاہ عالم ہیں اور یہ بندہ فقیر عاصی اور پر تقصیر...... بس آپ کے سہارے زندگی کے دن بتا رہا ہے۔

حضرت...... توشہ خانے سے کچھ منگوایا جائے یا فواکہات و مشروبات!

حضور...... بس شربت دیدار کافی ہے۔

حضرت...... اگر آپ مناسب خیال کریں تو پہلے خاصا تناول فرمائیں۔ اس کے بعد آپ سے تفصیلی گفتگو کرنی ہے۔ اور ہاں آج رات گئے تک آپ ہمارے مہمان ہیں......

حضور...... بندہ آپ کے ہر حکم پر لبیک کہتا ہے......

تو پھر حضرت آیئے...... آگے بڑھیے اور مجھے یہ سعادت حاصل کرنے دیں کہ میں آپ کے ہاتھ دھلوا دوں۔

حضور...... ناحق زحمت نہ کریں۔ فقیروں کی اوقات کو زیادہ نہ بڑھائیں۔ مجھے یہ سعادت حاصل کرنے دیں کہ میں شاہ عالم کی خدمت کا حق ادا کروں...... آپ کی خدمت تو ہم فقیروں پر فرض ہے حضور۔

حضرت...... کبھی زندگی میں ہمیں بھی فقیروں کی جوتیاں سیدھی کرنے دیں۔ یہ شرف ہمیں عطا ہو"۔

حضور...... آپ اس فقیر کو نادم کر رہے ہیں۔ کجا گنگوا تیلی کجا راجا بھوج......

"حضرت...... ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے ناں...... آج ہمارے لئے عید کا دن ہے۔ مسرت اور شادمانی ہمارے گرد والہانہ رقص کر رہی ہے۔ حضور کی تشریف آوری پر اس محل کا ہر ذرہ اپنی قسمت پر نازاں ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا دل۔ جو آپ کے قرب کی پر مسلسل بے اختیار دھڑکے جا رہا ہے۔

حضور...... آپ کی بندہ پروری کے قربان جایئے...... یہاں بھی جسم کا رواں رواں آپکی محبت، عنایت اور کرم سے سرشار ہے...... اور پھر......

شاہ عالم نے باآواز بلند کہا "ارے کوئی ہے......

حکم عالم پناہ...... خاصہ یہیں لگایا جائے......

"حضرت لیجئے۔ خاصہ حاضر ہے۔ تناول فرمایئے......

"حضور...... پہلا لقمہ آپ لیجئے...... تاکہ کھانے میں برکت ہو۔

حضرت...... پہلے لقمہ آپ لیجئے...... تاکہ کچھ سعادت ہمارے حصے میں آئے۔

''حضور...... غلام آپ کے حکم کو بجالاتا ہے...... لیجئے بسم اللہ کیجئے......

حضور...... اللہ پاک آپ کا اقبال بلند کرے۔ اس دستر خوان کو اور وسیع کرے اور اس دستر خوان سے غریبوں اور فقیروں کی تالیف قلب کی ہوتی ہے۔

آمین...... حضرت...... آمین...... اے مرے پروردگار ہمیں اور توفیق ارزانی عطا کرتا کہ ہم بندگان الٰہی کی خدمت کرسکیں۔

لیجئے...... حضرت ہاتھ دھولیجئے...... یہ صافہ لیجئے۔

حضور...... ہم فقیروں کو گناہ گار نہ کیجئے......

''حضرت...... آج کا دن باعث عز وافتخار ہے کہ آپ نے بندہ پروری کی اور قدم رنجہ فرمایا۔

حضور...... آپ کی مہربانیاں اس قدر ہیں کہ یہ عاجز آپ کی محبتوں کا کس منہ سے شکریہ ادا کرے۔ بات یہ ہے شاہ عالم کہ ہم عرصہ دو سال سے بلاد ہندوستان کے چپہ چپہ پر گھوم کر آئے ہیں...... ہر جانب امن و سکون ہے مگر کہیں کہیں رعایا سخت مالی مشکلات کا شکار ہے۔ افلاس دن بدن بڑھ رہا ہے۔ غربا و مساکین کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ جیسے بندہ پرور اور عادل حکمراں کے دور میں یہ چیزیں قابل ستائش نہیں ہیں۔ لہٰذا اس جانب فی الفور توجہ کی درخواست ہے۔

حضرت...... انشاء اللہ کل صبح ہی اس سلسلے میں فرمان شاہی جاری کر دیا جائے گا۔

حضور...... عمال حکومت پر گرفت بھی ضروری ہے۔ اُن اسباب کا پتہ چلانا بھی ضروری ہے کہ جن کی بدولت معاشرے میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا...... آپ اطمینان رکھئے...... اور ہاں مجھے یاد آیا کہ آج سے ہفتہ عشرہ پہلے ہم نے ایک خواب دیکھا۔ خواب میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایک انبوہ کثیر ملنے آیا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں درانتی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کدال ہے۔ کوئی معمار ہے۔ کوئی بڑھئی ہے۔ کوئی تجار ہے۔ کوئی حافظ قران ہے۔ بہت سے لوگ خطاطی کے نمونے لئے ہوئے ہیں۔ بڑے ہی دلکش انداز میں آیات ربانی نفاست سے لکھی ہوئی ہیں...... کہیں اونٹوں پر سنگ سرخ لدا ہوا ہے۔ کہیں بہت سے کٹے ہوئے درختوں کے ڈھیر ہیں...... کہیں چونے۔ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر ہیں...... سب چیزیں آہستہ آہستہ جمع اور یکجا ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ میرے کاندھوں پر وزن بڑھنا شروع ہوتا ہے...... میرے کاندھوں پر وزن لحہ بہ لحہ بڑھ رہا ہے۔ میں بے کل اور پریشان ہوں کہ یہ الٰہی کس بات کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔ تو ناگہاں میرا ذہن آپ کی جانب توجہ کرتا ہے...... میں دیکھتا ہوں کہ آپ مسکراتے ہوئے تشریف لاتے ہیں اور میں دوڑ کر

آپ کی قدم بوسی کے لئے جھکتا ہوں کہ آنکھ کھل جاتی ہے......اِس خواب کی تعبیر بتلایئے حضرت۔

"حضور......آپ اپنے خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم آپ سے اپنا خواب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو سمع خراشی کی زحمت دیں۔

حضرت......بسم اللہ۔

حضور......فقیر نے ایک خواب دیکھا کہ دریائے راوی پار کر کے شہر لاہور میں داخل ہوا ہے۔ اور داتا صاحب کے دربار میں حاضری دے رہا ہے۔ فاتحہ خوانی کے بعد ایک بزرگ ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شہر میں ایک چیز کی کمی ہے......

وہ کیا......ہم نے سوال کیا

دیکھئے......انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ہم دونوں فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ اوپر جا کر دیکھا تو شہر کی عمارتیں چھوٹی چھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے ہمراہی نے کہا۔ حافظ صاحب دیکھئے...... یہ شہر ایک شاندار مسجد سے محروم ہے اور یہ سعادت آپ کے حصے میں آئی ہے کہ بلند و بالا عالیشان مسجد آپ کے ہاتھوں تیار ہو اور وہ سامنے میدان دیکھو......جہاں مسجد تعمیر کرنی ہے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہمارا ہاتھ چھوڑ دیا......اور یوں ہماری آنکھ کھل گئی......

حضرت سبحان اللہ......یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے ہمارے خواب کی اتنی اچھی تعبیر بیان کی سبحان اللہ......

"حضور......اب آپ کا کیا خیال ہے......

"حضرت......جو حکم ہو......ہمارا خیال ہے کہ واقعی ہمیں مسجد کا کام شروع کر دینا چاہیئے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ کام آپ اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیں۔ مسجد اتنی وسیع، دلکش اور عالی شان ہو کہ آنے والی نسلیں ہمارے فن تعمیر کی تعریف کریں۔

حضور......ایک بات بتلایئے کہ انسانوں کو خوابوں میں نت نئے خیال کیوں سجھائے جاتے ہیں۔

"حضرت......مجھ کم علم کو کیا پتہ۔ اِس بارے میں اگر آپ کچھ ارشاد کریں......تو......

حضور......آپ کی سلطنت میں مختلف النوع مذاہب کے انسان رہتے ہیں۔ ایک اچھے حکمران کی یہ بھی خاصیت ہونی چاہیئے کہ ملک میں ہر شخص کو ذاتی ترقی کا برابر حق ملے۔ اس کے حقوق عادلانہ طریقے سے اسے حاصل ہوں۔ تعمیرات انسانی زندگی کی ترقی کا راستہ ہیں۔ اِس سے بہت سے انسانوں کو روزگار ملتا ہے۔ اور کام کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ دولت کی ریل پیل ہوتی ہے......نت نئی چیزوں کی اختراع پیدا

ہوتی ہے۔ صناع اور کاریگر اپنے اپنے پیشوں میں نئی نئی اختراعات کرتے ہیں...... مخلوق خدا زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ تخلیق کار میں محشر خیال سر اٹھاتا ہے...... فن میں جوت پیدا ہوتی ہے مسابقت لگن پیدا کرتی ہے۔

حضرت...... بجا ارشاد فرمایا۔ آپ کی باتیں سن کر دل شاد ہوا۔ آباد ہوا۔

حضور...... وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ فقیر اب اجازت چاہتا ہے۔

حضرت...... حضرت ہم تو کئی دنوں سے آپ کے لئے چشم براہ تھے۔ آج دل کی مراد بر آئی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ بلاد ہندوستان میں ایک ایسی مسجد تعمیر کریں کہ صاحبان ذوق اش اش کر اٹھیں...... مگر اس لحہ میری آپ سے ایک درخوست ہے کہ...... آج آپ کے اقتداء میں نماز تہجد ادا کی جائے......

حضور...... یہ گناہ گار اس کا اہل نہیں ہے۔

حضرت ہم سے یہ سعادت نہ چھینئے...... بسم اللہ......

حضور...... اگر آپ کی منشاء یہی ہے تو صفیں درست کرنے کا حکم دیجئے......

جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر محل سرا میں پھیل گئی اور نماز تہجد کے لئے صفیں آراستہ ہونے لگیں......

امین جالندھری۔ سکونت، حیدر آباد (پاکستان)

جواب دینا بکاؤلی کا بذریعہ قدسی کوریئر سروس

برجیس زہرہ (بکاؤلی) کہانی

از طرف بکاؤلی

بزم سائنسی ادب

سلیم الزماں صدیقی سینٹر، گلشن اقبال۔ کراچی

کیا بود وباش پوچھو ہو جنت کے ساکنو
ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پکار کر
کراچی کہ اک شہر تھا عالم میں انتخاب
برباد جس کو اپنے ہی ہاتھوں سے کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

جناب قبلہ وکعبہ یکہ تازمیداں فصاحت وشہوار عرصہ بلاغت سخن گوئے شیریں کلام مصنف باغ وبہار۔ بزرگ من محترم ومکرم خلد آشیانی وجنت مکانی جناب میرامن دہلوی کی خدمت میں یہ ناکمترین درویشنی سلام عرض کرنے کی جسارت کرتی ہے۔

مراسلہ طویل پاکر طائر دل کیا کہوں کہ کیسا خوشی سے باغ باغ ہوا اور عالم سرشاری میں ایسا چہکا کہ بارے اندیشہ ہوا کہ پنجرہ قلب توڑ کے کہیں سوئے عدم پرواز نہ کر جائے۔ اے بزرگ ودانا وصاحب قلم پر اس فقیرنی کو ایک امر پہ تعجب اور اہل کراچی کی بابت رائے جان ملال از حد ہوا کہ ایسے جوہر شناس واہل کمال کی نگاہ سے کراچی جیسا بے مثل شہر کیونکر او جھل رہا کہ یہ شہر اہل ہند کے ماتھے کا جھومر اور مملکت خداداد کا عروس البلاد کہلاوے ہے جزیرہ عرب کے کنارے آباد یہ در آبدار جس کے "مرد ہشیار وزن طرحدار اور موسم بے اعتبار" ایک عالم میں مشہور ہے۔ خوبی اس شہر کی ایسی کہ اصفہان نصف جہاں اپنے تمام حسن وخوبی کے باوجود اس کے مقابلے سے عاجز ہے کہ دل اس شہر کا ایسا کشادہ اور مہمان نواز ہے کہ چاروں عالم سے جو کوئی غریب الوطن اس کی سرحد میں داخل ہو جاوے ہے مثل مادر مہربان یہ اسے اپنی آغوش میں چھپا رزق کے دروازے اس پر واکر دیوے ہے۔ اے بزرگ اس بستی کے زن ومرد کی بولی ٹھولی پر تمسخر کرنا موجب دانائی نہیں اس واسطے کہ دوشیزہ اردو اور عشاق اردو کفار وفرنگ کے ہاتھوں جب دہلی ولکھنوسے دربدر

ہوئے تو ان ہی غریب ماہی گیروں نے ان کو سہارا دیا اور ہنوز مقتدرہ، اردو اکیڈمی وانجمن ترقی اردو کے ذریعہ اس دوشیزہ کی مثل عروس بناؤ سنگھار میں مصروف ردوے ہیں۔

قائد اعظم کی خدمت میں عرض ہے کہ ''مملکت خداداد'' پہ ان دنوں ''پھول'' اور کراچی پہ چاند کا گمان ہو گذرے ہے۔ اول الذکر کی تشریح سے یہ قلم بہ بنائے مصلحت معذور ہے۔ دوئم کا ماجرا یہ ہے کہ جگہ جگہ سے کھدا پڑا ہے۔ اور بالکل مثل چاند نظر آوے ہے۔ اس واسطے اہل کراچی آج کل چاند میری زمین پھول میرا وطن'' کا ترانہ بڑے ذوق و شوق سے گنگناویں ہیں۔

محسن قوم بابائے سرسید کی خدمت میں بعد سلام عرض ہے کہ تعلیم کا بول بالا ہے اور جس طرح برسات کے بعد خود رو گھاس بے طرح اگ جاوے ہے اسی طرح یونیورسٹی، کالج، اسکول مرکز درس و تدریس کی ایسی کثرت ہے کہ طالب علم کم اور درس گاہیں زیادہ ہیں۔ اس واسطے کئی درسگاہوں کو واسطے طالب علم کی قرعہ اندازی کرنی پڑے ہے۔ درسگاہوں کی عمارتیں چونکہ خالی بلند و بالا ہیں اس واسطے معیار تعلیم بھی بہت بلند ہے۔ بچہ بچہ فر فر انگریزی بولے ہے اور غیر ملکی اداکاروں وانگریزی فلم بارود ی اسلحہ کی بابت ایسی معلومات رکھے ہے کہ عقل دنگ اور دماغ پریشان ہو جاوے ہے ہاں البتہ کوہ ندا کی خبر کی طرح یہ اسرار ہر کسو کی سمجھ سے باہر ہے کہ شرح خواندگی کی سات فیصد سے کیونکر ہنوز نہ بڑھنے پاوے ہے۔

حکیم امت علامہ اقبال جنت مکانی کے شاہین کو دیکھنے کا اس درویشنیی کو شوق بے حد تھا پر شنید ہی تھی کہ نسل اس پرندہ کی معدوم ہے۔ پر خوش قسمتی سے پچھلے سال بتاریخ ۲۸ مئی چاغی کے پہاڑی پر اسے دیکھنے کا شرف طرف قدرت سے میسر ہوا۔ ہر چند کہ اس میں پرندوں والی کوئی خصوصیات نہ تھی اور شکل و شباہت بھی آدم زاد جیسی تھی، تام بھی خلق خدا ڈاکٹر عبد القدیر بتاوے تھے۔ پر اہل دانا و بینا نے بتایا کہ یہی شاہین ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

متردد آپکا باغ و بہار کی نسبت جا ہے کہ مجھ سے کم علم کی کیا مجال کہ ایسے حاکیان حکایت۔ شاہد دلربائے حسن اور شیریں ادائے افسانیائے کہن کو سائنسی ادب کے قالب میں ڈھال بزبان اردو زیور نثر سے مثل عروس مرصع کروں۔ اور کوزے کو دریا میں بند کروں۔ پر اے عزیز تیرگی بڑھ جاوے ہے تو کونے کے جائے دیا روشن کرانا ہی تقاضے دانائی ہے۔ مجبوراً علم و ادب کے اس کوچہ میں تجھ سے صاحب کمال کی ارزانی کے سبب اس عاجز کو قلم اٹھانا پڑتا کہ خلق خدا کی بھلائی کے واسطے جو مقدور ہو لکھ سکوں اسلوب اس داستان دلپذیر کا اس واسطے اختیار کیا کہ باغ و بہار کی مانند ہر دل میں میرا پیغام محبت اتر جائے۔ بارے سائنسی ادب کا بیاں ہو جائے۔

راویان راوی اور حاکیان حکایت بیان کرتے ہیں آدم خاکی کو مبدا فیاض نے حواس خمسہ کا ارتکاز قوت ناطقہ کا امتیاز۔ ادراک و شعور کا اعجاز عطا کر کے جب احسن تقویم کے درجہ پر فائز کیا اور منصب خلافت کا پروانہ دے کر واسطے نیابت کے اس کرہ عرض پر مامور کیا تو تسخیر کائنات اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے واسطے عقل کی مشعل اور علوم ارضی کے آلات حرب سے لیس کر دیا۔ اہل نقد و خبر کے نقطہ نظر سے علوم ارضی کی اصطلاحی اور اجمال تین اقسام ہیں۔ علم حصولی علم حضوری اور علم دنی۔ انسان کا شرف بھی یہی ہے کہ اسے ماورائے ہستی خالق کائنات کی نیابت حاصل ہے اور وہ نیابت کے علوم سے واقف ہے اسے تخلیق کائنات میں خالق کائنات کے تفویض کردہ اختیارات حاصل ہیں۔

خلیفہ الارض تہذیب ارتقا کے پیشوا نے جب زمین پر قدم رکھا تو شمع زندگی روشن ہو گئی اور ہر ذرہ خاک اس سے منور ہوا۔ پر ابلیس کے تکبر نفرت اور حسد جس کا خمیر پیکر خاکی کے اس رتبہ جلیل سے رشک و حسد کا شکار اور آمادہ فساد ہوا۔ اپنے مقصد کی بر آوری کے واسطے اولاد آدم کے ایک فرد "قابیل" کو اپنا ہمنوا بنا شمع زندگی کو گل کر دینے کے درپے ہوا۔ تس پر اولاد آدم کے دوسرے گروہ کے جس کا سردار "ہابیل" علم حضوری کی نور سے معمور تھا ابلیس ملعون سے برسرپیکار ہوا اور اپنی جان آفریں کے سپرد کر کے مرتبہ شہادت پر سرفراز ہوا۔ یہ گروہ آدم اہل شہادت کے نام سے پکارا گیا اور از آدم تا ایں دم شمع زندگی اسی گروہ کے خون سے روشن ہے۔ یہ گروہ کبھی ہابیل کے نام سے کبھی حسین کے نام سے اپنے آپ کو زمانے سے منواتا رہا۔

اب فرائض منصبی کی ادائیگی کا مرحلہ آیا تو پتہ چلا کہ یہ کرہ ارض تو محض بادہ و خاک و آتش کا جہاں ہے۔ بے رنگ بے رونق بے آب و گیاہ۔ نہ پھول کھلے نہ پات ہرے نہ یار نہ کوئے یار نہ گھر نہ بیابان۔ شعور نے انگڑائی لی۔ وطن کے آسائش کی یاد ہوک بن کر دل میں اٹھی تو عقل نے اکسایا کہ اس بادہ خاک و آتش کو جنت گم گشتہ کا نعم البدل بنایا جائے۔ سو ایک گروہ نے علم حصولی کی ایک شاخ پر میوہ کو جسے اب سائنس کہا جاوے ہے بطور تیشہ اٹھایا اور فرہاد کی طرح "تو شب آفریدی چراغ آفریدم بیان و کہسار و راغ آفریدی خیابان گلزار باغ آفریدم۔ من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم۔ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم" کا نعرہ بلند کر کے ایجاد و دریافت کے بحر بیکراں میں کود پڑا اس گروہ کے افراد صلہ و ستائش سے بے نیاز بس ایک ہی دھن میں مگن ہووے تھے کہ اس بے ڈھب دنیا کو ڈھب پر کیونکہ لایا جاوے۔ عقل کی روشنی۔ جستجو کی رفاقت اور علم حصولی کا تیشہ لے کر ان لوگوں نے کبھی چاند کو اپنے قدموں سے روندا کبھی قلب بیمار تک رسائی حاصل کی تو کبھی سمندروں کی گہرائی کو ناپا۔ اس گروہ انسانی نے اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے وقف کر کے زندگی کو توانائی بخشی اور تسخیر

کائنات کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا۔ تلاش جنت گم گشتہ میں سرگرداں یہ لوگ دنیا بھر کی مصیبتیں نقد جاں کے عوض خرید لیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ یاد رکھے جائیں گے۔ سو یہ گروہ اہل احسان کا کہلایا۔ اگر یہ گروہ نہ ہوتا تو یہ دنیا ہنوز غیر آباد رہتی ہے اور یہ نہ ہو تو مادرامیں ایک نئی دنیا کبھی آباد نہ ہو سکے۔

اے بزرگ من۔ اہل احسان کی کاوشوں کا نتیجے میں مادی آرام و آسائش کا حصول ممکن ہوا پر روح آدم ہنوز مضطرب رہی کہ رخ یار کی قربت جو جنت میں حاصل تھی وہ یہاں ہنوز میسر نہ تھی۔ کان جس نغمہ سرمدی کے عادی تھے اس دنیا کی فضا اس سے عاری تھی سو پیکر خاکی یوں محو فغاں ہوا کہ

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے

نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

دل سے آہ نکلے تو پر نہیں پر طاقت پرواز رکھتی ہے۔ سو ہجر کے ماروں کی یہ آہ اوپر پہنچی رحمت حق جوش میں آئی اور ایک دوسرے گروہ کو اپنے نور سے منور کر کے خالق نے حکم دیا کہ مداوئی فراق کیا جاوے تس پر یہ گروہ روح آدم کی تسکین کے واسطے علم حصولی کی دوسری شاخ جسے اہل علم "ادب" کے نام سے پکارتے ہیں تمام کر یوں نغمہ سرا ہوا۔

جوں نور بصر تیرا تصور

تھا پیش نظر جدھر گئے ہم

اے بزرگ کچھ خبر ہے یہ کون لوگ تھے؟ یہ اہل جمال کا قافلہ تھا جس کے ذمہ تخلیق حسن کا کام تجویز ہوا۔ اہل جمال نے اپنی تحریر و تقریر شاعری و مصوری کے ذریعہ ہر ذرہ کائنات کو عارض محبوب کے عکس سے گلگوں کیا تاکہ روح انسانی سرشار ہو۔ اہل جمال کو حسن کی دولت طرف قدرت سے اس وافر مقدار میں عطا ہوئی کہ یہ نثر ہو شعر۔ نقش و نغمہ رنگ ہو کہ خشت و سنگ۔ یہ خون جگر سے اسے یوں تمام کرتے کہ جو نظر ان کی تخلیق کی جانب اٹھتی روشن ہو جاتی۔ ان کی ذات میں چونکہ جمال یار کا حسن مستور ہوتا سو پرتو رخ یار کے باعث خود ان پر بھی جو نظر اٹھتی وہ منور ہو جاتی اور انسانی معاشرے میں بدی اور بدنمائیکو پھلنے پھولنے

کا موقع نہیں ملتا۔

اے عزیز حاصل کلام اس تمہید طولانی کا یہ تھا کہ یہ جو کرہ ارض اب مثل جنت نظر آوے ہے اس میں اوپر بیان کیے گئے تینوں گروہ کا اشتراک شامل رہا۔ کہ ایک نے شمع زندگی کو روشن رکھنے میں جان دی۔ دوسرے نے زندگی کو وقف کر کے اس کی روشنی کو پھیلایا اور تیسرے نے اپنی تحریر اور شاعری سے اسے توانائی بخشی۔ اہل جمال نے اہل احسان کا ہاتھ تھاما اور تلاش حقیقت کیجانب محو سفر ہوئے تو راست اور طریقہ بے شک جدا سہی پر منزل دونوں کی ایک تھی اور جذبہ دونوں کا صادق تھا۔ بزم جہاں کی تمام و کمال رنگینی و رعنائی شیرنی و شعریت نور و نکہت تابانی و توانائی۔ دلربائی و دلکشی آرام و آسائش تزئین و ترتیب اور نظم و نسق اسی اشتراک باہمی کا استعارہ ہے۔

اہل احسان نے علم ہندسہ اور علم تعمیرات جیومیٹری علم ریاضی پر دسترس حاصل کیا تو اہل جمال نے ان علوم کو استعمال کرنے محبت کے الوہی جذبے کو تاج محل کے قالب میں ڈھال کر پیشانی گیتی پر جھومر کی طرح ٹانک دیا۔ جمنا کے کنارے جھلملاتا تاج دیکھ اہل حسن رمز محبت سے آشنا ہو کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ۔

کوہ قاف کا جوڑا ہے کہ سر جوڑے کھڑا ہے

مرمر کا پیالہ ہے کہ اوندھا سا پڑا ہے

اہل احسان نے ہوا میں چھپے آواز کی لہروں کو تسخیر کر کے خشک نئے میں مقید کیا تو اہل جمال نے الفاظ کے موتی ہوا میں بکھرے سروں میں پرو کر جب اس خشک ٹکرائے میں پھونک ماری تو ایسا نغمہ الوہی فضا میں بکھرا کہ جسے سن کر قدسیوں کو وجد آیا تو مہ انجم سہم گئے کہ "یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ جائے"

اے بزرگ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اہل احسن اور اہل جمال کے مابین اشتراک عمل رہا زندگی کے ترنم تعطر تیقن تدبر تعقل اور تقدس میں گراں قدر اضافہ ہوتا رہا نیز حیات و کائنات اور خالق کائنات کے فطری مقدس رشتوں میں توازن ترتیب تنظیم تزئین تعمیر اور تسکین کی ابدی راہیں استوار ہوتی رہیں۔

خوب سے خوب تر کی جستجو نے علم حصولی کی بہت سی شاخوں مثلاً علم طبعیات، کیمیا، حیاتیات، نباتیات تک رسائی حاصل کی اور حقیقت عقلیہ نے ان علوم کی مدد سے قوانین فطرت اشیاء کی ماہیت اور حیات پر اس کے اثرات کو منطق مشاہدہ اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر زندگی کو مائل بالارتقاء کر دیا۔ اثر اس تبدیلی کا اہل جمال پر بے حد پڑا کہ بصیرت بصارت وجدان اور حسن لطیف کی دولت انھیں طرف قدرت بے انتہا حاصل ہوتی ہے سو ادیب و شاعر کی ذات جب ایجاد و دریافت کے مدوجزر کے سبب خارجی محرکات سے روشناس

ہوئی تو اس کی داخلی دنیا میں بھی ہیجان برپا ہوا۔ پھر یہ عمل رد عمل کی صورت اختیار کی صورت کر کے تجسیم کے مراحل سے گزرتا حسن ولطافت سے مرصع ہو کر ایک ایسی تخلیق کی صورت نمودار ہوا جس کی حیثیت ایک الاؤ کی سی تھی کہ جو نہ صرف چاروں طرف روشنی بکھیرنے کے قابل تھی بلکہ دور دور تک اپنے شعلہ نشاں وجود سے احساس دلانے کا جوہر بھی رکھتی تھی۔ اے مہربان من۔ یہ تخلیق آفاقی ادب کے نام سے منسوب ہوئی جس کے واسطے ارباب حدو عقل نے تین مقاصد مقرر کیے ہیں۔ حسن خیر وصداقت کا پرچار۔

اے بزرگ ساکن جنت۔ اب اس تعارف کے بعد اجازت ہووے تو کچھ عرض سائنسی ادب کی بابت کروں کہ۔ اہل جمال اور اہل احسان کے اشتراک کے باعث آفاقی ادب کا وجود ممکن ہوا اور تسخیر کائنات کے واسطے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھا تو عظمت انسانی اپنے عروج پہ پہنچی۔ اور انسانی معاشرہ ایجادو دریافت کے ذریعہ جہاں مادی آسائشوں سے مائل بہ ترقی ہوا وہیں جامی قدسی سعدی، حافظ، جان پوپ، شیکسپیر ملٹن شیلی جیسے ان گنت اہل جمال کی تخلیقی کاوشوں سے منور ہو ہو کر روحانی سکون سے آشنا ہوا۔ اس واسطے جب تک آفاقی ادب کا بول بالا رہا بدی اور بد نمائی کو معاشرے میں پھلنے پھولنے کا موقع کم ہی ملا۔

اس مرحلے پر ابلیس ایک بار پھر مائل بہ شر ہوا اور اس ملعون نے نابکار نے اپنا شکار اس بار اہل جمال اور اہل احسان کو بنایا۔

اہل احسان کو زر کے جھنکار میں الجھا کر اور یہ درس دے کر کہ "مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا" راہ حق سے بھٹکا دیا تو دوسری طرف اہل جمال کو بنت عنب کے زلف گرہ گیر کا اسیر کر کے جنس کے کھلونے سے بہلا کر ایسا مدہوش کیا کہ عقل وخرد سے بیگانہ ہو کر یہ عظیم گروہ انسانی کبھی بیٹھا "رگ گل سے بلبل کے پر باندھتا تھا تو کبھی اشتراکی ادب، رومانی ادب، ہیجانی ادب اور ترقی پسند ادب کا نعرہ انقلاب بلند کر کے آپس میں باہم متصادم ہوا۔ اول الذکر گروہ انسانی نے فلاح نوع بشر کے عظیم مقاصد کو ترک کر کے زرو طاقت کے حصول کے لیے علم حصولی کو ذاتی مفاد اور استحصال کا ذریعہ بنایا، یوں کبھی لمحوں میں فردوس نما شہر جہنم زار بنے تو کبھی عروس گیتی کے ماتھے سے اوزون کی ردا کھینچی اور کبھی اس کے آنچل سے رنگ و نکہت معدوم ہوئے۔ آخر الذکر کے حواس پر بنت عنب اور بنت حوا ایسی سوار ہوئی کہ وہ ادب جو کبھی آفاقی تھا روح انسانی کے واسطے شراب طہور فعل انجام دے رہا تھا، جسے سن کر مہ وانجم کانپتے تھے اور قدسیوں کو وجد آتا تھا ابلیس ملعون کے ہاتھوں ایسا پست ہوا کہ "ٹھنڈا گوشت" سے شکم سیر ہو نہ جانے کس کس کی "اترن" اور "کالی شلوار" پہن مستی اور کاہلی کی سردی سے ٹھٹھرتا "لحاف" اوڑھے بمبئی کی متعفن کھولیوں میں اوندھے منہ پڑا جمود کا شکار ہوا۔

اے مہربان من۔ عقل کی بات کہا جاوے ہے کہ یہ عیار ہے سو بھیس بدلے ہے۔ یہ تو خود بھی بھٹکے ہے اور دوسروں کو بھٹکاوے ہے۔ سو دشمن ازل کے ہاتھوں دونوں گروہوں کو عقل نے "میں" کی لعنت سے دوچار ایک کو دوسرے سے یوں متنفر کیا کہ دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو کر یوں دور بھاگتے ہیں جیسے رات دن سے بھاگتی ہے۔

اے مہربان من۔ آج اہل گیتی ان دونوں گروہوں کے مابین ہونے والے تفرقہ کے باعث طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہیں۔ اس بادہ خاک و آتش کو جنت کا نعم البدل بنانے والے پیکر خاکی کے ہاتھوں یہ دنیا بھوک قحط افلاس ایڈز کینسر جیسی لا علاج بیماری ونشیات کی لعنت اور استحالی قوتوں کی چھینا جھپٹی جیسے عذاب سے دو چار ہو کر ایسی بد نما ہو گئی کہ انسان تو کیا فرشتے بھی اسے دیکھ کر اشکبار ہو جاتے ہوویں گے۔ اہل جمال کی سستی و کاہلی کا یہ حال ہے کہ بجائے نغمہ الوہی سے شر کی قوتوں کو شکست دے خود بھی بیزار ہو کر بیٹھ گیا ہے۔
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے

اے بزرگ ساکن جنت۔ اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ اہل جمال اور اہل احسان کو ابلیس ملعون کے شر سے نجات دلانے اور دونوں کے مابین حائل فاصلوں کو مٹا کر ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے واسطے ایک ایسی تحریک شروع کیا جاوے جس کے ذریعے ایسے افراد جو علم و حصولی کی دونوں شاخوں سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں میدان عمل میں آویں اور علوم عقلیہ کو شعور و وجدان اور حسن جمال سے آراستہ کر کے ایسی تخلیق کی بنیاد ڈالیں جو آفاقی ادب کی شرائط پر بھی پورا نہ اترے اور ذہن پر طاری جمود کو مٹا کر دل کو عشق حقیقی سے بھی آشنا کر سکے۔ کہ دل جب تک محبوب حقیقی کے جمال سے روشن نہ ہو سجدہ و قیام جیسی کیفیت حضوری میں بھی انسان تہی دامن ہی رہتا ہے۔ بقول درویش اقبال جنتی۔

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

سو ایسی تخلیق کو "سائنسی ادب" کا نام دیا گیا۔ یہ ادب اپنے اندر قوت پیدا کرنے کے لیے حقیقت عقلیہ کا محتاج بھی ہے اور حسن و جمال کا طلب گار بھی۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ حقیقت ہمیشہ لباس مجاز میں جلوہ ہو کر قبول عام کی سند پاتی ہے۔ اس ادب کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی رجحان کو اسلامی انداز فکر کی روشنی میں حسن بیان کی خوبی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عام کیا جاوے اور کائنات کی تمام اشیاء مناظر کی حقیقت دریافت کیا جاوے تاکہ خالق کائنات کے خلیفہ کی حیثیت سے کائنات پر غلبہ حاصل ہو اور سسکتی انسانیت کو ابلیس کے چنگل سے نجات ملے۔ خلیفہ الارض ہونے کی حیثیت سے کائنات پر انسان کی برتری ایک عطیہ خداوندی ہے جس کا شکر ادا کرنے کی یہی صورت ہے کہ وہ عملی طور پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور علوم ارضی

کی تینوں شاخوں سے اپنا رشتہ استوار کرے۔ اس صنف ادب کی یہ ذمہ داری ہے کہ افادیت اور لطافت کو مدغم کرے کیونکہ ایسی ہی تخلیق ہر شخص کی پسندیدگی حاصل کروے دے ہے جو قاری کو خوشی کے ساتھ تعلیم بھی دیتا ہو۔ سو قصہ مختصر سائنسی ادب صرف اور صرف شہود و شاہد و مشہود کی تدریجی وارتقائی عمل و ارتباط کے منازل و مراحل رنگینی و سنگینی نرمی و گرمی دل سازی و دل سوزی کے تجربات وواقعات معمولات و محرکات کی موزوں مناسب جامع بلیغ برجستہ و بے ساختہ عکاسی کا نام ہے۔ آگے آپ کی مرضی کہ جو چاہے حسن کرشمہ ساز کرے۔

سائنسی ادب پہ چیں جبیں ہونے والوں کی خدمت میں اتنا عرض ہے کہ وہ یہ بھول جاوے ہیں کہ قوانین طلوع و غروب کا علم ایک فطری عالم کے مطالعہ جمال کو ناقص نہیں کرتا تاوقتیکہ ابلیس کے بچھائے ہوئے دام "میں" میں الجھ کر وہ اپنی حس لطافت نہ کھو بیٹھے۔ اور نظارہ جمال کی خوشبوؤں سے منہ موڑ کر ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر اپنی تمام تر توجہ قوانین کائنات کی طرف منعطف نہ کر دے۔

اے بزرگ من امید واثق ہے کہ اس وضاحت طویل سے عطش جستجو سیراب ہو گئی ہو گی اور کاخ طوبٰی کی رنگینی اور حواران خلد کی دلبستگی سے جی خوش ہو رہا ہو گا۔ باری تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ساکنان جنت کے درجات مذید بلند کرے اور مجھے بھی ان کی صحبت کے فیوض سے مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں تمام اہل جنت کی خدمت میں درویشنی کا سلام پہنچے۔ اس عرض کے ساتھ کے آداب بڑوں کو اور چھوٹوں کو دعا کہنا۔ درویشنی اجازت کی طلبگار ہے۔

خیر اندیش طالب دعائے خیر
درویشنی۔ کراچی۔ اکاڈمی

بر جیس زہرہ: سکونت، کراچی (پاکستان)

تنقید کی ایک سفلی مثال

......"پروفیسر مرزا حامد بیگ ابھی تک اردو ادب میں اپنا نقش قائم نہیں کر سکے...... ان کی تنقید مانگے تانگے کی ہے...... ادھر اُدھر سے مضامین مرتب کر کے نیچے اپنا نام لکھنے کو تحقیق نہیں کہا جا سکتا...... ہم سنی سنائی باتوں یا فوٹو کاپیوں سے کام چلاتے ہیں...... یہ اپنے آپ کو ایک جید پروفیسر ثابت کرنے کا جلہ ہے...... آج کل اتنی ناقص اور اسفل قسم کی تنقید کیوں لکھی جا رہی ہے؟"

......رسالہ دانشور شمارہ ۳۰۵ لاہور کے ایک مضمون سے اقتباس مرتب انیس ناگی

سایۂ دیوار

سحر علی

کہانی

مجھے گم ہوئے تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں۔ میں اپنی تلاش میں اس شہر کی ہر گلی، ہر رستہ، ہر نکڑ دیکھ چکا ہوں۔ مگر کہیں مجھے اپنا پتہ نہیں مل پا رہا ہے..... اس ہجومِ بے کراں میں کسی تنکے کی مانند اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ مگر خود کو پانے کی کوئی بن نہیں پڑ رہی۔ اب سوچتا ہوں ماں ٹھیک کہتی تھی..... بیٹا تو اس شہر میں جا کر گم نہ ہو جائے..... اپنا دھیان رکھنا مگر میں کیا کروں کہ میرا دھیان کسی شریر بچے کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر کے منظروں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ میں اب تقریباً مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب چکا ہوں۔

بی۔ اے کر کے آنکھوں میں اچھے مستقبل کا خواب لئے اپنی ماں کو بہ مشکل رضامند کر کے میں یہاں آیا تھا۔ لیکن اس شہر کی بے رخی اور بے اعتنائی نے میری ساری امنگوں پہ پانی پھیر دیا دور، دور تک اجنبیت کی اڑتی ہوئی دھول اور رات کو طویل بے خوابی کا سلسلہ..... زندگی کا کوئی سرا ہاتھ آنے کا نام نہیں لیتا۔ میں جن کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں وہ لوگ میری ماں کے دور پرے کے رشتہ دار ہیں۔ مگر رشتہ دار بھی ایسے جیسے خود سے بھی بے زار..... وہ تسلی کے دو بول بھی مجھ سے شائد اس لئے نہیں کہتے کہ کہیں میں ان کے در پہ نہ پڑا رہ جاؤں۔ میں صرف رات کو ان کے گھر رہنے کا گناہ گار ہوں۔ صبح ہوتے ہی نئے سرے سے خود کو جتانے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ بے یقینی اور بے یقینی کے گھٹتے بڑھتے سائے مجھے دن بھر اپنے اشارے پہ نچائے رکھتے ہیں۔ کبھی ایسے لگتا ہے کہ ان لمبے اور طویل راستوں پہ چلتے چلتے کسی دن کسی موڑ پر کسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑوں گا یا اس خاک پہ چلتے چلتے خاک ہو جاؤں گا۔ رات گئے جب تھک کر کسی فٹ پاتھ پہ بیٹھتا ہوں تو ناگن جیسی سیاہ اور لمبی سڑکیں ڈرانے لگتی ہیں، ایسا لگتا ہے تھوڑی دیر اور بیٹھا تو یہ مجھے ڈس لیں گی۔ پھر بے دلی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور آتی جاتی گاڑیوں کے اژدھام سے بچتا ہوا ٹھکانے کی طرف لوٹتا ہوں۔

ماں کا خط آتا ہے۔ جواب میں میں بھی خط لکھتا ہوں ماں کو بہت امید، بہت خواب دکھاتا ہوں اچھے دنوں کے۔ میں اتنی بار یہ سب کچھ لکھ چکا ہوں کہ مجھے لگتا ہے کہ ماں کو ازبر ہو چکی ہوں گی میری ساری باتیں مگر میری ماں بھی صبر و تحمل کا چٹان ہے۔ نہ گھبراتی نہ ناامید ہوتی ہے بلکہ ہر بار مجھے دعائیں لکھتی ہے اور کہتی ہمت سے کام لے منزل تیرے آس پاس ہے۔ ماں کا خط پڑھ کر میں گھنٹوں آس پاس دیکھتا رہتا ہوں مگر سوائے اندھیروں کے اور کچھ نہیں دیکھتا۔

ایک گہری اندھیری رات کو جب میں اپنے رشتہ داروں کے گھر لوٹا تو دروازہ کھولنے والی خالہ بی بی کے چہرے سے آنکھیں مٹی ہوئی تھیں ...... وہ آہستگی سے دوازہ کھول کر جا چکی تھیں اور میں ان کی مٹی ہوئی آنکھوں کو حیران پریشان سے چاروں طرف ڈھونڈ تا رہا۔ رات عجیب کشش و پنج میں گذر گئی۔

دوسری صبح کے اُگنے والے سورج نے بھی وہی دیکھا جو شائد میں نے دیکھا اس شہر میں ہر شخص کے چہرے سے آنکھیں مٹ چکی تھیں۔ بہت کوششوں کے باوجود میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اس شہر میں پڑی اس افتاد نے مجھے عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں زمین پر ہوں یا خلا میں ..... یا مٹی ہوئی آنکھوں والے لوگ اسی شہر کے ہیں یا کسی اور دنیا کی مخلوق۔ عذاب میں مبتلا یہ لوگ چہرے کے ہر تاثر سے خالی ہیں یہ لوگ معمول کے کام اسی طرح انجام دے رہے ہیں۔ ادھر سے اُدھر تیزی آتے جاتے لوگ۔ آگے سے آگے جانے کی کوشش میں سرگرداں لوگوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے انہیں بہت جلدی ہے۔ اس بھیڑ میں میرے وجود کے ہلکے پن نے مجھے بتایا کہ شائد کہیں نہیں ہوں یا پھر خلا میں ہوں ..... یا آسمان اور زمین کے بیچ جو خلا ہے وہی میری قسمت ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھے لگا کہ میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر بنا آنکھوں والے کسی آدمی کے قدموں پہ گر پڑوں گا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اس تناؤ سے بچنے کے لئے میں نے سامنے لگے درخت کے ہرے بھرے پتوں کو دیکھنے لگا۔ مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے سارا درخت پتوں سے خالی ہو جاتا ہے۔ اب تو امید کی آخری کرن بھی ڈوب گئی ہے، شناسائی کی، اب میری اجنبیت بالکل مستند ہو گئی ہے۔ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اب میرے چہرے پر بھی آنکھون کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں عاجز آ چکا ہوں زندگی کے اس منظر سے میں اپنی آنکھیں خود ہی پھوڑنے کے لئے جو پتھر اٹھاتا ہوں وہ بے وزن ہے ...... جس شہر میں آنکھیں پھوڑنے کے لئے پتھر تک نہیں اس شہر میں کتنے اہتمام سے آیا تھا۔

تیز دھوپ میں سایہ ڈھونڈتا ہوا میں ٹوٹی ہوئی دیوار کے سائے میں لیٹ گیا مگر یہاں بھی سورج میرے تعاقب میں عین میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھے اس سے بچنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک ہجوم نے گھیر لیا ان سب کے چہروں سے آنکھیں مٹی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کے ہاتھ تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے میرے جسم اور چہرے کو ٹٹولتے ہوئے ان کے ہاتھ مجھے سانپ بچھوؤں کے طرح لگ رہے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے میری آنکھیں مانگ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میں کچھ اور دیر رک گیا تو میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گ۔ راہِ فرار نہ پا کر اپنی دونوں آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ بالکل اس کبوتر کی طرح جو بلی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پھر ایک دم جیسے کی

نے میری انگلی مظبوطی سے تھام لی...... میں سمجھا شائد ماں آگئی ہے۔ آنکھ کھولی تو میں ایک درخت کے سائے میں کھڑا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے کالی چادر میں لپٹی دو حسین سیاہ آنکھوں والی نوجوان لڑکی کھڑی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت خوشی اور استعجاب سے دیکھا۔ اس نے لب کھولے میرا نام سارا ہے، اس کی آواز سے ہواؤں میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگی۔

اب تم بالکل محفوظ ہو۔ وہ میری گھبراہٹ کو پا گئی تھی میں اس شہر میں گم ہو گیا تھا سارا۔ ہاں میں جانتی ہوں مگر آج تم خود کو مل گئے ہو...... اس کے لہجے کے یقین نے مجھے ڈھارس دی۔ اچھا میں چلتی ہو اس نے شام کی گہرے ہوتے ہوئے سائے کو دیکھتے ہوئے کہا اور جانے کے لئے قدم بڑھائے میں نے سارہ کا آنچل پکڑتے ہوئے کہا "سارا کیا تم میرے ساتھ نہیں چل سکتی؟"

سارہ کے دمکتے ہوئے چہرے پہ پھیلتی ہوئی مسکراہٹ نے مجھے یکلخت تیز دھوپ سے ٹھنڈی چھاوں میں لا کھڑا کیا۔ سارا کے ساتھ نے زندگی کو بہت آسان کر دیا۔

آج پورے پانچ ماہ بعد میں ماں کو خط لکھنے بیٹھا ہوں اس دوران ماں کے دو خط آچکے ہیں......

پیاری ماں

تو نے بالکل ٹھیک کہا تھا ماں کہ میں اس شہر میں آکر گم ہو جاؤں گا...... واقعی ماں یہ شہر انسانوں کا جنگل ہے اس شہر کی بھول بھلیوں میں اپنی ذات کا پتہ نہیں ملتا۔ میں بھی ایک بھیڑ میں پھنس گیا تھا۔ لیکن کسی نے میری انگلی تھام لی...... بالکل ویسے ہی ماں جیسے تم تھام لیا کرتی تھی بچپن میں۔ ماں وہ سارا تھی جس نے مجھے، تیرے بیٹے کو تلاش کیا۔ ماں کچھ پیسے اور تیرے لئے، سارا کا سلام بھیج رہا ہوں۔

تیرا بیٹا

احسن

ماں کو خط بھیج کر گہری طمانیت کا احساس ہوا۔ دل کے اندر اترتے ہوئے سکون کا بیان لکھا نہیں جا سکتا۔ ابھی میں اس اطمینان میں ڈوبا آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا ہی تھا کہ سارا کی مانوس خوشبوؤں نے گھیر لیا میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا گلابی سوٹ میں مسکی ہوئی سارا کھڑی تھی۔ احسن سمندر پہ چلیں۔ اس وقت میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ شام ہو رہی ہے۔ ہاں مگر اس وقت ہی چلیں۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا میں جانتا ہوں سارا کسی بھی وقت حیران کر سکتی ہے یہ اس کا مزاج ہے۔

اس وقت ساحل کا سارا منظر شفق رنگ ہو رہا تھا۔ سورج ڈوبنے کی اجازت چاہتا تھا۔ میں سمندر کو غور سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے...... لیکن سارا سمندر سے بہت کھیلتی ہے۔ کبھی وہ لہروں

سے کھیلتی کھیلتی اتنا آگے جا نکلتی کہ مجھے لگتا کہ اب سارا نہ لوٹ سکے گی۔ مگر پھر وہ ہنستی مسکراتی کسی لہر سے کھیلتی آنکلتی پھر جیسے میری جان میں جان آجاتی۔ آؤنا احسن...... سارا مجھے بلا رہی تھی مگر میں خود کو بھگونا نہیں چاہتا پھر وہ خود ہی لوٹ آئی لاؤ احسن آج مجھے اپنا سارا دکھ ساری بے رنگی اور سارا خوف دے دو میں اسے اس سمندر کو دے دوں گی سمندر اسے اپنے دل میں ہمیشہ کے لئے اتار لے گا۔ لاؤ دو وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ میں مسکرا دیا اور اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا یہ لو...... سارا نے اپنی بند مٹھی کو آتی ہوئی لہروں میں کھول دیا ٹھیک اس لمحے سورج بھی سمندر میں اتر گیا۔ سارا نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا آؤ اب واپس چلیں۔

کئی دن اور بیت گئے آج شام کو لوٹا تو سارا نے ماں کا خط دیا۔

ڈھیر ساری دعائیں اور پیار

تیرا خط ملا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور یہ جان کر اور زیادہ کہ تو خوش ہے۔

یہ تو نے کیا لکھا کہ تو گم ہو گیا تھا...... تجھے یاد نہیں کہ میں تیرے گم ہونے کے ڈر سے آج تک نہیں نکل سکی ہوں میں ہمیشہ تیری چھوٹی سی انگلی اپنی انگلی سے جوڑے رکھتی تھیں کیونکہ نہیں معلوم کہ کونسی بے خیالی میں میں نے کس پل تیرے باپ کو کھو دیا۔ وہ ایک شام لوٹ آنے کا کہہ کر آج تک نہ لوٹا۔ اس وقت تو بہت چھوٹا تھا۔ لوگ کہتے تھے جانے والے کا انتظار نہ کرو اور اپنی جوانی کو مٹی میں نہ ملاؤ لیکن میں جانتی تھی کہ میں جس مٹی میں اپنی جوانی ملا رہی ہوں وہ بہت زرخیز ہے اور اس کی زرخیزی میں چھاؤں ہی چھاؤں ہے۔ تجھے گم نہیں ہونا ہے بلکہ بہت کچھ پانا ہے۔ کیونکہ میرے دامن میں ایک ہی خواب ہے۔

تیرے لئے بہت دعا گو

تیری ماں

خط پڑھ کر میں آنسو آنسو ہو گیا اس پل میرا دل چاہا کہ اڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ سارا چائے لئے کھڑی تھی۔ بہت دکھی لگ رہے ہیں۔ ہاں میں نے ایک بے بسی کی ٹھنڈی آہ بھری۔ ماں یاد آرہی ہے۔ میں خط اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا خط پڑھ کر وہ بھی کچھ اداس سی ہو گئی۔ مگر سارہ زیادہ دیر اداس رہ نہیں سکتی تھوڑی دیر بعد کمرہ اس کی مختلف باتوں اور قہقہوں سے گونجنے لگا۔ پھر ہم دونوں باہر نکل گئے یونہی ٹہلنے کے لئے مجھے سارا کے ساتھ چلنا اچھا لگتا تھا ایسے ہی میں اکثر گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلا کرتا تھا ماں کے ساتھ اور اسے تنگ کرنے کے لئے کبھی آگے چلا جاتا اور کبھی پیچھے رہ جاتا۔ لیکن سارا کے ساتھ چلتے ہوئے ہمیشہ ہی پیچھے رہ جاتا ہوں۔ اس کی سیاہ اور پرکیف آنکھوں کی جنبش میں دل سمٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سارا

دیکھتی نہیں ہے ایسا لگتا ہے قطرہ قطرہ جذب کر رہی ہو۔ سارہ کی قربت میں زندگی گو کہ بہت خوبصورت گذر رہی تھی لیکن میرے اندر کبھی کبھی ماں کی ہوک اتنی تیز اٹھتی کے میں بے چین ہو اٹھتا...... اور خواہ مخواہ کمرے کی چیزوں کو بے بکھر کر رکھ دیتا۔ سارہ میری اس کیفیت کو بھی جانتی ہے سارا میرے مزاج کے سب موسموں سے آشنا ہے۔

دفتر سے لوٹا تو سارا قالین پہ آڑی لیٹی کتاب پڑھنے میں محو تھی مجھے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ تم منہ ہاتھ دھو میں کھانا لگاتی ہوں وہ اپنے کھلے بال سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی کھانا کھا کر میں بیٹھا ہی تھا کہ اس نے ماں کا خط لا کر دے دیا...... یہ لو ماں کا خط، خط دے کر وہ الماری کھول کر بیٹھ گئی کبھی کبھی وہ ترتیب سے رکھی ہوئی چیزوں کو بے ترتیب کر کے پھر ترتیب دیتی ہے اس وقت وہ پرانی ڈائیریوں، میرے دیئے ہوئے عید کارڈ، چوڑیاں اور دیگر تحائف میں گھری بیٹھی تھی۔ میں کمرے سے نکل کر باہر آ گیا اس وقت شائد مجھے تنہائی کی ضرورت تھی کچھ دور چل کر میں سڑک کے کنارے لگی لائٹ کے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے خط کھولا ماں کی مانوس خوشبو میرے اطراف میں پھیل گئی۔

پیارے بیٹے احسن

تمہارا خط اور پیسے دونوں مل گئے ہیں جمعرات کے دن تمہارے بابا کو خواب میں دیکھا کہ وہ دروازہ کھلا پا کر اندر آ گئے ہیں ملگجے سے کپڑے بڑھی ہوئی داڑھی، خاصے کمزور لگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے کہ رابعہ میں واپس آ گیا ہوں میں یہاں سے جا کر ایک ایسے شہر میں بھٹک گیا تھا جہاں لوگوں کے چہروں سے آنکھیں مٹی ہوئی تھیں۔ میں نے آنے کے لئے بہت جتن کئے مگر واپسی کی راہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود گم ہو گیا، اور پھر اپنی بھی آنکھیں گنوا بیٹھا۔ بہت دعاؤں کے بعد آنکھیں ملی ہیں تو لوٹا ہوں۔ احسن کہاں ہے۔ میں نے ان کے سوال کے جواب بھی نہ دے پائی کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔

میرے بیٹے مجھے لگ رہا ہے کہ تو بھی کسی ایسے ہی شہر میں جا بسا ہے۔ لوٹ آ اس پہلے کہ تیری آنکھیں بھی مٹ جائیں۔

تیری منتظر تیری ماں

خط پڑھ کر مجھے لگا کہ میرا دل زور زور سے ماں کی مٹھی میں دھڑک رہا ہے۔ میں ایک دم پسینے پسینے ہو گیا کچھ دیر یونہی بے مقصد سا گھومتا رہا پھر رات گئے لوٹا تو سارا بے خبر سو رہی تھی۔

میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ رات واپسی کا سوال لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر میں نے سارا کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں ماں کے پاس...... تو ناشتہ کرتی ہوئی سارا نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں نے اس سے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو...... میں اس کی آنکھوں کی حیرانی دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

سارا کی آنکھیں اب بھی مجھ پر اور میرے سوال پر مرکوز ہیں۔ قدرت نے سارہ کی آنکھوں میں اتنا حسن رکھا ہے کہ اب مجھے کہیں گم ہونے کا ڈر نہیں ہوتا سوائے سارہ کی آنکھوں کے۔ اس وقت یہ سچ ہے کہ میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ وہ بہت رسان سے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کرسی پہ بیٹھی تھی۔ "تو آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ جا رہے ہیں......"؟

"ماں کو میری ضرورت ہے سارا" میں دبی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا......

"ہاں مجھے معلوم ہے، تو تم انھیں کیوں نہیں بلا لیتے"۔

"وہ یہاں نہیں آئے گی سارا، میری ماں نے انتظار کے بیس سال اس آنگن کو دیئے ہیں۔ وہ آنگن وہ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ بابا کے قدموں کی آہٹ پر اپنی نیند کو جاگ رکھ کر سوتی ہے"۔

"جب تمہارے بابا بیس سال میں نہیں لوٹے تو اب کیا لوٹ گیں"۔ "میں جانتا ہوں مگر میں ماں کو نہیں سمجھا سکتا"۔ پھر جانے میں کیا کیا کہتا رہا کچھ دیر بعد کمرے کے ہلتے ہوئے پردے نے مجھے بتایا کہ سارا جا چکی ہے۔

دوسری شام گہری خاموشی تھی۔ گھر لوٹا تو سارا میرا سارا سامان، کپڑے، کتابیں اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر چیزیں میرے بیگ میں رکھ چکی تھی۔ اس وقت وہ نیلی ساڑھی میں میرے البم پر جھکی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو"۔ "تمہاری اور اپنی تصویریں اگر چاہو تو انہیں بھی لے جاؤ"۔

"نہیں! سارا میں یہاں سے کچھ بھی نہ لے جا پاؤں گا" میرا لہجہ ٹوٹنے لگا......

وہ میری طرف دیکھے بنا البم بند کرتی ہوئی صحن میں چلی آئی اس کے پیچھے میں بھی اس نے صحن میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا "تم بیٹھو احسن میں چائے بناتی ہوں"

چائے بناتی ہوئی سارا کا پلو ہی صرف میں یہاں سے دیکھ پا رہا تھا۔ میں جیسے خود سے بول اٹھا سارا کے آنچل میں واقعی زندگی مسکراتی ہے۔ سارا نے بہت تھوڑے سے وقت میں بہت سے پھول اس آنگن میں لگا لئے تھے۔ سارا چائے لے کے آگئی تھی۔ "یہ لو چائے پیو"۔

میں جیسے لوٹ آیا اطراف کے منظر سے۔

قدرے توقف..... کے بعد سارا بولی" تو تم جا رہے ہو"
سارا کے اس جملے سے میرے اندر پھر کچھ ٹوٹنے لگا۔
"ہاں سارا اماں بہت اکیلی ہے"۔
میرے ہر احساس کو چھو لینے والی سارا کا خوبصورت چہرہ اس وقت ہر تاثر سے عاری تھا۔
"وہ چائے ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس کا نیلا آنچل پکڑتے ہوئے کہا
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا سارا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو....."؟
مگر جانے کس پل بہت آہستگی سے میرے ہاتھ سے سارا کا آنچل نکل گیا۔
میرے کسی سوال کا جواب دیئے بغیر کمرے کی سمت جاتی ہوئی سارہ نے مڑ کر دیکھا تو!.....
تو میں نے دیکھا کہ سارا کے حسین چہرے سے آنکھیں مٹ چکی تھیں۔

سحر علی، سکونت کراچی (پاکستان)

اعزاز

"دل ایک بند کلی" اور کئی گراں قدر تصانیف کے مصنف

مقصود الٰہی شیخ کو دیارِ مغرب میں شایانِ شان اعزاز بخشا گیا

بھابھی ماں

ڈاکٹر شمیم انصاری　　　　　　　　　　کہانی

نہیں ماں نہیں ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔

بھابھی میری ماں ہے۔ ہاں ماں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا!

بیٹا! جانتی ہوں وہ آج بھابھی ہے پر کل جب اس کو تحفظ میں لے گا۔ اس سے نکاح کرلے گا تو وہ تیری بھابھی رہے گی نہ ماں۔

بیٹا کل وہ تیرے بچوں کی ماں ہوگی۔ ضد نہ کر میرے لعل میری بات مان لے۔ تیری خاطر ماں تو کیے تو میں اندھے کنوے میں چھلانگ لگادوں۔

ماں میرا جیون تو تیرا ہی دیا ہوا ہے۔ تیرے لیے تو میں آندھی طوفان سب سے لڑ سکتا ہوں۔ تیرے لیے میری ماں! تیرے لیے میں اپنے لہو کا آخری قطرہ بہا سکتا ہوں۔

تُو تو میری جنت ہے ماں۔ مجھ پر رحم کر!

میرا بیٹا۔ بہو کہاں جائے گی۔ عارف کس کے سہارے جیئے گا۔

ماں عارف میرے بھائی جیسا ہے۔ میرے بھائی کی نشانی۔ میں اس کا سہارا ہوں ماں ۔ بھابھی کیوں کہیں جائے گی۔ وہ یہیں رہے گی۔ بھائی نہیں رہا تو کیا ہوا میں جو ہوں۔ ہاں بیٹا۔ یہی تو میں کہتی ہوں اگر نواز نہیں رہا تو تُو اس کا ہاتھ تھام لے۔ اسے تیرے سہارے کی ضرورت ہے۔ نواز کا سوچ کر جنت بہت ہی دکھی ہو رہی تھی۔ بیٹا یہ دنیا اس کا اس گھر میں جینا دوبھر کردے گی۔ لوگ باتیں بنانے لگے ہیں۔

اس دھیمے لہجے میں کہہ ہی دیا۔

لوگوں کا کیا ہے ماں !! انہیں اور کام ہی کیا ہے۔ بھابھی میری ماں سمان ہے۔ کہنے دے دنیا کو۔

بیٹا! جنت رونے لگی۔

ماں تو سمجھتی کیوں نہیں۔ بھائی کی شادی پر تو میری مسلمانی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ماں جب میں نہا کر بنا پاجامہ کے باہر نکل آیا تھا تو بھابھی نے ہی تجھ کو بتایا تھا کہ امجد کی ایک گولی صحیح جگہ پر نہیں ہے۔ ہاں ماں۔ بھابھی ماں ہی کی وجہ سے تو میرا آپریشن ہوا تھا۔

امجد نے پیٹ کی نیچے آپریشن کی جگہ پر ہاتھ رکھا اور زمین بیٹھ گیا اسے لگا کہ جیسے اس کا ابھی ابھی آپریشن

ہوا ہے اور وہ درد سے کراہ رہا ہے۔ کاش اس وقت کوئی آ کر اس کو نشے کا انجیکشن لگا دے۔

دراصل جنت خود بھی اپنے بیٹے کی پندرہ بیس سال بڑی بہو سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ بہت مجبور تھی۔ ایک طرف دنیا تھی اور دوسری طرف خود اس کے سسرال والے۔

نواز کی شادی پر بھی جنت کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ نواز کے بے حد اصرار پر بڑی مشکلوں سے یہ شادی ہوئی تھی۔ خاندان سے باہر شادی ریشماں والوں کے یہاں ہوتی ہی نہیں تھی۔ ریشماں کی شادی پر اس کا اپنوں سے ناطہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا تھا۔ یہی اس کے خاندان کی ریت تھی۔

ریشماں نواز کو کل کائنات تصور کرتی تھی دس سال تک اس کے آنگن میں کوئی پھول نہ کھلا تب بھی نواز کے پیار میں کمی آئی نہ ہی جنت نے کبھی اس کو احساس دلایا۔ وہ ہر وقت کام میں لگی رہتی۔ ساس کا امجد کا بہت خیال رکھتی۔ پیار کرنا تو کوئی اس سے سیکھتا۔ ہر دم محبت سے سرشار رہتی۔ میکے کی تو اسے یاد ہی نہیں آتی۔ پھر جب ساون کا مہینہ آتا۔ برسات ہوتی۔ لڑکیاں بالیاں۔ جھولا جھول رہی ہوتیں تو اس کی نگاہیں دروازہ پر لگی رہتی تھیں اور اکثر پلکیں بھیگ سی جاتی تھیں۔ دس سال بعد اس کے گلشن میں بہاروں کی نوید بن کر صادق آیا۔ صادق کو دیکھ کر وہ ممتا کے نور میں نہا گئی۔ اب اسے کوئی دعا یاد ہی نہ رہی۔ صادق نو سال کا ہوا تو نواز روڈ کے ایک حادثے میں اچانک فوت ہو گیا۔ ریشماں کی تو دنیا اجڑ گئی۔ اب جہاں اسے نواز کی جدائی کا دکھ ہوتا تھا وہیں اسے اپنے ماں باپ قبیلے والے بھی شدت سے یاد آنے لگتے۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ پینے اور میکے کا۔ ریشماں جیسے کہ ہنسنا ہی بھول گئی ہو۔ ریشماں کی ساس کا حال بھی کم برا نہیں تھا۔ نواز اس کا سب سے بڑا اپنا تھا۔ اس کے غم کا بھی کوئی علاج نہیں تھا۔ ایسے میں اگر ریشماں کا لحہ لحہ کسی نے خیال کیا تو امجد تھا۔ ننھے صادق کا خیال رکھتا۔ صادق اور بھابھی کو بھی گھمانے لے جاتا اور کیوں نہیں لے جاتا۔ بھابھی ماں اور صادق اس کے اپنے تھے۔ نواز کو فوت ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے گھر کا ماحول کھچا کھچا سا تھا۔ بڑے تایا۔ چاچی۔ چاچا جی۔ پھوپھی اماں سب بار بار ان کے یہاں آ جا رہے تھے۔ اور آج جب اماں نے اس کی شادی کے لیے بھابھی کا نام لیا تو وہ تڑپ گیا۔ پھوپھی اماں صادق اگر چھوٹا ہے تو خدا اسے بڑا کر دیگا۔ یہی میرا سہارا ہو گا۔ امجد امجد میرے بیٹے جیسا ہے۔

پھوپھی اماں! غضب خدا کا لوگ کیا کہیں گے لوگ جو آج کہہ رہے ہیں۔ بہو تمہیں اس کا احساس نہیں ہے مان جاؤ بہو تم اس گھر کی بہو ہو۔ بہو ہی رہو گی۔

تمہیں نواز کی روح کا واسطہ میری بات مان لو۔ تمہیں تحفظ کی ضرورت ہے تمہارا نکاح اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور تمہیں یہ کرنا ہو گا! پھوپھی اماں۔ ریشماں زار و قطار رونے لگی جیسے کہ ابھی ابھی نواز کی

میت گھر آئی ہو۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ پھوپھی اماں برسی کے بعد اصرار کر کے اسے اپنے گھر اس مقصد کے لیے لائی ہیں۔

اب کیا کروں۔ ماں نہ باپ۔ میرے خدا میں کیا کروں۔ تو اپنے بندوں کو پہلے حوصلہ دیتا ہے اور پھر آزماتا ہے۔ مالک مجھے اور نہ آزما۔ ریشماں نے صادق کو گلے لگالیا۔

امجد کی شادی اور ایک بیوہ کا نکاح سب امجد کو مبارکباد دے رہے تھے۔ اسے شاباشی بھی دے رہے تھے اور اس کی قربانی کی قدر بھی کر رہے تھے۔ اور امجد بس چپ چاپ تھا۔ مولوی صاحب نکاح پڑھانا شروع کرتے ہیں۔ بی بی ریشماں تم کو امجد ولد ماجد خان سے نکاح مہر شرع محمدی کرنا قبول ہے۔ آپ کو قبول ہے۔ آپ کو قبول ہے۔ آپ کو قبول ہے۔ نہیں مولوی صاحب نہیں۔

بات تحفظ کی ہے تو لا اللہ الہ...... مجھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، مجھے قسم ہے قرآن کی کہ آج سے امجد میرا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب میں نے اس کو جنم تو نہیں دیا لیکن میں اس کی ماں ہوں۔

بول بیٹا امجد بول۔ کرے گا نا حفاظت میری۔ اپنی ماں کی۔ دیگا نا تحفظ مجھے۔ بول بیٹا بول۔ امجد کہ میں تیری ماں ہوں۔ میں تیری ماں ہوں۔

امجد سر لباندھے ہوئے ریشماں کے قدموں میں گر گیا۔

بھابھی ماں! ماں

میری ماں۔

شمیم انصاری۔ سکونت، حیدر آباد (پاکستان)

۱۳۲

مکر چاندنی۔ ۸

احمد ہمیش

سوانح

حافظہ لوحِ محفوظ ہے کہ اس پردۂ عالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں
(حضرت بیدل کی مثنوی طلسمِ حیرت سے)

ان دنوں سننے میں آیا تھا یا کچھ میں یوں محسوس کرتا تھا کہ محبت میرے گاؤں یا علاقہ کے کسی گاؤں میں اتری ہوئی پری ہوا کرتی تھی۔ ظاہر ہے، گاؤں سے تو میرا جنم جات ناتا تھا۔ اور وہیں چار پانچ برس کی عمر میں اماں اور نانی کی زبانی پریوں کی کہانیاں سن چکا تھا۔ مگر اب دسویں برس کی عمر میں معلوم نہیں مجھے کیا ہوا تھا کہ میں گاؤں کی گنی چنی لڑکیوں کو بڑے دھیان سے نہار نہار کے دیکھتا یا تکتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی تو کوہ قاف کے پرستان سے اتری ہوئی پری نہیں لگتی تھی۔ کسی کے کاندھے سے پر نہیں لگے ہوئے تھے۔ کوئی بھی ذرا اٹھ کے کچھ اوپر اڑ نہیں سکتی تھی۔

دھندھن ماموں کی لڑکی ظاہرہ جو لگ بھگ میری ہم عمر تھی مگر بدن سے تگڑی تھی، اکثر ادھر اُدھر اچھلتی کودتی پھاندتی دکھائی دیتی تو خیال آتا کہ ہو نہ ہو، وہی محبت ہو! مگر کیا محبت اس طرح اچھلتی کودتی پھاندتی اچانک انجانے میں اڑنے لگتی ہوگی! ایسا تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ سوائے اس کے ایک دن میں حسبِ معمول لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ جانے جی میں کیا آئی کہ انکے درمیان نمایاں کھڑی ہوئی ظاہرہ کو یونہی ذرا چھیڑ دیا۔ ظالم نے جوابی کاروائی کچھ یوں کی کہ نیم کے پیڑ تلے مٹی کے چبوترے پر مجھے پٹک کر میرے سینے پر چڑھ بیٹھی۔ مجھے سخت چوٹ لگی تھی۔ ایک لمحہ کو بڑی شرم آئی کہ ظاہرہ میں کس بل مجھ سے زیادہ تھا۔ آس پاس کھڑے لڑکے لڑکیاں میری ہار پر قہقہے لگا رہے تھے۔ معاً اسے کچھ خیال آیا اور وہ مجھے چھوڑ کے اٹھنے لگی۔ تبھی میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مجھے عجب مزا آرہا تھا۔ ایسا لگا جیسے میں جیت گیا ہوں اور وہ ہار گئی ہو! مگر اس میں کوئی بھید ضرور تھا، جو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کچھ نہ کچھ چھو کے محسوس کرنے کی ابتدا تو اماں کی گود سے ہوئی تھی۔ اور اسے اللہ میاں کی طرف سے پاک صاف باور کرایا گیا تھا۔ پھر بھی جو کچھ میں نے چھو لیا تھا، اسے محبت کی جگہ محسوس کرنے کا آغاز تھا۔ مگر اس کے پاک صاف ہونے کے احترام سے نکل کے جب میں اپنے گاؤں اور علاقہ کی دوسرے گاؤوں کی خوشکل لڑکیوں کو ایک نظر دیکھ کے یا کچھ جانے انجانے صرف تھوڑا چھو کے خود کو اس حالت میں پایا کہ شائد میں نے محبت کو دیکھا یا محبت کو چھوا ہوگا! پھر بھی ایسا کچھ مجھے یاد آتا ہے کہ خوبصورتی کے بارے میں کچھ نہ

جانتے ہوئے بھی کچھ جاننے ضرور لگا تھا۔ یا میں کچھ جاننے اور کچھ نہ جاننے کے درمیان بہت بیوقوف اور بہت عقلمند بیک وقت ضرور رہا ہوں گا۔ یا دوسروں کو نظر آتا ہوں گا۔ ورنہ وہ واقعہ جو آٹھ نو برس کی عمر میں رونما ہوا کہ میں نے اپنے کورس کی جغرافیہ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ سورج جاپان سے نکلتا ہے۔ ایک دن تڑکے منہ گھا گھر اندی کے کنارے گراری دوڑاتے ہوئے پورب کی اور نہار رہا تھا کہ دیکھیں تو سہی سورج کہاں سے نکلتا ہے۔ تبھی میں نے دیکھا یا مجھے ایسا لگا کہ سورج گھا گھر اندی کی تہہ سے نکل رہا ہے۔ سو ہو نہ ہو، ندی کی تہہ میں جاپان ہو! بس کیا تھا، ایک عجب کیفیت میں بے اختیار میں ندی میں کود پڑا۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ ایک ملاح نے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔

لگ بھگ دو ہی سال تو گزرے ہونگے یا میری عمر کے دسویں برس سے کچھ مہینے آگے بڑھے تھے کہ میرے دل میں محبت، گاؤں اور پری کا بچکانہ تخیل اب نری بیوقوفی سمیت در آیا تھا یا میں نے جغرافیہ میں ہی پڑھا تھا کہ سمندر کے جس حصہ سے گرم رو گزرتی ہے، اس سے لگا ہوا زمین کا حصہ گرم ہوتا ہے اور جس حصے سے ٹھنڈی رو گزرتی ہے، اس سے لگا ہوا زمین کا حصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس سے محض ایک گمان اور اندازے کی سطح پر کچھ یوں لگتا تھا کہ میرے جسم کے پاس سے اکثر بیوقوفی کی رو گزرتی تھی۔ حالانکہ میں بلتھرا روڈ کے مڈل اسکول کی چھٹی کچھا میں داخل ہوا تھا۔ میرے نصاب میں سنسکرت اور فارسی بیک وقت شامل تھی۔ سنسکرت میں موہن کا روپ کچھ یوں ہوتا تھا: موہن موہنہ موجنیہ موہن ابھیام...... جبکہ فارسی میں پڑھا تھا: کریما ببخشے کہ بر حال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا۔

اس سے میری پڑھائی میں کچھ اٹھان آئی تھی بلکہ سنسکرت کے ادھیاپک سوریہ پرکاش پانڈے جی نے ایک دن جب ارجن کو دیئے گئے سری کرشن کے اپدیش کا ارتھ کچھ یوں بتایا کہ جب جب بھارت میں دھرم کو نقصان پہنچے گا تب تب بھگوان درشن دینگے۔ تو میں نے اسی گھڑی ان سے پوچھا کہ بھگوان کب درشن دینگے! البتہ یہ پوچھتے ہوئے میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی تھیں۔ اور میری آواز بھیگ گئی تھی۔ اس پر سوریہ پرکاش پانڈے جی جواب میں کچھ بولتے تو تھے مگر چھٹی کچھا میں ٹاٹ پر بیٹھے لڑکوں نے میرے سوال کو استاد سے گستاخی ٹھہرایا۔ ترتی پار گاؤں کے رہنے والے ایک برہمن لڑکے دیوکی نندن نے تو حد ہی کر دی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہو کے اس نے استاد سمیت پوری کچھا کو بتایا کہ میرے نیکر سے موت کی بو آ رہی ہے۔ اور اتفاق سے اس کا یہ بتانا بالکل ٹھیک تھا۔ رات کو سوتے ہوئے نیکر میں پیشاب ہو گیا تھا، جسے اتار کے دوسرا صاف ستھرا کپڑا پہن نہیں سکا، ویسے ہی پڑا سوتا رہا۔ سویرے تک نیکر سوکھ تو گیا مگر پیشاب کی بو باقی رہ گئی اور ویسے ہی اسکول چلا آیا۔ دراصل میرے پاس کوئی اور صاف ستھرا کپڑا تھا بھی نہیں۔ دیوکی نندن

چونکہ میرے ساتھ ہی بیٹھتا تھا لہٰذا اس نے بو سونگھ لی۔ اس پر سنسکرت کے ادھیاپک سوریہ پرکاش پانڈے جی نے تو نہ مجھ سے کچھ کہا اور نہ کوئی سزا دی۔ وہ بڑے نرم سوبھاؤ والے تھے۔ مگر دیوکی نندن سمیت کچھ لڑکوں نے جا کے ہیڈ ماسٹر مہندر سنگھ سے میری شکایت کی۔ اس پر انہوں نے بانس کی چھڑی سے مجھے پیٹا اور ترنت اسکول سے گھر چلے جانے کو کہا۔ ظاہر ہے، میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ میرے لئے چار پانچ جوڑے کپڑے بنوا سکتے۔ آخر میرے چھوٹے بھائیوں منے اور ننھے کا بھی تو باپ کی کمائی پر حق تھا۔ مگر ان کے پاس بھی دو ہی جوڑے کپڑے تھے۔

میرے پاس جو ایک ہی جوڑا کپڑا قمیض اور نیکر تھا، کہیں سے پھٹا پرانا نہیں تھا، اسے اگر میں ہر تیسرے دن دھو ڈالتا تو کوئی دیکھنے اور سونگھنے والا نہ ہوتا۔ شائد ہر روز خود کو صاف ستھرا رکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ مگر ایک دن جب مجھے یہ پتہ چلا کہ یاسمین پیر ولی بڑا گاؤں سے بھوروہ آگئی ہے تو اس سے ملنے کی کچھ ہڑک سی ہونے لگی۔ کسی طرح میں نے جلدی جلدی اپنی میلی قمیض اور نیکر کو پوکھرے کے گھاٹ کے پتھر پر رگڑ رگڑ کے دھویا اور صاف کیا۔ پھر پہن کے خود کو بنے ٹھنے ہونے کی تسلی دی۔ پھر بھی مجھ سے جو نری بیوقوفی ہوئی، وہ تھی یاسمین سے ملنے کی کوشش! مجھے یاد ہے کہ وہ بہت گھٹیا کوشش تھی۔ جب میں کتے کے بھونپو والے گراموفون ریڈیو پر سنے ہوئے کچھ فلمی گانوں سے متاثر ہو گیا۔ بلکہ ان میں استعمال کئے ہوئے لفظ "محبت" کو لے کے میں نے یاسمین کے نام چند سطروں کا خط لکھ ڈالا۔ لگ بھگ دس سال چند ماہ کی عمر میں لکھا ہوا یہ شاید میرا پہلا محبت نامہ تھا، جسے نیلے لفافہ میں بند کر کے بھوروہ میں اس کے گھر کے دروازے کے پاس شیشے کی گولیاں کھیلتے ایک بچے کے ہاتھ گھر کے اندر پہنچانے تک تو گویا میں نے کوئی کارنامہ کر ڈالا مگر انجام توقع کے خلاف یہ ہوا کہ یاسمین کے گھر کے کسی جواں مرد نے میرے داہنے گال پہ نہ صرف زناٹے دار تھپڑ مارا بلکہ میرے مولوی مدرس باپ تک سخت الاہنہ پہنچایا۔ اس طرح میری دوہری پٹائی ابا کے ہاتھوں ہوئی۔ میری پیٹھ پر بیل کو مارنے والے پینے سے گویا پڑ گئی تھی۔ اماں نے اس پر کچھ ہلدی چھوپ کر کے کچھ آرام تو پہنچایا مگر کچھ دن بعد ہی میری سمجھ میں کچھ یوں آیا کہ اپنے گاؤں سے باہر نکل کے کسی اور گاؤں کا رخ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ سو، کیوں نہ نئے سرے سے کچھ کیا جائے! مگر کیا کیا جائے، یہی تو مجھے سوجھتا نہیں تھا۔ میرے دل و دماغ میں محبت، پری اور گاؤں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

اب بانسپار میں واقع بڑے ابا کی سب سے چھوٹی بیٹی محسنہ، پتنگن دادی کی پوتی شمسہ اور رجی پھوپھو کی بیٹی رفیعن (رفیعہ) نظر میں اٹک کے رہ گئی تھیں۔ محسنہ کو ایک بار اس وقت دھیان سے دیکھا جب وہ اپنے اینٹوں والے مکان کی چھت پر کھڑی آسمان پہ چھائے ہوئے گہرے کالے بادلوں کو تک رہی

تھی۔ برسات کا موسم آلگا تھا۔ کسی گھڑی موسلا دھار پانی برسنے کو تھا جبکہ گھاگھرا ندی میں پانی چڑھ رہا تھا، اسی لئے تال تلیّاں اور بہہ سے ہو کے پانی کا ایک ریلا بانسپار کی برساتی گڑہیوں میں در آیا تھا۔ واسع بڑے ابا کے مکان کے سامنے والی برساتی گڑھی تو لبالب بھری ہوئی تھی۔ لڑکے اس میں نہانے کے بہانے تیراکی اور ڈبکی لگا کے دور دور پانی سے اپنے سر نکالنے کا مقابلہ دکھا رہے تھے۔ ایسے میں مجھے بھی کچھ یوں سوجھی کہ کیوں نہ میں مقابلہ دکھانے والے لڑکوں سے کہیں بڑھ چڑھ کے مقابلہ دکھاؤں۔ اس ارادے سے میں بھی گڑھی میں کود پڑا اور کچھ دیر چت اور پٹ تیر کے ایک لمبی ڈبکی لگائی اور چھت پر جہاں محسنہ کھڑی تھی، ٹھیک اس کی سیدھ میں سطح پر گردن تک سر نکال کے ایک ہی جگہ پانی میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے لئے سانس کو دیر تک روکنا تھا۔ سو، میں دیر تک گوہ موت اور طرح طرح کی گندگی ملے ہوئے پانی میں سانس روکے محسنہ کو تکتا رہا۔ توقع تھی کہ وہ گھرے بادلوں کی طرف سے نظر ہٹا کے اک پل میری طرف بھی دیکھے گی۔ مگر افسوس اس نے ایسا کیا ہی نہیں۔ البتہ معلوم نہیں کیا ہوا کہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے ابا میرے چھوٹے بھائیوں منے ننھے کے ساتھ ادھر ہی آ نکلے۔ جلدی جلدی گڑھی میں کود کر کے انہوں نے مجھے پانی سے باہر نکالا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ کسی نے ابا کو جا بتایا تھا کہ اس نے مجھے گڑھی میں ڈوبتے دیکھا۔ گویا ڈوبنے سے بچ کے نکلا تو خیال تھا کہ ابا مجھے ڈانٹیں پھٹکاریں گے ضرور۔ مگر معلوم نہیں، وہ مجھ سے کچھ بھی تو نہیں بولے۔ اس سے زیادہ تو مجھے حیرت تب ہوئی جب ایک دوپہر پھٹکن دادی کے گھر کی دالان میں بھرے چارپائی پہ لیٹی ہوئی شمسہ کے پاس جا پہنچا۔ میری اس ڈھٹائی اور بے شرمی پر وہ نہ تو گھبرائی اور نہ ہی منہ سے کچھ بولی۔ بلکہ وہ اتنی سیدھی سادھی تھی کہ میں نے اس دوران اسے گھگھو منا کھلانا چاہا تو وہ میرے دونوں پاؤں پر سراپا ننگے پڑے رہنے پر آمادہ ہو گئی۔ تبھی آہٹ ہوئی اور ایکدم سارا منظر پھٹکن دادی کی نظر میں آگیا۔ انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا ڈپٹا بلکہ دیر تک مجھے کوستی رہیں۔ پھر الا ہنا میرے باپ تک پہنچایا تو میں نے دیکھا کہ ابا شدید غصے کی حالت میں بھی ضبط کر گئے۔ مجھے سزا دینے کے بجائے خود رو پڑے۔ ان دنوں میں پہلی بار یہ منظر دیکھ رہا تھا، میں نے ابا کی حالت پر ایک نظر کی تو مجھے یاد آیا کہ پیر ولی بڑا گاؤں میں کچھ ماہ قبل ابا سراج راقی کی لڑکی انجم کی پڑھائی لکھائی کی خوب تیاری کے بعد اسے الہ آباد سے دسویں بورڈ کا امتحان دلوا کے لوٹے تھے۔ دیوریا ضلع کے کسی راقی گھرانے میں انجم کی منگنی ہوئی تھی کہ گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کے اسپتال میں ہی چل بسی۔ اس سے ابا کو اتنا غم ہوا تھا کہ اس کو یاد کر کے روتے تھے البتہ اس کی یاد میں نجانے کیسے انہوں نے ایک دلدوز نظم بھی لکھ لی تھی، شاعر تو وہ سرے سے تھے ہی نہیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی شاگرد لڑکی کو وہ بہت چاہنے لگے تھے...... کیا پتہ وہ لڑکی ہی محبت نام کی پری ہو! مگر وہ سدا کے لئے اڑ کیوں گئی! یہ سب کچھ تو میں ابا سے پوچھ نہیں

سکتا تھا۔

البتہ میں نے کہیں سُن رکھا تھا کہ کسی گھر کے احاطہ میں اگر مہندی کی باڑھ ہو اور سر شام کوئی لڑکی وہاں بھول سے بھی جا کھڑی ہو تو کوئی جن اس پہ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ عجیب بات تھی، میں سوچتا تھا کہ آخر کسی جن کو آدم زاد لڑکی پہ فریفتہ ہونے کی کیا پڑی تھی! کیونکہ جنوں کے ساتھ ہی پریوں کا ذکر آتا تھا۔ ایسے میں کوئی بھی جن کسی پری بغیر جن تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی ایک دن اتفاق ہی کچھ ایسا ہوا کہ بیٹھے بیٹھے مجھے چچی پھوپھو کی بیٹی رفیعن (رفیعہ) کا خیال آگیا۔ اس سے ملنے کی عجب اکساہٹ سی ہوئی۔ حالانکہ چچی پھوپھو کے گھر میں میرا آنا جانا تو اس لئے بھی تھا کہ وہ میری اماں کی گوئیاں تھیں۔ مگر اب تک میں رفیعن سے ملا نہیں تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ رفیعن اکثر سر شام اپنے گھر کے احاطہ نما بغیچہ میں شریفہ کے پیڑ اور مہندی کے باڑ کے پاس جا کھڑی ہوتی تھی۔ اب مجھے یہ تجسس ہونے لگا کہ سانولی رنگت کے باوجود اس کے بال لمبے ہیں، مبادا اس کے لمبے والوں پہ ہی کوئی جن فریفتہ ہو گیا ہو۔ مگر ابھی تو وہ مجھ سے کچھ بڑی لگ بھگ گیارہ برس کی ہوگی، جبکہ سنا تھا...... اکثر جن چودہ پندرہ سال کی لڑکی پہ آیا کرتے تھے۔ پھر بھی ایک دن موقع دیکھ کے عصر کی نماز کے دوران میں چچی پھوپھو کے گھر کے احاطہ نما بغیچہ میں چلا گیا اور وہاں دیکھا کہ وہ واقعی مہندی کی باڑھ سے لگی کھڑی تھی۔ تب میں نے شریفہ کے پیڑ کی آڑ لے کے اسے ہولے سے آواز دی۔ مگر افسوس وہ پلٹ کے مجھ پر چلانے لگی۔ شائد اس طرح میرا اس کے پیچھے آنا اسے بہت ناگوار لگا۔ میں اتنا ڈر اور گھبرایا کہ ترنت ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ محض اتنا ایک اندازے سے یاد ہے کہ شائد میری اور اس کی کمسنی تھی، جس کے سبب ایک دوسرے سے ذلیل ہونے اور مار کھانے کا اندیشہ جاتا رہا۔ لیکن اس سے نہ ملنے کا قلق اپنی جگہ تھا جو کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ چند دن بعد جب چچی پھوپھو اپنے میاں کے ساتھ بیٹی رفیعن اور بیٹے مستقیم کو لئے ہوئے بلتھرا روڈ سے کچھ اسٹیشن دور اپنے سسرال چورکینڈ چلی گئیں تو میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ کیوں نہ کسی بہانے مجھے چورکینڈ جانے کا بہانہ مل جائے۔ اتنا تو علم میں تھا کہ اندارا جنکشن سے دوسری گاڑی بدل کے چورکینڈ جانا پڑتا تھا۔ خود اپنے خرچ پہ ٹرین میں سفر کر کے وہاں جانے کے لئے میرے پاس آٹھ دس آنے نہیں تھے۔ سوائے اس کے کہ اگر بانس پار سے چورکینڈ کوئی بارات جانے والی ہوتی تو باراتی بن کے وہاں جانے کا بہانہ مل جاتا۔ مجھے یاد ہے باراتی بن کے ایک بارات میں وہاں جانے کا موقع بہت دن بعد ملا۔ مگر یہ یاد نہیں کہ بارات کس کی تھی۔ ایک اسٹیشن پہ اتر کے کسی جگہ سے ہاتھیوں پہ سوار ہو کے جانا پڑا۔ راستہ میں اوکھ یا گنے کے کھیت پڑتے تھے۔ سارے ہی ہاتھی اپنے سواروں سمیت ان کھیتوں میں جا گھسے۔ میں جس ہاتھی پہ سوار تھا، اس پر بیٹھے بیٹھے میں

روتے لگا تھا۔ مگر جب تک ہاتھیوں نے جی بھر کے گنے نہیں چوسے چبائے تب تک ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ جبکہ بارات کو چور کینڈ پہنچنے میں بڑی دیر لگی۔ نکاح کے بعد حسب دستور گھر کے دوارے ہی کچے ملگجے فرش پر دو لمبے اجلے دستر خوان دو رویہ بچھائے گئے، باراتی اکڑوں کھانا کھانے بیٹھے اور روغنی روٹی قورمہ پلاؤ اور فیرنی زردہ کی ہنڈیاں اور ڈھکنیاں جب لگائی جانے لگی تو ہر باراتی کے ہاتھ ایک ڈنڈا بھی تھمایا گیا۔ ابھی باراتیوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایکدم اِدھر اُدھر سے ڈھیروں کتے کھانے کی طرف لپکنے لگے، جبکہ ہر باراتی اپنے ہاتھ میں تھمے ڈنڈے سے اپنے سامنے آتے کتے کو مار بھگاتا اور ساتھ ہی کھانا بھی کھا رہا ہوتا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میں رفیعن کی یاد میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اپنے سامنے آنے والے کتے کو ڈنڈا مار نہیں سکا اور وہ میرے سامنے رکھی روغنی روٹی قورمہ والی پرئی گھسیٹ کے چلتا بنا۔ شاید میرے دل میں ایک یہ بھی خیال تھا کہ آخر وہ کتے رفیعن کے گاؤں کے ہی تو کتے تھے! سو، کسی کتے کو بھی مارنے کو جی نہ چاہا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ممکن ہو، میری وہ انوکھی اچھائی رفیعن کے کانوں تک پہنچ گئی ہوگی اور وہ بہت خوش ہوئی ہوگی۔ اس طرح سوچتے سوچتے میں اتنا باؤلا ہو چلا تھا کہ پھر بانس پار میں مجھے باؤلا پکارا بھی جانے لگا تھا۔ پھر بھی مجھے یاد ہے کہ رفیعن عرصہ تک اپنے دادی ہال چور کینڈ میں ہی رہ گئی اور میں بانس پار میں اس کے لمبے بالوں کو یاد کر کے اکثر اس کے نانی ہالی گھر کے احاطہ نما بچھ کی دیوار پر چڑھ کے اندر جھانک کے دیکھتا مگر مہندی کی باڑھ اب سوکھنے لگی تھی اور شریفہ کے پیڑ میں ایک شریفہ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔

تھوڑا عرصہ گزرتے ہی میں نے کچھ یوں محسوس کیا کہ میری پاگل سوچ میں کچھ نرمی آنے لگی تھی اور اس کا کارن اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ موسم بدل گیا تھا۔ یعنی جاڑا شروع ہو گیا تھا۔ دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہونے لگی تھیں جبکہ میری عمر کا گیارہواں برس شروع ہو چکا تھا۔ انہیں دنوں ہندوستان کے وزیر خوراک بنے تھے رفیع احمد قدوائی۔ دیس بھر میں پہلی بار اناج، گڑ، شکر، سرسوں کا تیل، اور مٹی کا تیل اتنا سستا ہو گیا تھا کہ غریب غربا محتاج مساکین وزیر خوراک کو دعائیں دیتے نظر آتے تھے۔ چراغ روشن کرنے یا دیابالنے کے لئے سرسوں کا تیل وافر مقدار میں ملنے لگا تھا۔ جبکہ کچھ ہی دن بعد دیوالی کا تیوہار آنے کو تھا۔ میرے گاؤں بانس پار سے تھوڑے ہی دور گھاگھرا ندی کے کنارے ہندوؤں کی کثیر آبادی والے گاؤں ترتی پار میں دیوالی منانے کی بڑی تیاری سننے میں آرہی تھی۔ میرا بہت جی چاہنے لگا کہ اب کی بار ترتی پار جاکے وہاں دیوالی کا تیوہار دیکھوں۔ وہیں کسی جانے پہچانے کے یہاں ٹھہر جاؤں۔ اور رات کو دیوالی کے جلتے ہوئے اور جگمگ کرتے ہوئے دیوں کا نظارہ کروں۔ مگر بہت سوچنے پر بھی ترتی پار میں کوئی جان پہچان دھیان میں نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ بلتھرا روڈ مڈل اسکول کی کچھا کا میرا سہ پاٹھی برہمن لڑکا دیوکی نندن ترتی پار

کار بننے والا تھا۔ مگر پتہ نہیں وہ مجھ سے کیوں نفرت کرتا تھا۔ اور ابھی مجھے یہ بھولا نہیں تھا کہ اس نے ہیڈ ماسٹر مہندر سنگھ سے شکایت کر کے مجھے پٹوایا تھا۔ ظاہر ہے اس سے تو میں مل ہی نہیں سکتا تھا۔ تب بھی میں اپنے گاؤں کے لوگوں سے پوچھتا پھرا کہ ترتی پار کے کسی ایسے رہنے والے کا پتہ چل سکے جو دیوالی کی رات مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرا سکے۔ خوش قسمتی سے بلتھر اروڈ میں واقع گاندھی محمد علی میموریل انٹر کالج میں پڑھنے والے اپنے گاؤں کے ایک لڑکے سے ہی پتہ چلا کہ کالج میں سوکس پڑھانے والے سکھن پرشاد ڈکشٹ نام کے برہمن استاد ترتی پار میں رہتے ہیں اور وہ بہت اچھے سوبھاؤ والے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ جان کے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔

دیوالی کے دن صاف ستھرا قمیض پاجامہ پہن کے اور اماں کو بتا کے میں اپنے گاؤں سے سانجھ بھئے ترتی پار پہنچا۔ وہاں سکھن پرساد ڈکشٹ کا پتہ لگا کے ان سے ملا اور اپنے مدرس باپ کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے یہاں ٹھہرنے کا مقصد بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے وہاں پر دیوالی کے موقع پر تیار کی جانے والی پوری بھاجی اور مٹھائی وغیرہ کھلائی۔ پھر مجھے چودہ پندرہ سال کی لڑکی کے ساتھ گھاگھرا ندی کے کنارے پانی پر جلتے ہوئے دیئے بہانے کا منظر دکھلانے کے لئے بھیج دیا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں پر دو دیئے رکھے۔ دونوں دیئے بال کے اس نے اپنی ایک ہتھیلی والا دیا میری ہتھیلی پہ رکھ دیا، جبکہ اپنی دوسری ہتھیلی والے دیئے کے ساتھ ہی اس نے میری ہتھیلی پہ رکھے دیئے کو اکھٹے ہی ندی کے پانی پر بہا دیا۔ میں ندی کے پانی پر اس کے اور اپنے جلتے دیئے کو ایک ساتھ جڑے ہوئے بہتے دیکھتا رہا۔ یہ اتنا سُندر، من بھاؤنا اور جادوئی منظر تھا کہ میں اس لڑکی سے اس کا نام اور ڈکشٹ جی سے اس کا ناتا وغیرہ پوچھنا بھول گیا۔ سوائے اس کے کہ میں اپنے اور اس کے پورے پن کو ملا کے ایک پل ندی کے پانی پر ایک نظر کی تو ایسا لگا کہ میں پانی کی سطح اور پانی کی تہہ میں بیک وقت رکھا ہوا ایک چراغ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری صورت شکل اور میرے جسم کی کایا پانی اور چراغ سے بنی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اس ابتدائی تخیل کی جیا دو ہیں کہیں رکھ دی گئی تھی اور جسے ترتی پار سے سویرے بانس پار لوٹتے ہوئے میں اپنی یادداشت سے نہیں نکال سکا۔ البتہ میں اب کچھ یوں سوچنے لگا تھا کہ محبت یا پری کسی گاؤں میں بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی ایک ہی جگہ اس کے لئے مخصوص نہیں تھی۔ ویسے بھی اپنے گاؤں میں میرا جی کیوں نہیں لگ رہا تھا، اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔

بانس پار میں تو اب پہلے کسی حوالے سے بھی میرے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ اور گھروں سے لوگ پاکستان کیا سدھارے تھے کہ کہیں نہ کہیں سے کچھ ویران کر گئے تھے۔ جبکہ ابا کے نام حسنات چچا کا ایک خط آیا تھا، جس میں انہوں نے اپنے یہاں بیٹے کی پیدائش کی علاوہ راولپنڈی سے کوئٹہ نام کے کسی شہر کے

اسٹیٹ بنک میں ٹرانسفر کی اطلاع لکھ بھیجی تھی۔ اس سے میرے دل پر کچھ الٹا ہی اثر پڑنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ پاکستان کسی چمبک یا مقناطیس کی طرح میرے ہاتھ پاؤں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور میں کھنچا چلا جارہا ہوں۔ تبھی میں گھبرا کے اماں کو پکارتا...... اماں...... اے اماں...... دیکھ مجھے کوئی پکڑ کے کھینچ رہا ہے۔ اماں کچھ نہ سمجھتے ہوئے مجھے اپنی گود میں سمیٹ لیتی۔ پھر بھی ایک دن میرے منہ سے لفظ پاکستان کیا نکلا کہ اماں نے جھٹ اپنا ہاتھ میرے منہ پہ رکھ دیا اور لگ بھگ چلا کے بولی...... "خبردار"...... شاید وہ حسنات چچا اور پاکستان دونوں سے ہی سخت چڑتی تھی۔ لیکن گھر میں ابول دادا اور صغرا پھوپھی کو اب تک اماں پر ایک ہی تو غصہ تھا کہ وہ پہلے ہی مجھے پاکستان لے جانے کے حسنات چچا کے ارادے کے خلاف سخت احتجاج کر چکی تھی اب بھی وہ ماں ہونے کے حق پر ڈٹی ہوئی تھی جبکہ ابا اماں سے نہ جانے کیوں رفتہ رفتہ بیزار ہوتے جارہے تھے اسی طرح میری اور میرے دونوں بھائی منے ننھے کی دیکھ ریکھ میں اب ان کی دلچسپی کم ہوتی جارہی تھی۔ روزمرہ کے حالات میں بھی کچھ عجب سی گراوٹ آتی جارہی تھی...... کہ ایک شام وزیر خوراک رفیع احمد قدوائی کی اچانک وفات کی خبر پورے دیس میں سنی گئی۔ کوئی گاڑی جیسے چلتے چلتے دھچکے سے رک گئی۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ پھر لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے اور بین کرتے نظر آئے۔ جبکہ بیشتر غریب اور نادار لوگ جو اناج وغیرہ کے سستے ہونے سے وزیر خوراک کو دعائیں دیتے تھے...... اب وہ بے سہارا نظر آرہے تھے۔ انہیں لوگوں کو تو ایک نیک انسان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کا غم زیادہ تھا۔ ورنہ میں تو یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ سیر بازار کے بنئے بہت مطمئن تھے۔ اور میں یہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اناج وغیرہ بیچنے والوں کا آدمی کی زندگی اور موت سے کوئی ناتا تھا بھی یا نہیں! البتہ سیر بازار میں مسجد کے آس پاس مسلمانوں کی دکانوں پہ کچھ لوگ یہ بھی تبصرہ کررہے تھے کہ ان دنوں کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو اپنی بہ نسبت رفیع احمد قدوائی کی مقبولیت برداشت نہیں ہوئی۔ ممکن ہو ان کی موت طبعی نہ ہوئی ہو۔ وہ پان بہت کھاتے تھے۔ کیا پتہ آخری تقریر کے دوران کسی نے انہیں پان میں زہر دے دیا ہو۔ تاہم رفیع احمد قدوائی کے بعد جس کسی کو دیس کا وزیر خوراک مقرر کیا گیا، اس کے کچھ ہی دن بعد اناج، تیل اور گڑ وغیرہ کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ اور شاید تبھی سے مہنگائی شروع ہوئی۔ لوگ باگ نئے وزیر خوراک کو گالیاں دینے لگے بلکہ گالیاں دیتے دیتے اس کا نام بھی بھول گئے۔ گویا میرے لڑکپن کے دوران ہی میرے تجربے میں یہ آچکا تھا کہ نیک آدمی ہی دنیا میں یاد رکھے جاتے ہیں۔ جبکہ برے آدمی کو دنیا میں بھلا دیا جاتا ہے۔

امتحان کے بعد جون میں مڈل اسکول اور دیگر اسکولوں اور کالجوں میں گرمی کی چھٹی کے دن شروع ہوئے تو میں اماں کے کہنے پہ اصغر نانا کے ساتھ بلتھر اروڈ ریلوے اسٹیشن پر دو بجے والی ریل گاڑی میں

سوار ہوا۔ بھٹنی جنکشن سے دوسری گاڑی بدل کے گونڈا اترنا پڑا پھر وہاں سے تیسری گاڑی پر بہرائچ سے ہوتے ہوئے سویرے لگ بھگ دس بجے مہن پوروا ریلوے اسٹیشن پر سفر کا ایک حصہ تو ختم ہوا مگر بعد کے باقی حصہ میں ہمالیہ کے ترائی کے جنگل سے (بیل گاڑی کی بناوٹ سے ملتی جلتی گاڑی جسے وہاں لڑہیا کہا جاتا تھا مگر اس میں بیل کی بجائے بھینسا جتا ہوتا تھا) لڑھیا میں سوار گزرنا پڑا۔ ہماری منزل تھی ایک جنگلی گاؤں بلسیھ پور...... جہاں پہنچنے تک جنگل میں بندروں، ہرن، چیتل اور نیل گائے کے جھنڈ نظر آئے۔ ریچھ کے جوڑے کو بہت قریب سے دیکھا۔ یہاں تک کہ جنگلی مرغیاں، مور اور سانپ بھی بیک وقت نظر آئے۔ جبکہ فاصلہ کا اندازہ بالکل نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ جب موروں کی آواز سنائی دی تو اصغر نانا نے بلسیھ پور گاؤں کے قریب ہونے کی نشاندہی کی۔ آخر کچھ ہی دیر بعد لڑھیا بلسیھ پور گاؤں میں ذرا اونچائی پر بنے پکے مکان کوٹھار کے پاس جا رکی۔ کوٹھار کے نگراں کوئی ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، جن کا نام یاد نہیں رہا مگر نانا کی خیریت دریافت کرتے ہوئے انہوں نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھا...... تو معلوم ہوا کہ ریاست نان پارہ کی طرف سے انہیں بلسیھ پور میں اناج وغیرہ خاص طور پہ مکئی کی فصل کی دیکھ ریکھ اور آوارہ مویشیوں کو کانجی گھر میں بند کر کے ان کے عوض چار آنے جرمانہ وصول کرنے پہ مقرر کیا گیا ہے۔ میں نے کانجی گھر کے بند دروازے کے ایک چھید سے کئی بند آوارہ مویشی دیکھے۔ ایک کوٹھار کو چھوڑ کے پورے بلسیھ پور میں جھونپڑیاں نظر آئیں۔ البتہ کوٹھار سے ملحق اصغر نانا کی جھونپڑی کے ساتھ کا حصہ گوبر ملی ہوئی مٹی کی دیوار کا تھا، جو کافی لپی پتی اور سخت تھی۔ ویسے اندر کافی جگہ تھی۔ مجھے تھوڑی سی بے چینی وہاں ایک ماہ پہلے آئی ہوئی منقوسن خالہ کو دیکھ کے ہوئی۔ کچھ ماہ پہلے ہی تو نانی ہال انوایاں میں نانی کی موجودگی میں منقوسن خالہ سے اماں کی سخت لڑائی ہوئی تھی۔ اماں نانی کی سب سے بڑی بیٹی ہونے کی ناتے انوایاں میں اپنے حق پہ زیادہ مصر ہوتیں تو اس کے ردِ عمل میں منقوسن خالہ ان سے چلا چلا کے لڑنے لگتیں تب نانی ان کی فریق بھی ہو جاتیں اماں مایوس ہو کے چپ ہو رہتی۔ جبکہ ایک تکلیف دہ معاملہ اپنی جگہ تھا کہ منقوسن خالہ کو ان کے شوہر نسیم خالو شادی کے چار ماہ بعد ہی چھوڑ کے بمبئی چلے گئے تھے۔ وہاں سے منقوسن خالہ کے نام ایک بہت ہی کڑوا کسیلا خط لکھا تھا۔ اس پہ ستم یہ کہ اپنی کمائی سے ایک پیسہ بھی خالہ کے نام نہیں بھیجا۔ ایسی ہی کسمپرسی میں ایک ماہ پہلے نانی نے انعام ماموں کے ساتھ منقوسن خالہ کو بلسیھ پور بھجوایا تھا۔ جبکہ بانس پار سے اماں نے نانا کے ساتھ مجھے بلسیھ پور بھیجتے ہوئے منقوسن خالہ کا لحاظ کرنے اور ان کی عزت کرنے کی تاکید کی تھی۔

بلسیھ پور...... ہمالیہ کی ترائی کے اس جنگلی گاؤں میں شام ہوتے ہی آس پاس سے سانپوں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ اور کبھی کبھی شیر کی دہاڑنے کی آواز بھی سنائی دینے لگتی۔ ان آوازوں سے مجھے بہت

ڈر لگتا۔ البتہ سانپوں کی آواز سُن کے دل میں ایک ہمت سی بھی پیدا ہوتی کہ باہر نکل کے دیکھوں تو سہی...... کہ سانپ کیوں بولتے ہیں اور بولتے ہوئے کیسے لگتے ہیں! مجھے یاد آتا ہے کہ میں کچھ ایسا چاہتا تھا...... کوئی سانپ مجھ سے کچھ بولے تو میں بھی اس سے کچھ بولوں! کیونکہ اب تک جو سانپ دکھائی دیتے رہے وہ بول تو نہیں رہے ہوتے بلکہ چپ چاپ لہریلی چال سے رینگتے ایک طرف کو نکل جاتے۔ اصغر نانا کا کہنا تھا کہ سانپ کبھی کبھی اپنی موجودگی سے دشمن کو ڈرانے کے لئے بولتے ہیں یا چوہے وغیرہ کا شکار کرنے سے پہلے بولتے ہیں۔ نانا کے یوں کہنے پر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مور اور نیولے سانپ کے دشمن ہوتے ہیں...... میں سانپ کو دوست بنانا چاہتا تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ سانپ مجھے بہت خوبصورت لگتے تھے۔ ان کی خوبصورتی مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ مگر ایسا میں کیوں چاہتا تھا، یہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔ جبکہ بلسبھ پور میں تو مجھ میں کچھ زیادہ ہی باؤلا پن در آیا تھا۔ بلکہ اب تو یہ حال ہو چلا تھا کہ میں اپنے اندر کبھی خود کو گاؤں، کبھی پری، کبھی محبت، کبھی چراغ اور کبھی پانی تصور کرنے لگتا کبھی ان سب کو ملا کے اپنے بھیتر کہیں سانپ بن جاتا...... اپنے بھن پہ کھڑے ہو کے جنگل کی جھاڑیوں اور پیڑوں کے سامنے تقریر کرنے لگتا۔ میں اور کیا کچھ سوچ رہا ہوتا کہ جب جنگلی گاؤں کی جھونپڑی میں کھاٹ پہ سونے کا ارادہ کر رہا ہوتا تو جلد ہی نیند آجاتی اور جب بھور میں جنگل کے بھانت بھانت کے پنچھیوں کی چہکار سنائی دینے لگتی تو بالکل آدمی کی بچے کی طرح اٹھ جاتا۔ دن کے معمولات میں سوائے اس کے کہ دوپہر کو منقوسن خالہ کھانا پکاتیں تو میں پیٹ بھر کھا لیتا مگر ترنت ہی جھونپڑی سے نکل کے بلسبھ پور میں مختار نامی ریاست نان پارہ کے ایک کارندہ کے واحد اینٹوں والے گھر میں یونہی چلا جاتا، وہاں یا تو اناج سے بھرے ہوئے لیپے پتے کنڈے دکھائی پڑتے یا مختار کی نو عمر لڑکی تھی، جو ہاتھ پاؤں سے اور لہنگے میں کسی بندھی نظر آتی اور کبھی گھر میں اور کبھی چبوترے کے باہر اچھلتی کودتی نظر آتی مگر مجھے دیکھتے ہی "سُگّا" پکارتی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سُگّا طوطے کو کہا جاتا تھا مگر معلوم نہیں میں اس کی نظر میں سُگّا کیوں نظر آتا تھا! پھر بھی میں اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتا اس لئے مجھے ڈر لگتا کہ اس کا زور میری طرف نہ پلٹ آئے۔ اس لئے اک نظر دیکھتا اور کترا کے نکل جاتا۔ شائد اس لئے کہ میری عمر اس قابل نہیں تھی کہ میں اسے دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ جاتا جو دیکھنے اور سمجھنے کے درمیان رہا ہوگا۔

ایک دن ابھی سورج نہیں نکلا تھا، شمال کی اور ہمالیہ پہاڑ کی نیل گوں دھندلی جھلک نظر آرہی تھی۔ سوائے اس کے کہ فاصلہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تبھی اصغر نانا نے جنگل جانے کی خاص تیاری کے دوران مجھے ساتھ لے جانے کا مژدہ سنایا۔ تھوڑے ہی دیر میں سورج نکلتے نکلتے اصغر نانا نے مجھے ساتھ لیا

ہمراہ کچھ آدمی تھے، جن کے ہاتھوں میں لمبے بانس اور بالٹیاں تھیں۔ ہمارا رخ شمال کی اور تھا۔ بلسیٹھ پور گاؤں کے جنگل کے حصہ سے لگ بھگ ڈیڑھ کوس چل کے ایک گھنے حصہ میں جہاں کتھے کے پیڑ بہت تھے، پڑاؤ ڈالا گیا۔ کئی پیڑوں پہ شہد کے چھتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ نانا ان پیڑوں کی لکڑی کے علاوہ شہد اتروانے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی منہ اور گردن پہ کپڑا لپیٹ کے شہد کے چھتے والے پیڑ پر باری باری سے چڑھتا اور دیا سلائی سے سوکھی مونجھ کو سلگاتا اور چھتے کو کچھ اس ڈھنگ سے دھواں دیتا کہ مدھ مکھیاں چھتے سے اڑاڑ کر پرے نکل جاتیں، پھر چھتے کو چھوٹی آری سے کاٹ کاٹ کے نیچے اس طرح گراتا کہ نیچے کھڑے ہوئے باقی آدمی بالٹیوں میں لوک لیتے۔ اس طرح کئی پیڑوں کے شہد سے بھرے چھتوں کے ٹکڑے بالٹیوں میں اکٹھا کر دیئے گئے۔ اصغر نانا نے ایک بالٹی میں سے چھوٹا سا ٹکڑا نکال کے مجھے تھمایا۔ وہ شہد سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ میرا ہاتھ بھر گیا۔ میں نے شہد کا سواد لیا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں سراپا شہد میں ڈوبا ہوا ہوں یا میں خود شہد ہوں! تبھی مجھے بڑی پیاس لگی۔ میں نے نانا کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی کو بتایا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے قریب کے ایک پیڑ کے پیچھے جانے کو کہا۔ میں اس پیڑ کے پیچھے گیا تو ایک چشمہ نظر آیا۔ صاف شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے انجلی میں پانی بھر بھر کے خوب پیا۔ مگر اس کے بعد جونہی میں چشمے کی سیدھ والے مذکور پیڑ کی اس اور گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ نہ وہ جگہ ہے اور نہ اصغر نانا اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے پیڑوں سے شہد بالٹیوں میں اتارنے والے آدمی! کچھ بھی تو نظر نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے نظر آنے والا منظر اچانک اوجھل ہو گیا۔ میں خوف اور گھبراہٹ میں پہلے تو ادھر ادھر گھنے پیڑوں اور جھاڑیوں میں بھاگتا اور اصغر نانا کو زور زور سے پکارتا رہا۔ مگر جواب میں کوئی آواز بھی تو نہیں سنائی دی۔ جبکہ ایکدم مجھے محسوس ہوا کہ میں جنگل میں گم ہو گیا ہوں!

(جاری ہے)

احمد ہمیش: آبائی تعلق۔ ضلع بلیا (بھارت) سکونت۔ کراچی پاکستان

شاعری

جولائی تا اگست ۲۰۰۰ـ شمارہ ۳۸

شاعری اوڑھنی نہیں

جسے جب چاہے

کوئی اوڑھ کے بیٹھ جائے

(شاعری) بارش نہیں

جس کے ہونے سے

منظر ٹھہر جائے

شاعری صحرا ہے جو

منزل بھلا دیتی ہے

(شاعری) ہوا ہے

جو منظر اُڑا دیتی ہے

شاعری جسموں کے

طلسمات گنوا دیتی ہے

شعری مجموعہ "ماسوا" کے شاعر

سلیم شہزاد کی ایک منتخب نظم

لئنِ ابراہیم (شعیب ابراہیم) کے نام

شاعری

احمد ہمیش **مرقعِ ذات**

تخلیقی شاعری اور غیر تخلیقی شاعری یا غیر شاعری میں بڑا فرق ہے۔ یہاں اگر پوری ذمہ داری سے یہ ورڈکٹ دیا جائے کہ دربھنگہ بہار (بھارت) میں مقیم شاعر جمال اویسی اپنے تندو توانا لہجہ اور فکری جہت کے بنا پہ تخلیقی شاعر ہیں...... تو ان کی تخلیقی شاعری کی پرکھ اور پہچان کیسے ہو سکتی ہے! جبکہ شاعری کا میڈیم لفظ ہے اور لفظ کا استعمال دنیا میں ہر جگہ ہر کس و ناکس کر تا رہا ہے۔ اور ایک حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہر دور میں مختلف زبانوں میں ہوتی رہی شاعری چند منتخب شاعروں تک ہی معتبر اور مستند رہ سکی۔ گذشتہ دور میں بھی چند ہی شاعر باقی رہ سکے اور آج بھی کم ہی باقی ہیں۔ مثلاً پڑھی جانے والی شاعری کے اعتبار سے "نئے نام" انتخاب چھٹی دہائی کے دوران شب خون الہ آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اس کے بعد کوئی نمائندہ قابلِ ذکر انتخاب ہندوستان میں شائع نہیں ہوا۔ اس کے نتیجہ میں افتخار امام صدیقی کے ماہنامہ شاعر، زبیر رضوی کے سہ ماہی ذہنِ جدید اور ساجد رشید کے سہ ماہی نیا ورق کی دکانیں چل نکلیں اور ان دکانوں میں خراب شاعری اور غیر شاعری کی کھپت ہونے لگی۔ اس سے قطع نظر کہ کسی معیاری ادبی رسالہ میں بھی منتخب شعری و نثری تحریروں کی اشاعت کا تناسب بھی ۵ ، ۷ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ محدود مالی وسائل میں ادبی رسالہ کی اشاعت کو جاری رکھنے کی جدو جہد معاشرتی ضرورت کے توازن اور ہم آہنگی کی متقاضی ہوتی ہے پھر بھی تخلیقی شاعری کی اشاعت کا معتبر و مستند تناسب سہ ماہی تشکیل کی پہچان ہے۔ اس بار حسیر نوری اور شاہد حمید غزل کی شاعری کے معتبر شاعر اور تخلیقی سطح پر ہی سعید اقبال سعدی، عادل فریدی، فاروق مغل اور شاہانا ایلیا کی شمولیت قابلِ توجہ ہے کچھ اور شاعر بھی شاملِ اشاعت ہیں جنہیں حوصلہ افزائی درکار ہے۔ البتہ اردو نثری شاعری سے غذا حاصل کرنے والی پیرا سائیٹ ایک طرح کی غیر شاعری مثلاً آزاد غزل، غلام غزل، ہائیکو، سین ریو، ماہیا اور ترونی نے گذشتہ چند برسوں کے دوران رسائل اور شعری مجموعوں کے صفحات پر بڑا طومار مچایا۔ مگر خلاف اس کے تخلیقی شاعری کی تاریخ میں ایک بڑا اہم کارنامہ خلاق شاعر و عالم عنبر بہرائچی نے "سنسکرت کی نثری شاعری" کے حوالہ سے انجام دیا اور اس طرح اردو نثری شاعری کے متعلق احمد ہمیش کے موقف کو بڑی تقویت پہنچائی۔

اس بار مسعود احمد اور ظفر مہدی کی شمولیت اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ دیارِ غیر میں اپنی انفرادی حیثیت کی مطابقت سے اردو شعر و ادب کے حق میں بڑا کام کر رہے ہیں۔

غزل

حنیف اسعدی

کاروانِ رنگ و بو دورِ خزاں تک آگیا
اپنے پیچھے چلتے چلتے میں کہاں تک آگیا

خشک موسم، زرد پتے، بے نمو شاخوں کی چھاؤں
بس یہی تھی میری منزل میں یہاں تک آگیا

یہ بھی کچھ کم تو نہیں منزل رسی کے شوق میں
اک شکستہ پا غبارِ کارواں تک آگیا

وحشتوں کو بھی نہ تھا پائے جنوں پر اختیار
گردشیں لائیں جہاں تک میں وہاں تک آگیا

فاصلوں کو آگہی کے جست نے طے کر لیا
وقت پیچھے رہ گیا ہے میں یہاں تک آگیا

ایک شعلہ سا نگاہوں کے تصادم سے اُٹھا
پھر وہی بڑھ کر سوادِ جسم و جاں تک آگیا

یہ مری منزل کہاں تھی یہ تو قسمت ہے حنیفؔ
میں مکاں کی جستجو میں لامکاں تک آگیا

حنیف اسعدی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

غزل

کاوش عمر

نعرہ زن، خندہ لب، شادماں، گلفشاں، نغمہ بار، آئے ہیں
جب بھی زنداں سے اہلِ مجنوں سر بکف سوئے دار آئے ہیں

ولولہ، جوش، مستی، تڑپ، آرزو، شوق، ارماں، طلب
پاس کچھ بھی نہیں، بر متاعِ حسین، اس پہ وار آئے ہیں

ننگ، ناموس، ایماں، غیرت، شرف، دین، دل، زندگی
عشق کے کھیل میں ایک ہی داؤ پر ہنس کے ہار آئے ہیں

زیرکی، درک، جودت، زیرکی، خرد، عقل، دانش، بجبہ
سب لٹا کر تری نرگسِ مست پر میگسار آئے ہیں

رنگ، تارے، گہر، چاندنی، کہکشاں، پھول، تتلی، شفق
مہ لقو! آج وہ، لے کے دامن میں نقدِ بہار آئے ہیں

ضیمراں، جعفری، نسترن، یاسمن، موتیا، نازبو
فصلِ گل کی قسم، صحنِ گلشن سے ہم بیقرار آئے ہیں

بادلہ، تار، جھالر، جھلا جھل، دھنک، برق، جگنو، کرن
وہ سرِ انجمن سج کے ملبوسِ تن زر نگار آئے ہیں

تمکنت، آن، غمزہ، نزاکت، پھبن، شان، شوخی، وجہ
آنے والے اداؤں میں نقش لئے بیشمار آئے ہیں

زرد پکھراج، الماس، نیلم، رتن، لعل، یاقوت، عنبر
تیری محفل میں صدقہ ترے حسن کا ہم اتار آئے ہیں

ماہ، پروین، زہرہ، زحل، مشتری، نجم، کوکب، ہرا
تیرے آنگن سے شب، ناگہاں سب کے سب خرمستان آئے ہیں

رنج، غم، آہ، گریہ، خلش، بیکلی، شور، شیون، فغاں
حلقۂ ناز سے کاوشِ مبتلا دلفگار آئے ہیں

کوئی ایسی بھی دنیا ہے

نظم

ساجدہ زیدی

خدائے دو جہاں
اے حرفِ کن کے رازداں
اے منبع کون و مکاں
......اتنا تو بتلا دے
کوئی ایسی بھی دنیا ہے......؟
جہاں انسانیت کی صاف پیشانی پہ
علم و فن کی پو پھٹتی ہو......اور
فکر و نظر کے آئینوں سے
نور کی کرنیں ابلتی ہوں
دلوں میں خیر و برکت کی دعائیں
گونجتی ہوں
صبحدم آکاش کے نیلم تلے
جامِ حقیقت پی کے جینے کی تمنا
رقص کرتی ہو
جہاں احساس کے کہرے سے
فکرِ نو کے تارے جھلملاتے ہوں
جہاں ہونٹوں پہ حرفِ آگہی کی جوت ہو
آنکھوں سے حیرت،
ذہن سے وجدان کے چشمے ابلتے ہوں
جہاں راتوں کے سناٹے میں
دلِ محوِ نیاز و ناز رہتا ہو،
قضائے دیگراں کے سحر کا ہمراز
رہتا ہو
محبت، عشق، دلداری، وفا
عنوانِ ہستی ہوں
اخوت، نرم گفتاری،
عطا پیمانۂ دل ہوں
خدائے لم یزل بتلا......
کوئی ایسی بھی دنیا ہے؟
کہیں ایسا بھی ہوتا ہے؟
سیاست کی فسوں سازی
تجارت کی زیاں کاری
ہوس کی گرم بازاری
کسی عیار قوت کی جہانداری
......میں دم گھٹتا ہے
ہر لحظہ عذابِ جاوداں معلوم ہوتا ہے
'خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں'

ساجدہ زیدی۔ سکونت: علیگڑھ (بھارت)

لاحاصل

نیّر جہاں

نظم

مجھے خبر ہی نہیں تھی اس کی
زمیں میں پھولوں کے بیج بو کے
برستے بادل سے بارشوں کی نوید لے کے
ہوا کو ضامن بنا کے میں نے
جو بیج بوئے......
تو صرف کیکٹس اُگیں گے اب کے
مجھے بھلا کب خبر تھی اس کی
کہ عہد یہ عہدِ رائیگاں ہے

سوہنی سے — نظم

ہمارے دور کا یہ کرب ہے الفاظ سے بڑھ کر
کہ اب اِس دور میں سوہنی
گھڑے تو سارے پکے ہیں
مگر مہینوال کچے ہیں

بے کتبہ قبریں — نظم

جب میں اپنے گاؤں لوٹی
اُس کا بیٹا
دوڑ کے میری جانب لپکا
جھک کر میں نے گلے لگایا
ماتھا چوما اور
پھر ہنس دی
میرے اندر
گھٹی گھٹی سی سسکی لے کر
عطر کی چھوٹی خالی شیشی
پیتل کے جھمکوں کی جوڑی
ململ کی چنری کا دوپٹہ
بے رنگا چاندی کا چھلّہ
مِٹے مِٹے سے حرفوں والا
بوسیدہ سا نیلا کاغذ
تڑپ تڑپ کر روئے

نیر جہاں۔ سکونت: لاس انجلیس (امریکہ)

رفعت القاسمی

غزل

ڈوب کے موجِ صہبا میں
رہتے ہو کس دُنیا میں

یاد کی موجیں لرزاں ہیں
رُت برساتی پُروا میں

ہم نے سب دُکھ درد سہے
اپنے شہرِ تمنّا میں

فاصلہ کتنا باقی ہے
بستیٔ ہیر اور رادھا میں

دیوانو! کیا سوچتے ہو
دشت میں ہو یا صحرا میں

ہم بھی رنگ نہائیں گے
اب مہران کی برکھا میں

کوئی دفا کا رنگ بھی ہے؟
اُس کے وعدۂ فردا میں

سارے ساحل ڈُوب گئے
اپنے اپنے دریا میں

زندہ پانچ عناصر ہیں
سُورج بنسی دیوتا میں

جتنے رنگ دھنک کے ہیں
اتنے رنگ سراپا میں

شام سویرے بھیگ گیا
حُسن کا آنچل دریا میں

دِل پاتال کی گہرائی
دیکھو اَوج ثریّا میں

رفعت میرے ساتھ رہو
کیا رکھا ہے دُنیا میں

رفعت القاسمی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

وہ ایک کِرمک......

نظم

رحمان فراز

وہ ایک کِرمک
کہ جو تہہِ سنگ تار دنیا میں رزق جو ہے
اُسے رگِ سنگ سے میسّر ہے آب و دانا
اِسی سے حاصل اُسے بھی قوتِ نمو ہے
میں سنگ زاروں کی تار دُنیا میں گھر گیا ہوں
اور اس کی تاریکیاں میری روح میں بتدریج اُتر رہی ہیں
میرے لہو کی تمازتیں سرد پڑ رہی ہیں
میرے پس و پیش سنگ ہی سنگ ہے
یہ بے حِس اجاڑ دُنیا
میں جس کا معتوب ہوں، اور اب تک
میں جس سے پیوستہ ہوں، یہی تو میرا جہاں ہے
میں ایک ادنیٰ شرر کی تابانیوں سے بھی دُور تر رہا ہوں
یہاں کی ہر ایک چیز جامد ہے، سخت جاں ہے،
میرا جہاں کتنا بے اماں ہے،

میرے خدا
مجھ پہ کھول بابِ قبولیت
اور اس جہانِ سیہ سے
اس بدیقین دنیا سے بچ نکلنے کا راستہ دے
اگر میرے واسطے یہ ممکن نہ ہو،
تو پھر تو مجھے تیقن دے
اور کِرمک کا حوصلہ دے......

رحمان فراز۔ سکونت: ملتان (پاکستان)

قیصر شمیم

غزل

اِک رہ گزرِ شعلۂ جوّالہ ملی ہے
جو زیست ملی ہے مجھے قتّالہ ملی ہے

پہنچا ہے کہاں ہاتھ مرا دامنِ گُل تک
کب راہِ طلب میں کوئی حمّالہ ملی ہے

بے غُسل نہیں اُٹھتی کوئی میّتِ حسرت
قسمت سے مجھے چشم ہی غسّالہ ملی ہے

دے آیا ہوں کچھ گرمیٔ اخلاص کے لمحے
جب اُس کی نظر ہم صفتِ ژالہ ملی ہے

گلگونۂ عارض کا ترے عکس ہے دل پر
یا سُرخیٔ داغِ جگرِ لالہ ملی ہے

میَں نغمہ گرِ غم ہوں، مرے سازِ الم کو
تاثیرِ نوائے دلِ بنگالہ ملی ہے

ملتی ہے کہاں شوخیٔ سرِ راہِ طلب سے
قیصر کو جو توفیرِ شبِ نالہ ملی ہے

قیصر شمیم۔ سکونت: ہوڑہ۔ مغربی بنگال (بھارت)

نمکین غزل

افتخار اجمل شاہین

پڑھ لی تربینی یاور گوپال کی
مل گئی مجھ کو سزا اعمال کی

بزم میں گانے لگے شاعر غزل
اب تو شامت آگئی قوال کی

چند کتابیں پڑھ کے ہم نے دوستو
لکھ دی آخر دو کتب امثال کی

ساٹھ روپے میں ملا کرتی ہے گائے
بات ہے پچی مگر سو سال کی

"فیکس" آئے یا کوئی "ای میل" اب
یوں خبر ملتی اب احوال کی

پڑھتا رہتا ہوں وہی میں اک غزل
جو غزل میری ہے بچپن سال کی

اک گدھے کو ترقی مل گئی
ہے خبر سب سے بڑی اس سال کی

افتخار اجمل شاہین۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

۸۶

مزاح کا نوحہ

(محترم مکرم بزرگوار جناب ضمیر جعفری (مرحوم) کی موت پہ لکھے گئے چند رشحاتِ لنگ)

لطیف تھا، ظریف تھا ضمیر جعفری
مزاح میں تھا طنز کی نظیر جعفری

وہ دل لگی کی لوح پر تھا حرفِ خوش نظر
تھا خامۂ مذاق کی صریر جعفری

ہنسی خوشی کی جنگ میں جو خود علم ہوا
وہ اُس کی کمان میں تھا تیر جعفری

تھا شوخ بھی تھا سنگ بھی تھا رنگ بھی
تھا طفل اور جوان بھی تھا پیر جعفری

تھیں اُس کے انگ انگ میں بھری شرارتیں
تھا سر سے لے کے پاؤں تک شریر جعفری

محبتوں میں عام تھا وہ خاص طور پر
تھا صاف دل نگاہ کا اسیر جعفری

سخی تھا دل کا اور تھا نگاہ کا کھلا
امیر ہر طرح سے تھا فقیر جعفری

ہنسی ہنسی میں آپ ہی وہ آپ مٹ گیا
تھا سنگِ مرمریں پہ جو لکیر جعفری

تو مر گیا ہے آج دل کہے تو کیا کہے
خلوص اب خلا میں ہے ضمیر جعفری

غزلیں

ابراہیم اشک

روان دواں ہے تخیل ہزار سمتوں میں
ہے اپنے شوق کا گرد و غبار سمتوں میں

میں لاکھ چاہوں تو خاموش رہ نہیں سکتا
بکھر ہی جائیگی میری پکار سمتوں میں

نہ جانے کون سی منزل کی ہے تلاش اسے
بھٹک رہا ہے کوئی بے قرار سمتوں میں

میں نقش نقش بکھرتا رہا ہوں عمر تمام
سدا رہے گی میری یادگار سمتوں میں

طلسم جاں ہے کہ چھایا ہے ہر قدم پہ مرے
ہے زندگی کی طلب کا حصار سمتوں میں

بس ایک موج ہنر کا ہے جوش ہر جانب
بہت ہی تیز ہے یہ فن کی دھار سمتوں میں

بساطِ علم و ہنر سے پرکھ کے سب نے کہا
ہے اشک تیری غزل کا دیار سمتوں میں

(۲)

دشت و صحرا پھر سمندر بے کراں
تشنگی منظر بہ منظر بے کراں

زندگی ہے یا کوئی میدانِ جنگ
آدمی خود ایک لشکر بے کراں

عکس میرا یا کہ اک دنیا تمام
کون ہے یہ مجھ سے باہر بے کراں

پھول تتلی، رنگ خوشبو اور ہوا
موج ہے اس سب کے اندر بے کراں

ایک لمحہ اور اتنی وسعتیں
کتنی صدیاں اس کے اندر بے کراں

میں کہ اپنی آگ میں جلتا ہوا
اپنے اندر اپنے باہر بے کراں

شہر کی آبادیوں کو دیکھ کر
یاد آیا اشک محشر بے کراں

ابراہیم اشک۔ سکونت ممبرا (بھارت)

انوراگ

عشرت رومانی — نظم

جیون میں سوگندھ ہے کیسی!
دیوی سے سمبندھ ہُوا ہے
جیسے کنول کا پھول کھلا ہے

سنگھاسن پر
بیٹھ کے مالا جپتے جپتے
ہم نے من کا ارپن کر کے
سپنوں سے ابھلاش کی خاطر
ہنس کر جیون تیاگ دیا ہے

من کی جوالا جب بھی بھڑکی
اگنی سے اشنان کیا ہے
چندر جوت نے اکثر مجھ سے
میرے من کا دان لیا ہے

آتم سکھ اور آتمہ شکتی
من کی دولت من کی بستی
ترے دوار پہ دیپ جلا کر
بستی کو پہچان لیا ہے

انتر دھان ہے سب کچھ ہم سے
پھر بھی کتنا گیان ملا ہے
ہم تو پر جاپتی نہیں ہیں
پھر بھی یہ سمان ملا ہے

کوئی سنگھاسن مل نہ سکا ہے
جیون سکھ کا دان ملا ہے
دیوی نے پھر بھکشا دے کر
من مندر سویکار کیا ہے
جیون پر اُپکار کیا ہے
شائد ہم سے پیار کیا ہے

عشرت رومانی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

غزل

مسعود احمد

کدورت ہو دلوں میں تو دیانت پھر کہاں ہو گی
دیانت گر نہیں یارو صداقت پھر کہاں ہو گی

سخن کس کا، مبصر کون یہ نقد و نظر ہیں کیا
منور ہو نہ سینہ تو بصیرت پھر کہاں ہو گی

عبادت بھی محبت ہے محبت ہی عبادت ہے
محبت ہو نہ دل میں تو عبادت پھر کہاں ہو گی

اگر یوں ہی رہے زیرِ ستم منصف ہمارے تو
کرے گا عدل کیا کوئی عدالت پھر کہاں ہو گی

ہمارا کل تو ہیں بچے یہی سچ ہے ذرا سوچیں
نہ ہو بنیاد رکھی تو عمارت پھر کہاں ہو گی

بدلتی جاتی ہے یارو بڑی تیزی سے یہ دنیا
ہماری تو اسے اب ہے ضرورت پھر کہاں ہو گی

محبت روشنی ہے تو اسے مسعود پھیلاؤ
اگر یہ عام ہو جائے تو ظلمت پھر کہاں ہو گی

مسعود احمد۔ سکونت: ناٹنگھم (برطانیہ)

غزل

بے ثبات ہوں لیکن کتنا معتبر میں ہوں
دشت میں ہوا میں ہوں، دھوپ میں شجر میں ہوں

پتھروں نے سیکھا ہے مجھ سے گفتگو کرنا
کائنات سنتی ہے بولتا اگر میں ہوں

قیس ہوں کہ سرمد ہوں کم نہیں کسی سے میں
کل کی اِک خبر وہ تھے آج کی خبر میں ہوں

راستے کا پتھر ہو، یا غبار راہوں کا
اتنا دربدر کیا ہو جتنا دربدر میں ہوں

کیا کوئی صحیفہ بھی اتنا معتبر ہوگا
عشق کے حوالے سے جتنا معتبر میں ہوں

●

نظم

تلاش

کتنا دیوانہ ہوں میں
وہ تبسم
جو غریبِ شہر کے ہونٹوں پہ ہو
شہر بھر میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں

عباس حیدر زیدی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

غزلیں

جمال اُویسی

اچھا ہے چراغ جل نہ جائے
دل کا یہ اندھیرا ٹل نہ پائے

من موہنی صورت! کہو تم
کیوں ترچھی نظر بدل نہ پائے

وہ شام تھی بے مثال، پر ہم
کیا بات ہوئی بہل نہ پائے

ہر محفلِ دوستاں میں اے دل
کیوں تیرا مزاج ڈھل نہ پائے

میرے لئے تیرگی بہت ہے
کیا ہے جو چراغ جل نہ پائے

اچھے تھے محبتوں کے رشتے
بس ہم ہی ذرا بہل نہ پائے

دنیا کی اساس ہے تجارت
اس ریت کو ہم بدل نہ پائے

اک مسئلہ زندگی ہے گویا
اور آدمی اس کا حل نہ پائے

(میر تقی میر کی زمین میں)

(شمس الرحمٰن فاروقی کے نام)

پھیلی ہوئی نگاہ میں ہے رہگذر کہ ہم
بے منزل و قیام ہوا ہے سفر کہ ہم

پھرتا ہے ایک صفحۂ غزل کا گلی گلی
اُردو زبان ہونے لگی دربدر کہ ہم

دیکھا نہ تھا ذرا کہ سماں ڈوبنے لگا
ہے زندگی ہمارے لئے مختصر کہ ہم

پُر شوق کائنات کی پنہائیوں میں دیکھ
ہر شے ہے اپنے آپ میں گم، بے خبر کہ ہم

آندھی آڑا کے لے گئی سامانِ زندگی
بکھرے ہوئے ہیں شہر میں دیوار و در کہ ہم

جمال اُویسی۔ سکونت: دربھنگہ (بھارت)

سگِ خارش زدہ

نظم

شاہانہ ایلیا

دور تک چادر تنی تھی ریت کی
اور بگولے اڑ رہے تھے کو بہ کو
بستیاں ٹوٹی پڑی تھیں جا بہ جا
اور درِ حجلہ بھی تھا ٹوٹا ہوا
برجِ عربہ جل رہا تھا آگ میں
ہر طرف تھی بے کسی چھائی ہوئی
تھی اداسی رنگ پہ آئی ہوئی
کوئی آدم تھا نہ آدم زاد تھا
شہرِ دل کیا...... خانہ برباد تھا
میں بہت ترساں تھی اور حیران تھی
اور دہشت سے لبوں پر جان تھی
اس خرابے میں نہ تھا کوئی مگر
اک سگِ خارش زدہ تھا
اور میں......

شاہانہ ایلیا۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

صابر ظفر

غزل

دل بجھ گیا کہ جیسے محبت ہی بک گئی
یعنی وہ ایک جینے کی صورت ہی بک گئی

حالانکہ اس قدر کبھی ارزاں نہ تھے عوام
کرتے مگر وہ کیا کہ حکومت ہی بک گئی

آوازِ حق کو کھا لیا باطل کے شور نے
شنوائی کیسے ہوتی، سماعت ہی بک گئی

جیسے ہو بندگی بھی خدا سے کوئی فریب
اِک دو سے کیا گلہ کہ جماعت ہی بک گئی

قاتل ہی منصفوں میں ہو جیسے کوئی ظفر
انصاف کیسے مِلتا، عدالت ہی بک گئی

صابر ظفر۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

شاہد حمید

غزلیں

دل بے خبر کہ سمتِ خود آگاہ پہ لگا
کِس راہ سے چلا تھا یہ کِس راہ پہ لگا

کیوں گردِ خاکِ پائے زمانہ بنے یہ حسن
اِس لوحِ سنگِ عشق کو درگاہ پہ لگا

اے بحرِ بے کنارِ وجودِ خیال سُن!
صحرائے بے خیال سے مَیں راہ پہ لگا

تعبیر سے ہدف پہ ہے آنکھ خواب میں
تقدیر سے یہ مُہر رُخِ ماہ پہ لگا

وہ قُفل جس کے کُھلنے سے ہو حشر کو قرار
از خود کہ دل گرفتۂ بے آہ پہ لگا

شاہد پہل چراغِ روایت بجھانے کی
اِک تیرِ بے نیاز کمیں گاہ پہ لگا

(۲)

دیکھئے خواب اور تعبیرِ ثمر بارِ حیات
فرق اِک اور اُٹھا لایا سزاوارِ حیات

شعلۂ دہر سے ہو جائیں اگر راکھ وجود
کِس توقع پہ اُٹھاتے ہیں غمِ بارِ حیات

مشعلِ غم سے فروزاں جو نہیں دیدہ و دل
خاک ہی خاک ہے اُس کے لئے پندارِ حیات

زندگی اور ہی انداز سے کرتے ہیں ظہور
نغمۂ عشق سے پیوستہ رگ و تارِ حیات

سپرِ سینۂ تقدیر یہ دل بارِ قدم
اپنی طاقت پہ اُٹھاتا ہے سرِ خارِ حیات

اور کبھی صورتِ شمشیر بھی کرتا ہے نظر
از رہِ خیر و وفا مونس و غمخوارِ حیات

شاہد عشق تیقّن سے جُدا کام نہیں
موت سے ہاتھ ملاتے ہیں طلبگارِ حیات

شاہد حمید۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

بسیرا

احمد مبارک

نظم

اے ارضِ بے قراری
تھکتی سی جا رہی ہے
جیسے تری سواری
روتی ہوئی بہاریں
ہنستی ہوئی خزائیں
اور عمر کی مسافت
آباد کے اثر میں
اسباب چُن رہی ہے
برباد کے سفر میں
کچھ خواب بُن رہی ہے
گُم ہو گیا ہے سب کچھ
بے چارگی کی حد پر
بیٹھی ہوئی ہے رہ میں
بندِ قبا کو کھولے
اک شامِ اجنبیت
بے وصل ذائقے میں
اُلجھا رہوں گا کب تک؟
آندھی ہے بے نہائیت
اُڑتا رہوں گا کب تک؟
جانا تھا دُور مجھ کو
انجان کی حدوں پر
آبادیوں سے ہٹ کر
حیران سرحدوں پر
یہ خوابِ بے حقیقت
کچھ دیر تک رہے گا
بے کار و بے اثر میں
کچھ دُور بہے گا
رُکتے ہوئے رُکے گا
اِس قافلے کا ڈیرہ
گرتے ہوئے گرے گا
یہ خاک کا بسیرا

احمد مبارک۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

دوری تو نہیں

شاہین مفتی

نظم

جب کبھی موسمِ ہجراں کی گھٹن بڑھتی ہے
اک نہ اک آس کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں
حرفِ وعدہ کسی فردا پہ اُٹھا رکھتے ہیں
دلِ خوش فہم کو باتوں میں لگا کر اکثر
ہم یہی سوچ لیا کرتے ہیں
بس کسی روز یونہی جا کے منا لیں گے اُسے
بس کسی روز صدا دے کے بلا لیں گے اُسے
وہ جو آواز کی دوری پہ کہیں رہتا ہے
اور آواز کی دوری کوئی دوری تو نہیں

شاہین مفتی۔ سکونت : جلال پور جٹاں گجرات (پاکستان)

میں حیراں ہوں

نظم

رب نواز مائل

یہ تُمھارا، ہر بات پہ قہقہہ لگانا
ہمیشہ بہت خُوش سا، نظر آنے کی کوشش کرنا
کبھی نہ کسی بھی شخص کو
افسوس میں پُورا کرنا
کوئی بھی سطرِ غم یا سطرِ ماتم
پڑھنا نہ لکھنا
اِس ہمارے، برسوں کے ساتھ میں
جانے تُمھارے، اسلوبِ حیات سے
کیا ہے
(میں حیراں ہوں)
کیا تُم واقعی بہت خُوش ہو
واقعی بہت امیر ہو (جس سے میں بے خبر ہوں)
اور یا پھر، بہت پہنچے ہوئے ہو
بہت بڑھے ہوئے ہو
جہاں کسی کا، کسی کے بارے میں بھی اِدراک
بہ ہر دلیل
بس صفر اور صفر، ہی ہو سکتا ہے

رب نواز مائل۔ سکونت: کوئٹہ (پاکستان)

غزل

کہاں تلک چہرہ' قاتل کو ہم اُترا ہُوا دیکھیں
سرِ مقتل چلو اپنا ہی سر کٹتا ہُوا دیکھیں

اُنہیں لوگوں نے ہم کو دار پر ہنستے ہوئے دیکھا
یہ سوچا تھا جنھوں نے خوف سے سہما ہُوا دیکھیں

میاں اِک دن جلا کر اپنے ہی ہاتھوں مکاں اپنا
"یہ چاہا تھا کہ منظر شہر کا بدلا ہُوا دیکھیں"

یہی جذبہ لئے ہم آج شہرِ گُل میں آئے ہیں
کہ اب اپنا بھی دامن خار سے اُلجھا ہُوا دیکھیں

ملا ہے زخم تو دل کو، مگر یارو' مزہ جب ہے
اُسے بھی عارضِ گُل کی طرح دمکا ہُوا دیکھیں

ہماری آنکھ میں جو موجزن ہر وقت رہتا تھا
وہ کب چاہا کہ اُس دریا کو ہم ٹھہرا ہُوا دیکھیں

فراغ' اب یہ دعائیں دے رہے ہیں قدرداں تیرے
کہ اِک دن شہرِ فن میں قد ترا اُبھرا ہُوا دیکھیں

فراغ روہوی۔ سکونت: کلکتہ (بھارت)

ملگجی شام کے سمندر میں شاک انگیز تجربہ نظم

ساجد حمید
نظم

سوچ رہا تھا
سینے میں دل کیوں ہوتا ہے
دل میں کیوں ہلچل ہوتی ہے
جذبوں کا ماحاصل کیا ہے

سوچ رہا تھا
آنکھوں میں کیوں نیندیں ہوتی ہیں
نیندیں کیوں سپنے ہوتی ہیں
سپنے کیوں قاتل ہوتے ہیں

سوچ رہا تھا
ذہن میں کیوں سوچیں ہوتی ہیں
سوچوں میں کیا دل ہوتا ہے
کیا جذبہ شامل ہوتا ہے

سوچ رہا ہوں
میں کیوں ایسا سوچ رہا تھا

ہنسی آ رہی ہے
نہ جانے مجھے کیوں ہنسی آ رہی ہے
میں ہنسنے لگا ہوں
مگر.......... ہنستے ہنستے
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
کہ میں رو رہا ہوں
میں کیوں ہنس رہا ہوں
میں کیوں رو رہا ہوں
کسی نے پوچھا
نہ دل نے
نہ تم نے

ساجد حمید۔ سکونت: شموگہ (بھارت)

غزل

عطا عابدی

کسی کی یوں عنایت چاہتا ہوں
زمانے کی شکایت چاہتا ہوں

کچھ ایسے غم ملے ہیں دوستی میں
میں اب سب سے عداوت چاہتا ہوں

کشادہ ہے زمیں اور پاؤں سالم
میں کب اذنِ اقامت چاہتا ہوں

ہوں دورِ تو کا میں بھی ایک حصہ
مگر اگلی شرافت چاہتا ہوں

خطا کا پتلا ہوں اور ہوں عطا کیا
ہر اک لب پر شکایت چاہتا ہوں

ق

وہ جو بچھڑا ہے کل، ملنے کی اس سے
مرے یارب!! اجازت چاہتا ہوں

تو محرم ہے شکستِ برگِ نو کا
خموشی کی سماعت چاہتا ہوں

پرندہ اڑ گیا ہاتھوں سے اور اب
ہواؤں کی حمایت چاہتا ہوں

سنا ہے، منتظر ہوگا وہاں وہ
عطا اب میں قیامت چاہتا ہوں

عطا عابدی۔ سکونت: پٹنہ (بھارت)

محبت

کاوش عباسی — نظم

اِک طرف حُسن ہے، بلا کا حُسن
مگر اُس سمت آنا کا نقصاں ہے
دُوسری سمت حُسن ہے کچھ کم
پَر محبّت وہاں فراواں ہے

ہر ابھی فیصلہ اے دِل سُن لے
فیصلہ جس میں مجھ کو راحت ہے
جھٹک اِس جذبِ حُسنِ کامل کو
اور اُدھر چل جہاں محبّت ہے

ایک اور محبّت — نظم

Love Secrecy

سُنو میں تم کو چاہتا ہوں بہت
تم کسی اور کی تو ہو، ہاں ہو
پَر تمہیں میں بھی چاہتا ہوں بہت
ہر اول بھی تمہارا عاشق ہے
میں بھی جی جاں سے تم پہ مَرتا ہوں
دیکھ کر تم کو، یاد کر کے تمہیں
بَس تمہارے جنوں میں جیتا ہوں

تم کسی اور کی تو ہو پَر کیا،
اگر اُس کو نہ کچھ خبر ہو کبھی
میں بھی کچھ لمحے وقت سے لے کر
تمہیں خود میں اُتار سکتا ہوں
کیا یہ ممکن ہے میں بھی اس کی طرح
جام پی لوں تمہاری اُلفت کا
جی لوں جیون تمہاری چاہت کا

کاوش عباسی۔ سکونت: ریاض (سعودی عرب)

آسمانی کبوتر گم ہونے کے بعد

نظم

خالد ریاض خالد

ایک روز پیاس بہت بڑھ گئی تھی
ہوا نے میرا ساتھ......
آسمانی کبوتر گم ہونے کے بعد
چھوڑ دیا تھا
ترا سب کچھ تری تحویل میں رہا
میرا، مجھ سے بچھڑا ہوا قافلہ
تنہائی نگل رہی تھی
میں کسی بوسیدہ خیال کے
طاق پہ، بیٹھا دیکھتا ہوں
کہ تیرے ہونے والے، حاملہ دنوں کو
دیمک چاٹ رہی ہے
ایک روز پیاس بہت بڑھ گئی تھی
اور زندگی کے کنوئیں میں
تشنگی کا زہر، تری آنکھوں سے گرا تھا
میں اس دن بھی، گونگا بن کر
سچے لفظ چبا رہا تھا
ترا شعور تری بھول سے نکل کر
اندھے زمانے کے دریا میں
قطرہ قطرہ مل رہا تھا
ایک روز پیاس بہت بڑھ گئی تھی
اور آسمانی کبوتر ملنے کے بعد بھی......
ہوا نے میرا ساتھ کب دیا تھا

نظم

خواہش کا پھٹا لبادہ......
رات کے باسی مسکن پہ، اُونگھتا ہے
اس کے وعدے، وقت کی کھڑکی میں
جگالی کرتے ہیں
مگر فیصلے کا بچھڑا جنم نہیں لیتا

نظم

چُپ کی مُہر

ارمانوں کے ڈاک خانے میں
جیون ایک گم شدہ
خط کی مانند ہے
جس پہ، تری چُپ کی مُہر لگی تھی

خالد ریاض خالد۔ سکونت: ملتان (پاکستان)

غزلیں

شکیل جمالی

بادل جب سے خاک اُڑانا سیکھ گئے
ہم کاغذ کے پھول بنانا سیکھ گئے

زرداروں کی صحبت سے نقصان ہُوا
لیکن چنے کار چلانا سیکھ گئے

آفت تو بستی کے سر سے نہیں ٹلی
لوگ دُعا کو ہاتھ اُٹھانا سیکھ گئے

ہم میں جن دو چار کے لہجے روشن تھے
وہ بھی جھوٹی قسمیں کھانا سیکھ گئے

اب یہ دُکھ ہے شر پھیلانے والوں کو
لوگ گھروں سے باہر آنا سیکھ گئے

اُس دن شاید تو بھی یاد نہیں آئے
جسدن دو کپ چائے بنانا سیکھ گئے

جب سے موسم آیا ہے لا علمی کا
سب گنڈے تعویذ بنانا سیکھ گئے

(۲)

یہ کیسی راہ اندھیاروں میں نکلی
ہوا میرے پرستاروں میں نکلی

ستم اس مرتبہ اردو پہ ٹوٹا
خبر ہندی کے اخباروں میں نکلی

دلوں میں جانے کب سے پل رہی تھی
یہ کڑواہٹ جو تہواروں پہ نکلی

چاکوئی نہیں شرمندگی ہے
کمی سارے وفاداروں میں نکلی

نگاہیں پارساؤں پر لگی تھیں
مگر نیکی گنہگاروں میں نکلی

شکیل جمالی۔ سکونت: بجنور (بھارت)

غزل

ظفر مہدی

میں ہوا رہینِ الفت تری جُنبشِ نظر سے
کہ تمام رنج و راحت تری جنبشِ نظر سے

مرے دل کے خاکداں میں کہیں زندگی نہاں تھی
ہوئی ختم ساری کلفت تری جُنبشِ نظر سے

کسی وہم کے اثر میں، پس و پیش تھا سفر میں
مجھے مل گئی اجازت تری جُنبشِ نظر سے

ذرا سرد ہو چلی تھی مری آتشیں محبت
کہ فزوں ہوئی حرارت تری جُنبشِ نظر سے

یہ کلام کی بلاغت، ترے در کی ہے عنائیت
کہ عطا ہوئی فصاحت تری جُنبشِ نظر سے

مرے روبرو ہراساں، یہ مُنافقت کی دنیا
ملی جرات و جسارت تری جُنبشِ نظر سے

تو جمالِ شبنمستاں، میں کمالِ چشم حیراں
کوئی اور ہو بشارت تری جُنبشِ نظر سے

میں جرس ہوں کارواں کا، یہی طور ہے فغاں کا
مری زندگی کی صورت تری جُنبشِ نظر سے

جو لگی ظفر پہ تہمت کہ ہے شکستہ محبت
یہ ہوئی ہے اُسکی حالت تری جُنبشِ نظر سے

ظفر مہدی۔ سکونت: ریاض (سعودی عرب)

عادل حیات

غزل

حادثے ہوتے رہے اور قہقہہ لگتا رہا
آج سارے شہر میں یوں امن کا چرچا رہا

شاخ پر تتلی رہی اور پھول پر بھنورا رہا
میں کہ محروم ازل تھا ایسا کا ایسا رہا

وقت کی قاتل ہوائیں شور کرتی ہی رہیں
اور چراغِ دل لہو سے رات بھر جلتا رہا

شہر پر چھایا ہوا تھا ابر کا اک سائباں
پھر بھی میرے گھر کے اوپر دھوپ کا سایا رہا

ہنستے ہنستے سب ستارے سو گئے عادل حیات
میں کہ مجبورِ محض تھا داستاں کہتا رہا

عادل حیات: سکونت۔ دہلی (بھارت)

غزلیں

زبیر شفائی

خیال و فکر سے ماخوذ استعارہ مرا
چمک رہا ہے گھنی دھوپ میں ستارہ مرا

علی الصباح سوا نیزہ آگیا سورج
بدن کچھ اور ابھی ہونا ہے پارہ پارہ مرا

سیاہ پوش ہوں میں پاؤں کے انگوٹھے تک
کھلے تو کیا نہ کھلے تو بھی کیا نظارہ مرا

تیرے جہان میں جائے اماں کہیں نہ سہی
مگر زمین کی حد تک نہیں گزارہ مرا

یہ سوچتا ہوں کہ اعراب حرف کم کر لوں
کسی کسی کو نہیں ہے سخن گوارہ مرا

الجھ کے ٹوٹ گئی ایک ایک سانس مری
یہ آئینہ نہیں صیقل ہوا دوبارہ مرا

زبیر سرمد ثانی ہے یہ جدید غزل
بہت لطیف ہے دشوار و سہل اشارہ مرا

(۲)

تقدیر کی گرفت میں تدبیر کس کی ہے
یعنی خط کشیدہ میں تحریر کس کی ہے

صحرا میں گھومتا ہوں بگولے کے ساتھ میں
میرے تصرفات میں جاگیر کس کی ہے

دن ڈوبتے ہی جیسے مجھے کھینچتا ہے گھر
یہ صرف ایک پاؤں میں زنجیر کس کی ہے

اب بار بار کس کی طرف مڑ رہی ہے لو
ظلمت شکن چراغ میں تنویر کس کی ہے

قاتل بھی سر بریدہ ہے مقتول کی طرح
یہ زندگی کے ہاتھ میں شمشیر کس کی ہے

آج آرٹ گیلری میں بڑی بھیڑ ہے زبیر
پیدائشی لباس میں تصویر کس کی ہے

زبیر شفائی۔ سکونت: کانپور (بھارت)

غزلیں

سید قمر حیدر قمر

نہیں قبول کہ تکریم مصلحت ہی کروں!
میں شعر کہتے ہوئے بھی منافقت ہی کروں!

یہ کس کتاب میں آیا ہے کوئی بتلائے
وہ جو بھی بات کریں، میں مخالفت ہی کروں

ہر ایک بار تساہل ہو میری جانب سے
ہر ایک بار میں اظہارِ معذرت ہی کروں

مرے مزاج کی تطہیر کے خلاف ہے یہ
کہ اہلِ مکر سے بھی میں مصالحت ہی کروں

یہی تو شیوۂ صاحب نظراں ہے یارو
میں احترامِ قوانینِ مملکت ہی کروں

(۲)

میں مہر و ماہ و ستارہ نہیں۔ اُجالا ہوں
میں ہر چراغ سے پہلے چمکنے والا ہوں

جو دہر کی کسی تہذیب میں نہیں ملتیں!
میں اُن عظیم روایات کا حوالہ ہوں

ابھی فروغ میں ہے اشتباہ مسائل کی
میں اب بھی شہر کے حالات کا نوالہ ہوں

مجھے لبوں سے لگانا بھی اتنا سہل نہیں
بھرا ہوا جو لہو سے ہو وہ پیالہ ہوں

کوئی ستائے مجھے اور میں بد دُعا دوں اُسے
نہیں۔ میں ایسی بھی پستیوں سے بالا ہوں

سید قمر حیدر قمر۔ سکونت۔ جدہ (سعودی عرب)

غزل

سعید اقبال سعدیؔ

مدارِ وقت کی پھیلی گھٹن سے خوف آتا ہے
مجھے دھرتی کے سینے کی جلن سے خوف آتا ہے

جلا کر راکھ کر دیتی ہے جسموں کو تپش اس کی
مجھے نفرت بھری لو کے چلن سے خوف آتا ہے

کرے وہ سامنا میرا نکل کر دھوپ میں کیسے
اندھیرے کے پجاری کو کرن سے خوف آتا ہے

بناتی ہے محبت کا محل خوابوں کی اینٹوں سے
دلِ معصوم کی اندھی لگن سے خوف آتا ہے

کہیں شوخی میں آکر ہی نہ پتھر مار دے کوئی
مجھے شیشے کے اس خستہ بدن سے خوف آتا ہے

ستاروں کے سفر کا شوق ہے اب اوج پر لیکن
مجھے گمنام رستوں کی تھکن سے خوف آتا ہے

وہ اپنی آرزوئیں دفن کر لیتے ہیں سینوں میں
جنھیں رسموں کے بھرو کیلے کفن سے خوف آتا ہے

دعائیں کس طرح مانگوں میں لمبی زندگانی کی
مجھے ہستی کے اس راہِ کٹھن سے خوف آتا ہے

سجیں اب کس طرح شعر و سخن کی محفلیں سعدیؔ
ہمارے حکمرانوں کو سخن سے خوف آتا ہے

سعید اقبال سعدی۔ سکونت: گوجرانوالہ (پاکستان)

غزل

عادلؔ فریدی

ترے لہجے کی خوشبو سے معطر ہے فضا اب تک
در و دیوار میں محفوظ ہے تیری صدا اب تک

اگرچہ وقت کی پرکار اک لمحہ نہیں ٹھہری
ہے پھر بھی نامکمل زندگی کا دائرہ اب تک

کوئی امکاں نہیں ہے لوٹ آنے کا مگر پھر بھی
دیے طاقوں میں رکھے ہیں دریچوں میں ہوا اب تک

گزرتے وقت نے سب کچھ بدل ڈالا نہیں بدلے
تری تصویر اور میری نظر کا زاویہ اب تک

عجب کیا کوئی رُت مژدہ سنا دے تیرے آنے کا
بس اس امید پہ ہارا نہیں ہے حوصلہ اب تک

تری آواز سننے کو ہیں کب سے منتظر عادلؔ
چمن میں تتلیاں، غنچے، گلِ تر اور صبا اب تک

عادلؔ فریدی۔ سکونت۔ کراچی (پاکستان)

لاتیقن میں سفید رنگوں کا پھیلاؤ

نظم

کے بی فراق

اور مری خاموشی
جس کے اندر ہی تو میں
خیالوں کی
موہوم گھنی چھاؤں میں
تن کو ڈھانکے ہوئے اک مدت سے
کوئی آئے تو بتادوں اُس کو
کشٹ اُٹھائے ہوئے اُن ارماں کا
جن کا اب تک کوئی مفہوم نہیں

نظم

یہ نظم نہیں میری آرتی ہے

کالی کلوٹی جسم کو وو نیم کرنے کیلیے
جب دِکھائی لہر صورت انوکھی روشنی
ماں کے سپنے ون پہن کر
ہو گئے سب
سیال جذبے کی دھڑکتی چاہتیں
اندیکھے وچاروں کے جِلو میں
بہہ گئی جو......
رب لچیلی
انگلیوں کی
پوروں میں روشن ہو گئیں

کے بی فراق۔ سکونت: گوادر (پاکستان)

مستقبل

اکمل شاکر

نظم

خواہشوں کا خون کر کے
ایک بچہ
غم کے زنداں میں
ہمیشہ نیلی پیلی گاڑیوں کے اُس تصور میں
دبا دیتا ہے دل کی حسرتوں کو
صرف خدا کو یاد کر کے
روتے روتے صبح کی اُمید پر
شب کو رُلاتا ہے

دُکھ میرا سرمایہ ہے — نظم

جسم کے چھالے
جب پھوٹیں
غم کے بادل چھا جاتے ہیں
کوئی بچہ
کیکر کے اُس پیڑ کے نیچے
برسوں اپنی خواہش کی آبیاری میں
پیاس کی بھیگی بھیگی پلکیں
دھوپ کے صحن میں ٹانکے اکثر
مایوسی کے گیت سنا کر کہتا ہے
دکھ میرا سرمایہ ہے

غزل

ایسے پڑے ہیں درد کے چھالے زمین پر
تارے کسی نے جیسے اُچھالے زمین پر

میں آسماں کی سمت کسے ڈھونڈ لاؤں گا
اب تک ہیں میرے چاہنے والے زمین پر

ابرِ رواں برس جا کسی خشک کھیت پر
زخموں کی سبز گھاس اُگا لے زمین پر

شہرت کی اُن بلند خلاؤں کو چوم کر
ہم نے خود اپنے عیب نکالے زمین پر

یارب عوام دل پہ گزرتی ہیں آندھیاں
کچھ دیر تو بھی اشک بہا لے زمین پر

شاکر جس آسماں پہ ستارے نہیں رہے
قیمت اُس آسماں کی لگا لے زمین پر

اکمل شاکر۔ سکونت: پسنی (پاکستان)

اپنے والد کی وفات پر

نثار احمد نثار

نظم

بہت جلدی خرابے سے رہائی ہو گئی
حاصل تمہیں
بہت جلدی سزائے عمرِ دوراں
کاٹ لی تم نے
مگر تم نے نہیں سوچا
تمہارے بعد اس ویراں جزیرے میں
میں کیسے رہ سکوں گا
مجھے بھی ساتھ اپنے لے گئے ہوتے تو اچھا تھا
تمہارے بعد اس ویراں جزیرے کی ہر ایک آنکھیں
مجھے یوں دیکھتی ہیں
کہ کبھی دیکھا نہیں جیسے
بہت حیرت زدہ ہوں میں
تمہیں آنکھیں مری
ویران سمتوں میں
خلاؤں میں
ہمیشہ ڈھونڈتی رہتی ہیں
لیکن تو کہیں پر بھی نظر آتا نہیں
ذرا سوچو
زمانے کی ہواؤں سے
بچا پاؤں گا کیسے
آشیاں اپنا
اکیلا میں

غزل

شام ہو جانے کو ہے سورج مگر نکلا نہیں
کیا زمیں کا آسماں سے رابطہ اچھا نہیں

معرکے عشق و محبت کے بلاشبہ سر کیے
خود کبھی دیرِ غضب میں فتح سر پایا نہیں

قفل کھلتا ہی نہیں ہے خانۂ ادراک کا
مشغلہ شعر و سخن کا آج کل ہوتا نہیں

میری خواہش تھی کہ اڑ کر جا بسوں میں عرش پر
بولتی ہے سچ بھی فرشِ خاک پر بچا نا نہیں

میں نے دیکھے ہی نہیں آئندہ و فردا کے خواب
زندگی کیسے کٹے گی یہ کبھی سوچا نہیں

نثار احمد نثار۔ سکونت: سمستی پور (بھارت)

"آدھے سیارے کا نوحہ"

نظم

فاروق احمد مغل

پورے سیارے پر جاکر
تم نے ثروت!
سوچا ہے!
جن کو "آدھے سیارے پر"
چھوڑا تھا
وہ کیسے ہیں؟
وہ آنکھیں جو ہر آہٹ پر
تم کو ڈھونڈتی رہتی ہیں
وہ آنکھیں
کیا خشک ہوئیں؟
یا اب بھی روتی رہتی ہیں
وہ بیٹا
جو ہاتھ پکڑ کر
ساتھ تمہارے چلتا تھا
وہ چہرے
جو تم کو دیکھ کے
روشن روشن
رہتے تھے
کیا اب اُن کے بجھتے چہروں کی
کومل آنکھیں روشن ہیں
تم نے تو کچھ بھی نہ سوچا
اور سبھی سے ناطہ
توڑا
لیکن وہ آدھا سیارہ
جس کو چھوڑ کے آئے تھے
اب تک تم کو ڈھونڈ رہا ہے
اور یہ سب سے کہتا ہے
پورے سیارے نے ہم سے
پیارا ثروت
چھین لیا......

(ثروت کی ناگہانی موت پر ایک تاثراتی نظم)

فاروق احمد مغل۔ سکونت: حیدرآباد (پاکستان)

ہوائیں امیں ہیں

نظم

سحر علی

ہوائیں پکڑتی ہیں
ایسی مہک کو
جو محبت سے نکلی ہو، محبت رہی ہو
ہوائیں سمجھتی ہیں
ایسی نظر کو
جو کسی دل میں بس کر کہیں کھو گئی ہوں
ہوائیں تو چنتی ہیں
ان آنسوؤں کو
جو کسی پھول کی آنکھ سے گر گئی ہوں
ہوائیں سلگتی ہیں
ایسی لگن پر
جو اک پل کو بھڑکی ہو، اور بجھ گئی ہو
ہوائیں لپٹتی ہیں
ان آنچلوں سے
کہ جن میں یادوں کی گرہیں لگی ہوں
ہوائیں تو گنتی ہیں
ان خواہشوں کو
جو پوری کہیں ہوتے ہوتے رہی ہوں
ہوائیں تو روتی ہیں
ان رتجگوں پر
جو ازل سے کسی آنکھ میں رک گئی ہوں
ہوائیں سسکتی ہیں
ان دستکوں پر
جو صدیوں سے دل کے در پہ کھڑی ہوں
ہوائیں پلٹتی ہیں
اس رہ گزر سے
جو کسی پاؤں کی منزلیں نہ رہی ہوں
ہوائیں بھٹکتی ہیں
اس چاندنی میں
جو شبِ غم کے چہرے پہ پھیلی ہوئی ہوں
ہوائیں بھی ہنستی ہیں
ایسی خوشی پر
جو کسی کے لئے غم کا کارن بنی ہوں
ہوائیں تڑپتی ہیں
ایسی وفا پر
جو بھروسے کے ہاتھوں میں میلی ہوئی ہوں
ہوائیں امیں ہیں
اس زندگی کی
جو ہو کر ہماری، ہماری نہیں ہے

---

1 سحر علی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

”میرا دل اک دعا ہے“

نظم

فوزیہ اختر

جب میں نے اُس سے کہا
جانے کیوں!
میرے ہاتھ نہیں اُٹھتے دعا کیلئے
میں کیسے کچھ مانگوں
خواہشوں کی تکمیل کی دعائیں
میری کوئی آرزو نہیں
بھلا میں تمہیں کیسے بتاؤں
میرا دل خود اک دعا ہے
مگر!
کیا آج میں وہ دعا مانگ لوں؟
میرے خدا مجھے پچھلے ماہ و سال
لوٹا دے
صرف ایک بار

”ان کہی بات“

نظم

کچھ باتیں
ان کہی ہوتی ہیں
اور اکثر ایسا ہوتا ہے
وہ! ان کہی رہ جاتی ہیں
تو شاید!
راستوں کی بھول بھلیوں میں
ہمارا کچھ تو باقی رہتا
ہاں! یہ پچھتاوے تو نہ ہوتے
زندگی اتنی بے معنی تو نہ ہوتی
رنگ اتنے پھیکے تو نہ ہوتے
شائد ہماری آنکھوں نے ہمیں فریب
دیا ہے
وہ جو سچ نہ کہہ سکی
اور وہ ان کہی بات
ان کہی رہ گئی

فوزیہ اختر۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

عکسہ صدیقی

نظمیں

رگِ آب کی صدا ۔

دل دُکھاتا لمحہ گزر گیا
فراموش کردو
وہ گزرا لمحہ بھی اپنا تھا
جو گزر رہا ہے یہ لمحہ بھی اپنا ہے
جو نہیں ہوا — اچھا ہوا —
ہونا ہی ہے — تو
خوش آئند ہو خوش آگیں ہو — یہ بھی
رگِ آب کے چلتے ٹکڑوں کی صدا ہے ۔ یہ
سلگتے دل کی دُعا ہے ۔

۲

کیا ہے — ؟

" زندگی ؟
بارش میں کھلتی قوس و قزح
دھڑکن ؟
برگ میں اُتری شبنم
سانس ؟
گلال شام کی شفق ۔ "

۳

گوہرِ ناتراشیدہ ۔

" گناہ
گدازِ محبت کے
تہی دل
مثلِ خالی سیپ "

عکسہ صدیقی ۔ سکونت کراچی (پاکستان)

غزل

حصیر نوری

پگھن کر دھوپ بادل جب سروں پہ مہرباں ہو گا
خلاؤں پر زمیں ہو گی زمیں پر آسماں ہو گا

ابھی تو آگ کے شعلوں سے میرا ہاتھ جھلسا ہے
مرے ہی آنسوؤں سے جسم بھی جل کر دھواں ہو گا

مرے سوزِ دروں پہ آبِ ہمدردی کے چھینٹے دو
نہیں تو آگ کا دریا مرے اندر رواں ہو گا

درندے جنگلوں کو چھوڑ کر شہروں میں آئے ہیں
جواب ہو گا یہاں وہ جنگلوں میں پھر کہاں ہو گا

مرا تو روشنی کے شہر سے دیرینہ رشتہ ہے
اندھیروں کے پرستاروں کا لیکن امتحاں ہو گا

مرا غم، میری تنہائی کو خاطر میں نہیں لاتا
ابھی تو ساتھ ہے میرے ابھی جانے کہاں ہو گا

سوائے صبر کے چارہ نہیں ہے اس زمانے میں
وہاں جو کچھ ہوا ہے اب وہی سب کچھ یہاں ہو گا

جہاں اک انفرادی سانحہ تکمیل پایا ہے
عزائم سے وہاں معمور ہر اک ناتواں ہو گا

حصیر اس کے رویے پر اگر کچھ بھی کہا میں نے
مجھے معلوم ہے سنکر وہ مجھ سے بدگماں ہو گا

حصیر نوری۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

انجلا ہمیش — نظم

خواب میں دکھ ہیں، آنسو ہیں
میری نیند میری اذیت ہے
ڈرتی ہوں طویل نیند سے
جاگنا چاہتی ہوں مگر خواب جکڑ لیتے ہیں
میں ادھورے نظریوں میں زندہ رہنے والی
ادھوری ذات
دل کہیں ٹھہر گیا ہے......
چلنا چاہتی ہوں مگر قدم جم گئے ہیں
ایسا کوئی مسیحا نہیں
جو اندر کے دروازے کھول دے
یقیں کیا ہے بے یقینی کیا ہے
اس سوال کا کوئی جواب نہیں
جس سے کوئی آس امید نہیں
اس کے لئے اتنا دردکیوں
میں الجھ گئی ہوں سلجھنا چاہتی ہوں
مگر کوئی راستہ نہیں
میری چیخیں میرے اندر
مر کیوں نہیں جاتیں
آوازوں میں چھپے جذبات پکارتے ہیں
واپس آجاؤ......
مگر وہ نہیں جانتے کہ دل کہیں ٹھہر گیا ہے

کب تک ہم ایک دوسرے سے
لاتعلق رہیں گے
ہم ایک دوسرے کو بھول گئے ہیں یا
رد کر چکے ہیں
ہمارا تمہارا کیا رشتہ ہے! اب یاد نہیں
کتنی گہری خاموشی ہے ہمارے بیچ
آنکھوں میں اتنی اجنبیت ہے
جیسے جانتے ہی نہ ہوں
ہم سے ہمارا آپ چھن گیا
ہم کھو گئے ہیں
ہاں کچھ ایسے پچھتاوے ہیں
جو ہمارے وجود کا ناسور بن چکے ہیں
خون میں رچے بسے گناہوں کا
کوئی ازالہ نہیں
ہمیں ہمارے ہی آسیب نگل رہے ہیں
بہت تھکا دینے والا سفر ہے
جسم کے ساتھ روح بھی نڈھال ہو چلی ہے
آزاد ہونا چاہتی ہے
اب کبھی لوٹ بھی آئے تو
دل اجڑ چکا ہوگا
آنکھیں زرد ہو چکیں ہوں گی

انجلا ہمیش۔ سکونت کراچی (پاکستان)

آرزو

عظمیٰ حسن

نظم

کبھی ہم چاہتے ہیں جانے کیوں کچھ وقت تھم جائے
کبھی ہم چاہتے ہیں ہر پل ایسے گزر جائے
کہ اُسکی چاپ تک نہ ہو

کبھی ہم چاہتے ہیں
ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں
کبھی ہم مستقل خوشیوں سے بھی اُکتانے لگتے ہیں

کبھی تو ایسا لگتا ہے
کہ آنکھوں نے کبھی دیکھے نہیں آنسو
کبھی آنسو ہماری آنکھ کو دھندلانے لگتے ہیں
کبھی یہ چاہ ہوتی ہے سمندر میں اتر جائیں
کبھی ہم چاہتے ہیں
ہمیشہ ہی رہے موسم بہاروں کا
کبھی سوکھے ہوئے پتوں پہ چلنے کیلئے یہ دل مچلتا ہے

چلے جاتے ہیں ہم گھر میں کبھی تو در بناتے ہی
کبھی روزن کے کھلنے سے بھی ہم گھبرانے لگتے ہیں

عظمیٰ حسن۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

بیوی کے آنکھ کے آپریشن کے دوران

نظم

احمد ہمیش

جن آنکھوں نے ہماری آنکھوں اور پاؤں کے لئے راستہ بنایا
وہ ان دیکھے آسمان کی طرف چلی گئی
ایسے میں اگر ایک دِل بھی ہوتا تو اُس کے ہونے کے لئے
ایک آرزو ہی کافی تھی
اور ایک آرزو بھی اگر ہوتی تو وہ اپنے ہونے کے لئے
کپڑے کو گیلا کر سکتی تھی
اور اُسے کسی انگلی پر رکھا بھی سکتی تھی

غزل

درد ایک رات کی تصویر ہے اور کچھ بھی نہیں
رُوح کے زخم کی تفسیر ہے اور کچھ بھی نہیں

راستہ ہے نہ سفر صورتِ منزل بھی نہیں
دُور تک گردشِ تقدیر ہے اور کچھ بھی نہیں

یاد رکھنے کے لئے بھولنا چاہا ہے، بہت کچھ لیکن
دل میں ہر یاد گرہ گیر ہے اور کچھ بھی نہیں

زندگی موت سے ہر گام بندھی ہے گویا
آگ اور برف کی زنجیر ہے اور کچھ بھی نہیں

نیند میں خود سے بچھڑتے ہوئے دیکھا میں نے
موت اِس خواب کی تعبیر ہے اور کچھ بھی نہیں

اب سنبھلنے کے لئے گر کے بھی دیکھوں گا ہمیش
جو بھی ہونا ہے، وہ تدبیر ہے اور کچھ بھی نہیں

احمد ہمیش۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

I REMEMBER YOU AS YOU WERE

Pablo Neruda

(Chile, 1904-1973, Nobel Prize 1971)

I remember you as you were
in the last autumn

You were the grey beret and
the still heart

In your eyes the flames of the
twilight fought on

And the leaves fell in the
water of your soul

اُسی طرح مجھکو یاد ہو تُم

پابلو نرودا ترجمہ: ضمیر

[چلی - 1904-1973 - نوبل پرائز 1971]

اُسی طرح مجھکو یاد ہو تم
کہ جیسے پچھلی خزاں میں تھیں تم۔

وہ سُرمئی ٹوپی فوجیوں کی سی
اور دل خامشی میں گُم سُم ۔
وہی تو تھیں تم ۔
تمہاری آنکھوں کی سرخیوں میں
شفق کے شعلوں کا ایک رَن سا پڑا ہوا تھا
خموش پانی پہ رُوح کے ۔ گر رہے تھے پتّے ۔

Clasping my arms like a
climbing plant

the leaves garnered your
voice, that was slow and
at peace

Bonfire of awe in which my
thirst was burning

Sweet blue hyacinth twisted
over my soul

I feel your eyes travelling, and
the autumn is far off

grey beret,, voice of a bird,
heart like a house

towards which my deep
longings migrated

and my kisses fell, happy as
embers

کچھ اس طرح پیار سے میرے بازوؤں کو پکڑ لیا تھا
شجر پہ چڑھتی ہو بیل جیسے ۔

تمہاری آواز نرم و نازک شگوفوں کی حامل
خزاں کے پتوں نے اُس کو خود میں لپیٹ لیا تھا ۔
وہ خوف کا ۔ احترام کا ایک ادراک سا تھا
کہ تشنگی میری جس کے اندر تڑپ رہی تھی ۔
لپٹتی جاتی تھی رُوح پر میری نیلی سوسن ۔

مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
تمہاری آنکھیں سفر میں ہیں اور
خزاں بہت دُور ہے یہاں سے ۔
وہ سُرمئی پنچھی ترچھی ٹولی
تمہاری آواز چڑیوں جیسی ۔
وہ دل کہ ہو جیسے ایک منزل
جہاں سفر کر کے بس گئی ہیں
مری تمنائیں ۔ آرزوئیں ۔
جہاں مرے پیار میرے بوسے
خوشی میں جھنکاروں کی صورت
بکھر گئے ہیں ۔

Sky from a ship. Field from
the hillls.

Your memory is made of
light, of smoke, of a still
pond!

Beyond your eyes, farther on,
the evenings were blazing

Dry autumn leaves revolved
in your soul

(Translation in English by
W.S Merwin)

دکھائی دیتی ہو اس طرح تم
سمندروں میں جہاز سے آسمان جیسے۔
کہ جیسے میداں نظر آئے پہاڑیوں سے۔
تمہاری یادیں بنی ہوئی ہیں
دھوئیں سے، اور روشنی سے اور آبِ پُرسکوں سے۔
تمہاری آنکھوں سے ماورا دُور فاصلوں پر
اُفق پہ شامیں دمک رہی تھیں۔
تمہاری خاموش رُوح میں اُڑتے پھر رہے تھے
خزاں کے مُرجھائے سوکھے پتے۔
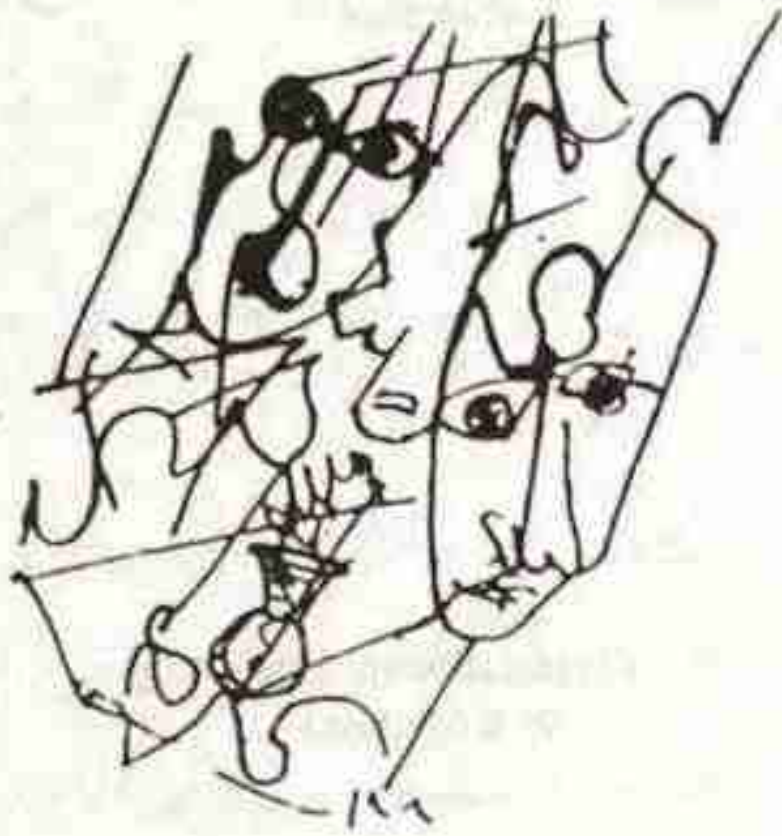
آگے بڑھنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے بارے میں کچھ اور عمومی لیکن اہم وضاحتیں پیش کر دیں۔ پہلی بات تو یہ کہ زیر نظر کتاب نارنگ کی تصنیف نہیں بلکہ محض تالیف ہے۔ انھوں نے ساختیات، پس ساختیات، رد تشکیل اور قاری اساس تنقید وغیرہ کے ضمن میں سوسیر سے لے کر جونیتھن کلر تک اور پھر رولاں بارتھ اور دریدا سے لے کر اسٹینلے فش (Fish) تک درجنوں مفکرین کے خیالات کا خلاصہ تو پیش کر دیا ہے لیکن شاذ و نادر ہی کسی مفکر کا اپنے طور پر نیز آزادانہ انداز میں تنقیدی محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

فضیل جعفری کے مضمون "ساختی کتاب میں رد تشکیل کی بڈی" سے چند سطریں

ارمان نجمی کے نام

تنقید

مرقعِ ذات

احمد ہمیش

ادارہ سہ ماہی تشکیل کے نام جمال اویسی کے خط میں تنقید کو بھی تخلیقی منصب کے قریب لانے کی بات کی گئی ہے۔ چونکہ تنقید کا اصل منصب تخلیقی شاعری اور تخلیقی کہانی کی دریافت ہے لہٰذا جس زبان میں بھی تنقید لکھی جاری ہو اس کے نقاد کو چاہیے کہ وہ اس زبان کی شاعری اور کہانی کے تخلیقی ماخذ پر بغور نظر کرے مگر یہ محقق اور نقاد کے دیانت دارانہ موقف پر منحصر ہے۔ مثلاً ریاض صدیقی تخلیقی نقاد تو نہیں...... صاحبِ مطالعہ نقاد ضرور ہیں ان کا مضمون "اردو شعر و ادب بیسویں صدی کے تناظر میں" سہ ماہی تشکیل میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ البتہ ایک امر محلِ نظر ہے کہ ترقی پسندی اور موقع پرستی کے کیمو فلاج سے ریاض صدیقی نے بھی ماہرانہ استفادہ کیا ہے۔ جبکہ انہوں نے اردو شعر و ادب کے متعلق جو حقائق بیان کئے ہیں، وہ بیشتر احمد ہمیش کے محققانہ و تنقیدی مضمون "ہماری کہانی کی تاریخ" (گذشتہ دس سال سے سہ ماہی تشکیل میں شائع ہو رہا ہے) کی اقساط سے اور شمس الرحمٰن فاروقی کی گراں قدر تصنیف "اردو کا ابتدائی زمانہ" سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر کہیں بھی انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی اور احمد ہمیش کی تحریر سے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی بڑی حد تک تخلیقی نقاد ہیں۔ انہوں نے شاعری اور کہانی کے تخلیقی ماخذ کی دریافت میں بڑے کمٹمنٹ سے کام لیا ہے۔ حالانکہ ان سے یہ اختلاف تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ظفر اقبال کی غیر شاعری کو شاعری باور کرانے میں بھی اپنے کمٹمنٹ کو مدِ نظر رکھا ہے۔ تاہم اردو تنقید ابھی دریافت کے منصب پر پوری نہیں اترتی۔ البتہ اس بار عنبر بہرائچی نے علم و خلاقی کے باوصف اپنے مضمون "سنسکرت کی نثری شاعری" (جسے خاص طور پہ پہلے سہ ماہی تشکیل میں اشاعت کے لئے ارسال کیا گیا ہے) میں احمد ہمیش کے موقف کی تائید و حمایت کی۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ کوئی قابلِ توجہ تحریر اہلِ مطالعہ کے علم میں ذرا پہلے آچکی ہوتی ہے۔ جیسا کہ "ہماری کہانی کی تاریخ۔ ۱۲" میں شامل میر انیس کے متعلق ڈاکٹر ہلال نقوی نے یہ ورڈکٹ دیا ہے کہ "میر انیس کے متعلق اس سے پہلے کسی بڑے محقق اور نقاد نے نئی سوچ کا دروازہ نہیں کھولا"۔ اور ہاں! اس بار سہ ماہی تشکیل میں ذرا ڈگر سے ہٹ کر ابن صفی کے متعلق ڈاکٹر ایثار صفی کے مضمون کی پہلی قسط شائع کی جاری ہے۔ دراصل ابن صفی نے بڑی خوبصورت نثر لکھی۔ مگر اس کا کریڈٹ اہلِ نظر کی طرف سے ملنا ناگزیر ہے۔

طبع رواں، منظر معنی، اور بے شمار امکان

شمس الرحمٰن فاروقی

مضمون

ظفر اقبال کو ہمارے زمانے کا سب سے متنازعہ فیہ شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب متنازعہ فیہ ہونا زندگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی وہی شخص تو معرض بحث اور معرض سوال میں آئے گا جو لوگوں کو تشویش، تفکر یا مسرت سے دوچار کرے۔ مکمل اتفاق تو موت ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن آج کے ماحول میں لوگ بوجوہ زیادہ محتاط یا زیادہ عافیت پسند ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں کہ وہ خود اپنے لئے عافیت طلب کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہ ان لوگوں کے بارے میں ان کی رائے فوراً خراب ہو جاتی ہے جو عافیت طلب نہ ہوں یا عافیت میں نہ ہوں۔ (اگر وہ اچھا آدمی ہوتا تو بحث میں کیوں پڑتا؟) آج کا فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص معرض بحث میں ہے وہ کسی حد تک نامعتبر اور کسی حد تک خطرناک آدمی ضرور ہوگا۔ ظفر اقبال بہت دن سے موضوع بحث (زیادہ تر مخالفانہ بحث) رہے ہیں۔ لیکن ان کا پہلا کمال تو یہی ہے کہ چالیس بیالیس برس کی مدت شعر گوئی نے بھی ان کی اس صلاحیت کو کند نہیں کیا ہے۔ وہ نہ ایک کل بیٹھتے ہیں اور نہ اپنے پڑھنے والے کو بیٹھنے دیتے ہیں۔ بعض لوگ اسے غیر سنجیدگی سمجھتے ہیں (اور غیر سنجیدہ آدمی معتبر کیسے ہو سکتا ہے؟) بعض لوگ اسے غزل کے خلاف دہشت گردی سمجھتے ہیں (خدا ہم سب کو حفظ و امان میں رکھے۔) بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ظفر اقبال ایک عرصے سے غزل گوئی ترک کر کے ہزل گوئی، یاوہ گوئی، مہمل گوئی کی مشق کر رہے ہیں۔ (غزل کو بہو بیٹیوں والی چیز ہمارے بزرگوں حالی، حسرت وغیرہ نے ہزار مشکل سے بنایا تھا، اس کی بری عادتیں چھڑائی تھیں۔ اب ظفر اقبال اس کا کردار پھر بگاڑ رہے ہیں۔) لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ (۱) ظفر اقبال کی ہزل گوئی وغیرہ بھی انتہائی سنجیدہ چیز ہے۔ (۲) ان کے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اور (۳) ظفر اقبال جو کچھ کر رہے ہیں، یا جو کچھ انہوں نے کیا ہے، وہ کسی نہ کسی شکل میں ولی، سراج، میر، سودا، انشا، ناسخ، غالب نے بھی کیا ہے۔ اس فہرست میں اور بھی نام آ سکتے ہیں، میں نے صرف بالکل سامنے کے ناموں پہ اکتفا کیا ہے۔

ایک مشکل یہ ہے کہ خود ظفر اقبال غزل میں اپنے انقلابی اور احیائی کردار کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ کبھی وہ غزل کو نظم کے منطقے کی چیز منوانے کی بات کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ خود غزل کو پسند ہی نہیں کرتے۔ شاعر کے کلام سے گواہی لانے کے بجائے اس کے بیانات اور دعاوی سے گواہی لانے کے رسم ہمارے یہاں بہت پرانی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم شعر سے استدلال لاتے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ظفر اقبال نے غزل کے بارے میں ادھر ادھر جو باتیں کہی ہیں، لوگ انہیں ہی ظفر اقبال کا کلام سمجھ لیتے ہیں

دوسری مشکل، جو بڑی مشکل ہے۔ یہ ہے کہ لوگ ظفر اقبال کا مطالعہ حالی اور حسرت اور فانی کی غزل اور شعریات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یہ غزل اور یہ شعریات ظفر اقبال کو سمجھنے کے لئے نہ صرف ناکافی ہے بلکہ مضر بھی ہے۔ حسرت موہانی نے غزل کے لئے جن باتوں کو لازم قرار دیا ہے (اور جن کا اتباع اندھا دھند کیا گیا، اور جو آج بھی بڑی حد تک جاری ہے) ان میں سے اکثر باتیں کلاسیکی غزل کی شعریات سے بے خبری، اس کے اکثر تصورات کی ناقدری، اواخر انیسویں صدی کے بعض تنگ خیال اساتذہ، اور حالی کے رائج کردہ شعریات پر مبنی تھیں۔ ان کے برخلاف، ظفر اقبال کی غزل "روایتی" روایتی غزل سے باغی ہے اور غزل کی اصل روایت سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معاصر ذہن اور فکر کا اظہار کرتی ہے۔ زبان کے بارے میں اس کا رویہ ہمیں بعض جگہ جارحانہ اور "غیر شاعرانہ" محسوس ہوتا ہو تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ظفر اقبال کی غزل پٹری سے اتری ہوئی ہے، بلکہ یہ کہ ہماری تنقید اور غزل کے بارے میں ہماری فکر کلاسیکی صراط مستقیم سے ہٹ کر "شاعرانہ زبان"، "غزل کی زبان"، اور "تغزل" کی بے معنی وادیوں میں گم کردہ راہی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ کم لوگوں کو اس بات کا یقین آئے گا کہ "تغزل"، "شاعرانہ زبان"، "غزل کی زبان"، "غزلیت" جیسی اصطلاحیں ہمارے تذکروں میں نہیں ملتیں۔ اور تذکرے تو تذکرے ہیں اردو شاعری کے سب سے پہلے اور موثر جدید کار محمد حسین آزاد کی "آب حیات" میں بھی ان اصطلاحوں کا وجود نہیں۔ یہ اصطلاحیں (اگر انھیں "اصطلاح" جیسے موقر نام سے پکارا جائے) بیسویں صدی کے شروع کی دہائیوں میں انگریزی کی lyric کے تتبع اور نقل اور جواب میں ایجاد کی گئیں۔ جب ہماری غزل کے بارے میں اعتراض ہوئے کہ اس میں "از دل خیزد و بر دل ریزد" والی بات نہیں ہے۔ بلکہ "خیالی طوطا میناؤں" کی اڑانیں ہیں، تو کہا گیا ہے کہ نہیں، غزل تو دراصل ذاتی واردات اور داخلی تاثرات کا اظہار ہے۔ انگریزی میں lyric سے مراد لیتے تھے ایسی نظم یا کلام منظوم جس میں شاعر اپنے واردات بیان کرے اور اس کا مخاطب وہ خود ہو، کوئی اور شخص واحد اور یا کوئی مجمع نہ ہو۔ بیسویں صدی کے شروع میں ہمارے نقادوں نے مفروضہ قائم کیا کہ غزل بھی ایسی ہی شاعری ہے۔ اور جس طرح lyric کی صفت lyricism ہے، اسی طرح غزل کی صفت "تغزل" ہے۔ غزل اور قصیدے کا فرق بھی اسی مفروضے کے تحت یوں بیان کیا گیا ہے کہ قصیدے میں "شکوہ الفاظ" ہونا اس کا کوئی مخاطب ہوتا ہے۔ غزل کا کوئی مخاطب اصلاً نہیں ہوتا ہے، اور غزل میں "نرم و نازک، سبک، شیریں" الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے مومن کے "یاد ایام عشرت فانی، اور غالب کے "صبح دم دروازۂ خاور کھلا اور "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جیسے قصیدے نہیں پڑھے ہوں گے۔ ورنہ وہ اس بات پر اصرار نہ کرتے کہ قصیدے میں لازماً گھن گرج والے پر شکوہ، ڈھول تاشے کے مزاج سے ہم آہنگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ غالب کے موخر الذکر قصیدے کے بارے میں طباطبائی جیسے سخت گیر اور غالب کے خلاف تعصب رکھنے والے نقاد نے لکھا ہے کہ "اس سارے قصیدے میں عموماً...... مصنف نے اردو کی زبان اور حسن بیان کی عجب شان دکھائی ہے۔" پھر لکھتے ہیں کہ "میری نظر

میں یہ قصیدہ، خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے۔ مصنف مرحوم کے کمال کا، اور زیور ہے اردو کی شاعری کے لئے۔ اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی۔ "(ملحوظ رہے کہ طباطبائی نے اردو زبان اور حسن بیان کی شان کی بات کی ہے، اور تشبیب کی تازگی مضمون اسلوب کاذکر کیا ہے، شکوہ الفاظ اور رہنگ دہل کی بات نہیں کی ہے۔) یہ بھی نہ بھولئے کہ اکثر قصیدوں کی طرح اس قصیدے کے اندر بھی ایک غزل موجود ہے۔

اب رہی غزل، تو جن لوگوں نے "نرم و نازک، سبک، شیریں الفاظ" کی شرط اس کے لئے لگائی تھی، وہ لسانیات کے اس اصول سے تو ناواقف تھے ہی، کہ کوئی لفظ اصلاً نرم، نازک، سبک، شیریں وغیرہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا محل استعمال اسے ان صفات سے متصف کرتا ہے۔ انھیں غزل اور قصیدے کی تاریخ سے پہلے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ ورنہ وہ نہ اس میں منوچہری اور تاآنی جیسے قصیدہ نگاروں سے واقف ہوتے اور اردو میں آبرو، ناسخ، غالب، انشا، سودا، میر، جیسے شعرا کی زبان کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوتے کہ ان کی زبان ہر جگہ بہت "نازک" اور "سبک" ہے۔ عربی کی تراکیب اور الفاظ کے بارے میں ہمارے یہاں یہ خیال عام ہے کہ ان کا آہنگ ہماری زبان کے آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں نے کسرۂ اضافت تو قبول کر لیا، لیکن عربی کا الف لام نہ ہضم کر پائے۔ اس کے باوجود میر کو الف لام والی اضافتوں کو برتنے اور خاصی کثرت سے برتنے، اور عربی الفاظ اور فقرے غزل میں نظم کرنے سے کوئی عار نہ تھا۔ عربی کو اردو میں حل کرنے کی روایت (میں محض نظم کرنے کی نہیں، بلکہ حل کرنے کی بات کہتا ہوں) ہمارے یہاں اقبال کی غزلوں تک آتی ہے۔

نئے اور انوکھے یا نامانوس الفاظ، یا پڑوسی زبانوں کے الفاظ بقدر ضرورت یا بقدر شوق استعمال کرنے کی رسم ہمارے یہاں چھ سو برس سے رائج تھی۔ گجری اور دکنی (یعنی قدیم اردو) کے چند صفحات کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دے گا۔ پھر ولی اور سراج تک آتے آتے زبان کم پیچیدہ اور موجودہ طرز کے مطابق ہو چلی تو غیر زبانوں اور عربی کی آمیزش کا چلن کم نہ ہوا۔ بلکہ اس کے طرز میں ذرا زیادہ نفاست آگئی۔ ولی اور سراج اور جعفر زٹلی کو پڑھنا ہمیں غواصی اور نصرتی اور محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں سہل معلوم ہوتا ہے، لیکن اس لئے نہیں کہ اول الذکر کی زبان میں وہ حرکی (dynamic creativity) طباعی اور خلاقانہ طور طریق نہیں ہیں جو موخر الذکر کی زبان میں نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جعفر زٹلی، ولی، سراج آبرو وغیرہ کی زبان میں الفاظ کی وہ شکلیں زیادہ ہیں جو آج مروج ہیں۔ ورنہ الفاظ تازہ کی درآمد کے سلسلے میں یہ لوگ بھی کم و بیش گجری اور دکنی والوں کی طرح باہمت اور مہم جو ہیں۔ شاہ حاتم نے ایک حد تک اس تازہ کاری کو بند کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کسی نہ کسی شکل میں ناسخ بلکہ غالب تک باقی رہی۔ نیا زمانہ آتے ہی آتے شاعر پر یہ پابندی لگ گئی کہ وہ اپنی زبان کو اس منزل سے آگے نہ بڑھنے دے جہاں غالب اسے چھوڑ گئے تھے اور غالب خود اس بات پر اصرار کرنے لگے تھے کہ فارسی الفاظ و تراکیب وہی استعمال ہوں جن کی سند ایرانی

اہل زبان سے حل ہو سکے۔ انگریزی وغیرہ کے نئے الفاظ لائے تو جائیں (انہوں نے لکھا ہے کہ ایسے الفاظ کا استعمال مجھ کو پسند ہے، اور مزہ دیتا ہے) لیکن دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ محاورۂ شاہ جہان آباد کا تتبع کیا جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک نوبت بہ ایں جا رسید کہ جدید عہد کے سب سے بڑے شاعر اقبال کی زبان پر اعتراضات ہونے لگے۔ فلاں ترکیب غلط ہے۔ فلاں استعمال خلاف محاورہ ہے۔ فلاں فقرہ غیر فصیح ہے، وغیرہ۔ پھر کیا تعجب کہ "گلافتاب" (۱۹۶۶) میں ظفر اقبال کو لکھنا پڑا کہ "اصولاً یہ پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ یہ تازہ خون اردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دور کرنے کے لئے ضروری تھا...... اب میں سانس لے سکتا ہوں۔" اپنے پہلے مجموعے "آب رواں" (۱۹۶۲) کو ظفر اقبال نے "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" اپنے لئے الگ بنانے سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن وہاں بات کا پہلو لسانی تشکیلات کی طرف اتنا زیادہ نہیں، جتنا دنیا کو دریافت کرنے اور بیان کرنے کی صعوبتوں کی طرف تھا۔ "گلافتاب" میں شاعر نے خود کو دریافت کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس مہم میں اس نے سب سے زیادہ کام زبان سے لیا۔ رنگ آلودہ زبان اور محتاط اسالیب کی حامل فضا سے نفرت اس کتاب میں قدم قدم پر نمایاں ہے

"گلافتاب" کے اول ایڈیشن میں سرنامے کے طور پر کوئی شعر نہ تھا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۹۵) میں مندرجہ ذیل شعر کو سرنامہ بنایا گیا ہے ۔

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم　　　　بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

یہ شعر "رطب و یابس" (اولین اشاعت الہ آباد ۱۹۷۰) سے لیا گیا ہے، یعنی "گلافتاب" کی تصنیف کے وقت اس کا وجود نہ تھا۔ یہ شعر ہے تو بالکل حسب حال، اور میرا خیال ہے وقت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ظفر اقبال نے زبان کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو مومن کے مطلع میں باد صبا نے زلف یار کے ساتھ کیا تھا (بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی۔) لیکن اس شعر کو، جو کتاب کی تصنیف کے وقت موجود نہ تھا، اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا سرنامہ بنانے میں تھوڑی بہت معذرت، تھوڑے بہت دفاعی انداز کی جھلک تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے تمام مجاہدانہ، سرفروشانہ عزائم اور کارناموں کے باوجود ظفر اقبال محسوس کرتے ہیں کہ "گلافتاب" جیسی غیر معمولی کتاب کو اشاعت کے تقریباً تیس سال بعد بھی اسے کسی توجیہ، کسی جواز کی ضرورت ہے؟

اگر ایسا ہے تو اس میں ظفر اقبال کی تھوڑی بہت شکست اور جدید غزل کے نام لیواؤں کی بہت بڑی شکست ہے۔ ظفر اقبال کی تھوڑی بہت شکست میں نے اس لئے کہا کہ کام تو انہوں نے اپنا کر ہی دیا۔ انہوں نے غزل کے تقریباً تمام امکانات کو چھو لیا یا ان کی طرف اشارہ کر دیا کہ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں۔ اب اگر ان کا اثر خاطر خواہ قبول نہ کیا گیا تو اس میں ان کا قصور اور ان کی شکست نہیں، بلکہ ہمارے محتاط، ٹھلجے، کم

کوش، مغربی شاعری کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے والے نقادوں، غزل گویوں اور پڑھنے والوں کا المیہ ہے
بلراج کومل نے بہت پہلے لکھا تھا کہ محفوظ، نام نہاد شائستہ زبان کا ذائقہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا، اور افتخار
جالب نے ان سے بھی پہلے اپنے رہنے کی خاطر تھوڑی سی جگہ کے لئے دہائی دی تھی۔ سلیم احمد نے ان
دونوں سے بھی پہلے سودا اور انشاء کو دوبارہ دریافت کر کے جدید غزل میں ان کا نام بلند کیا تھا۔ بلراج کومل کے
سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خود نہایت محتاط اور "مہذب" زبان میں نظم کہتے تھے اور کہتے ہیں، اور
اس کے باوجود وہ "غیر محتاط اور غیر محفوظ" زبان میں لکھنے والوں کے حق کے لئے نبرد آزما تھے۔

سلیم احمد نے تجربے اور دلسوزی کی منزلیں اپنے طور پہ طے کیں، پھر وہ ذاتی محزونی اور تیسری
دنیا کے المیے اور تاریخ پر مبنی شاعری کی طرف چل پڑے۔ عادل منصوری اور محمد علوی اصولاً اور اصلاً توڑ
پھوڑ اور تعمیر نو پر عمل پیرا رہے اور ہندوستان میں انھیں قبولیت بھی ملی۔ زیب غوری، بانی، شکیب جلالی، بعد
میں انور شعور، جمال احسانی اور ان کے بھی بعد میں افضال احمد سید نے تجربے کو مثبت قدر کے طور پر قبول کیا
لیکن ان میں سے کسی کو (بانی کے ممکن استثنا کے سوا) غزل کے مثالی نظریہ ساز اور عمل طراز کی حیثیت نہ مل
سکی۔ یہ رتبہ ایک حد تک ظفر اقبال کو ملا، لیکن ان کی نظریہ سازی اور عمل طرازی کو شیطانی حیثیت حاصل
ہوئی، ایمانی نہیں۔

مثال کے طور پر، میرے پاس ایسی غزلیں بغرض اشاعت بہت آتی ہیں جن کے مصنف کہتے
ہیں کہ یہ "ظفر اقبال کے رنگ میں" ہیں۔ دوسرے رسالوں میں بھی ایسی غزلیں نظر آتی ہیں جن کے بارے
میں مصنف کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ظفر اقبال کو اپنا نمونہ قرار دیا ہے۔ لیکن ایسی بیش از بیش غزلیں
ظفر اقبال کے اس انداز کی ہوتی ہیں جن میں زبان اور مضمون دونوں کا انداز "لفنگے پن" پر مبنی ہوتا ہے اور
اس میں تھوڑی سی بھونڈی جنس کی "چاشنی" ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان، مضمون، لہجہ، ان میں
ظفر اقبال جب بے تکلفی، یا ملنگ پن، یا بے لفنگے پن، یا بلند کوشی اور مہم جوئی کا اظہار کرتے ہیں تو اس کے
پیچھے بڑا گہرا ریاض، اور اردو غزل کی روایت کا بڑا گہرا عرفان ہوتا ہے۔ آہنگ کی بے ساختہ یو قلمونی، عروض پر
کامل دسترس، دوسری زبانوں، خاص کر پنجابی کے شعری آہنگ کو پورا پورا رچاؤ، زبان اردو کے تخلیقی امکانات
کو بروئے کار لانے کی بھر پور صلاحیت، یہ سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر ملنگ پن نہیں بلکہ بھونڈا
پن، بہادری اور بانک پن کی جگہ تصنع اور بے لطف سہل پسندی، آہنگ کی رنگارنگی کی جگہ سپاٹ پن، اور زبان
پر حاکمانہ تسلط کے بجائے تقلید اور امکانات سے لاعلمی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ پھر ظفر اقبال کا مزاج ہے، جو
مزاج المومنین کی طرح محتاط اور شرمایا ہوا سا نہیں، بلکہ بے جھجھک، بے جھپک ہے۔ اس میں شدید طنز سے
لے کر "اپنا مقصد آپ ہی" کا معصومانہ رنگ رکھنے والے ظرافت تک کے انداز موجود ہیں اور مایوسی یا شکست
یا فریب شکستگی کے عالم میں بھی خود پر ہنس لینے اور اپنا مذاق اڑانے کی ادا بھی پائی جاتی ہے۔ افتخار جالب نے
ظفر اقبال کی ظرافت طبع کا ذکر تحسینی انداز میں کیا تھا۔ میں اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ظرافت

نا منفعل اور ایک طرح کے "مردانہ" مزاج کی پیداوار ہے۔ اس کوچے میں قدم رکھنے والے کو انفعالیت سے سروکار نہیں ہوتا، اور اس کی سب سے اچھی مثالیں میر اور ناسخ کے یہاں نظر آتی ہیں۔ (ناسخ کے نام پر چونکیے نہیں، انھیں پڑھ کر دیکھیے۔ اور یہ نہ بھولیے کہ ناسخ بھی معتقد میر تھے۔)

دوسری اور شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ظفر اقبال کے مقلدوں اور معاندوں نے ان کی صرف اینٹی غزل (اگر ہم اس اصطلاح کو آج بھی قائم رکھیں) کو نظر میں رکھا اور ظفر اقبال نے جو اور دسیوں طرح کی شاعری کی ہے، اسے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ طرح طرح کی زبان اور طرح طرح کے تجرباتی رنگوں پر مشتمل غزل لکھنے والا ظفر اقبال ہر جگہ ایک ہی ہے (جس طرح میر کے "خراب / پست" شعر بھی میر ہی کے رنگ کے ہیں، ہما شما کی سطح کے نہیں) لیکن کوئی بھی شاعر ہو، وہ اقبال ہی کیوں نہ ہوں، میر انیس ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی جلوہ گری مکمل قبولیت اور مکمل مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ "مسجد قرطبہ" کو قبول کرنا اور "رام" کو رد کرنا یا "ذوق و شوق" کو قبول کرنا اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کو ترک کرنا، اقبال اور اردو شاعری دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیات بھی ہے اور عالمی و قومی حالات حاضرہ بھی۔ اقبال نہ اس کے بغیر مکمل ہیں اور نہ اس کے بغیر مکمل ہیں۔ اسی طرح ظفر اقبال کے یہاں فلسفیانہ محزونی بھی ہے۔ فارسی کی نفاست اور لطافت بھی ہے۔ ٹھیٹھ اردو کی بے تکلفی اور پنجابی کا جارحانہ انداز بھی ہے، ذاتی المیہ اور کائناتی احساس بھی ہے، اور "ٹکسالی، معیاری اردو" بھی ہے۔ بلکہ فارسی اور "معیاری" اردو کو ظفر اقبال نے جس طرح کامیابی سے برتا ہے اس کی مثال آج ۱۹۹۷ کے زمانے میں ہمشکل ہی ملے گی۔ اس کو بیان کرنے کے لئے صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ ظفر اقبال کو کلاسیکی محاورے پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ یہ بات تو بہت سے اچھے شاعروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ پھر ظفر اقبال کی تخصیص کیا ہے؟

دیکھنے کی بات دراصل یہ ہے کہ کلاسیکی یا معیاری زبان سے شاعر نے کام کیا لیا ہے؟ یعنی اس کے ذریعہ کیا اور کس طرح کے مضمون بیان کئے گئے ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ غزل میں نئے مضامین کا قحط ہے، اور نئے مضامین ہی کی تلاش نے خیال بندی کو رواج دیا جس کے باعث ہمیں شاہ نصیر، ناسخ، ذوق اور غالب جیسے شاعر ملے جو "مضامین نو" کی تلاش میں آشیان و گلشن سے بہت دور نکل جانے، حتیٰ کہ واپس نہ آنے کا بھی جوکھم مول لینے کو تیار رہتے تھے۔ نئے زمانے میں بہت سے پرانے مضامین ترک ہوئے، بہت سے قائم رہے۔ بہت سے ترک ہونے کے بعد دوبارہ اختیار کئے گئے، اور بہت سے بالکل نئے تو نہیں، لیکن نسبتہً تازہ مضامین دریافت یا ایجاد ہوئے۔ کلاسیکی محاورے سے رشتہ استوار رکھنے کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ شاعر نے پچھلوں کے خیالات یا استعاروں یا تاثرات کو کس طرح برتا ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں "رطب و یابس" کی وہ غزل تمام و کمال دیکھیں جس کا ایک شعر ظفر اقبال نے "گلا آفتاب" کے دوسرے ایڈیشن کا سر نامہ قرار دیا ہے ؂

یقیں کی خاک اڑاتے گماں بناتے ہیں — مگر یہ طرفہ عمارت کہاں بناتے ہیں
لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی — اساسِ فکر نہ طرزِ بیاں بناتے ہیں
قریب و دور سے بے جوڑ عکس اشیا کے — تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں
کہ مل سکے نہ ہمارا سراغ ہم کو بھی — بنائے ابر و ہوا پر مکاں بناتے ہیں
پرانے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لئے — ہم اپنے سر پہ نیا آسماں بناتے ہیں
نہیں نصیب میں مرنا سوادِ ساحل پر — جو ڈوبنے کے لئے کشتیاں بناتے ہیں
فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گرد رنگِ رفتۂ دل — زمیں پہ شامِ طلب کا نشاں بناتے ہیں
وہ جس کی لے پہ لرزتا ہے برگ برگ بدن — اس ایک رنگ سے نقشِ خزاں بناتے ہیں
ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم — بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

نو شعروں کی اس غزل کا مفصل تجزیہ مختصر مضمون کے حدود میں نہیں سما سکتا۔ لیکن بعض بنیادی باتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) اس غزل میں ایک محزونی، نظم کائنات کے سامنے ایک طرح کی بے چارگی اور ساتھ ہی ایک طرح کا طنطنہ اور نخوت بھی ہے۔ یعنی اس بیچارگی میں رحم طلبی نہیں ہے۔ یہ انداز میر و غالب دونوں کے یہاں ہے۔ غالب کے کلام میں بالکل نمایاں، اور میر کے یہاں ان کی معمولہ چابک دستی اور قاری فریبی کی اداؤں کے باعث ذرا زیر زمین ہے۔ کلاسیکی شعرا میں سے اکثر کے یہاں یہ صفت کم و بیش مل جائے گی۔ غالب اور میر کی مثالیں سامنے کی ہیں، ورنہ یہ فن ان سے مخصوص نہیں ہے۔

(۲) اس غزل کا لہجہ کسی معاصر شاعر سے نہیں ملتا۔ ذرا دور جا کر غالب اور ناسخ کو اس لہجے کا اصل نمونہ (Paradigm) کہہ سکتے ہیں۔

(۳) اس غزل میں وہ صفت بہت کم ہے جسے "کیفیت" کہتے ہیں۔ یعنی ان اشعار کا حسن براہ راست جذبہ انگیزی اور دل پر اثر کرنے میں نہیں، بلکہ ایسے مضامین میں ہے جن کی خوبی ذرا غور کرنے پر سمجھ میں آتی ہے۔ ناصر کاظمی، منیر نیازی، محمد علوی، شہریار، شکیب جلالی، آخری دور کے سلیم احمد، یہ کیفیت کے شعرا ہیں۔ ظفر اقبال بانی، زیب غوری، ممل کرشن اشک، عادل منصوری، مضمون کے شعراء ہیں۔ ان کے ڈانڈے نسیم دہلوی، غالب، ذوق وغیرہ سے ملتے ہیں۔ غالب کے یہاں کیفیت بہت کم ہے، مضمون پر زور زیادہ ہے۔ کیفیت والے شعر عموماً عاشقانہ ہوتے ہیں ۔

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں — کچھ ہو نہیں گئی غزل عاشقانہ فرض
(نسیم دہلوی)

(۴) اس غزل میں بعض باتیں نمایاں ہیں۔ مثلاً شگفتہ فارسیت، ردیف کا ابہام، اس بات کا احساس (یا دعویٰ) کہ غزل کی شعریات میں کچھ بدل رہا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ متکلم کبھی خود پر ہنستا ہے، کبھی

رنجیدہ ہوتا ہے۔ یعنی غزل کے متکلم کا تعین دشوار ہے۔ ملاحظہ ہو:

شگفتہ فارسیت۔ : (۱) بنائے ابر و ہوا (بنائے ابر و ہوا پر مکان بنانے میں مزید لطف ہے۔ "بنا" کے ایک معنی "عمارت" بھی ہوتے ہیں، یہ مزید علیہ ہے۔ (۲) سواد ساحل (دریا/سمندر کی موج کے لئے بھی "سواد" لاتے ہیں۔ بیدل کا مصرع ہے ۔ چشم ماہی از سواد موج دریا روشن است۔ یہ مزید لطف ہے، یعنی دوسرے مصرعے میں ڈوبنے کا ذکر ہے کہ سواد ساحل پر مرنا نصیب میں نہیں۔ لیکن "سواد ساحل" میں ڈوبنے کا اشارہ پھر بھی ہے۔) (۳) گرد رنگ رفتہ دل (یعنی رنگ دل تو ضائع ہو ہی گیا۔ اب اس کی خاک ڈھونڈ رہے ہیں کہ شائد اڑ کر آسمان کو گئی ہو۔ یہ ترکیب تعریف سے مستغنی ہے*۔) (۴) برگ برگ بدن (یہاں "برگ برگ" اور "بدن" کو مضاف مضاف الیہ، یعنی "برگ برگ" اور "بدن" کے درمیان کسرۂ اضافت فرض کر سکتے ہیں۔ یا پھر "برگ برگ بدن" کو ایک ترکیب بے اضافت کر سکتے ہیں۔) (۵) نقش خزاں (رنگ کی لے ۔ اور پھر اس سے نقش خزاں بنانا حس (sense) کی مختلف قوتوں کا ادغام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔)

ردیف کا ابہام۔ یعنی ہم بناتے ہیں (= میں بناتا ہوں) ہم لوگ بناتے ہیں۔ وہ لوگ بناتے ہیں۔ بعض شعروں میں تینوں امکانات ہیں

غزل کی شعریات۔ مندرجہ ذیل اشعار میں متکلم/شاعر بعض باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق غزل کی شعریات سے ہے ۔

(۱) لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی — اساس فکر نہ طرز بیان بناتے ہیں

(۲) قریب و دور سے۔ بے جوڑ عکس اشیاء کے — تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں

(۳) ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم — بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

شعر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اور لفظیات میں تبدیلیوں کے باعث پڑھنے/سننے والوں کو غزل میں نئے ذائقے کا احساس ہو رہا ہے، اور یہ ذائقہ اس قدر اجنبی ہے کہ سننے/پڑھنے والے پر زخم کا سا اثر کر سکتا ہے (غزل کی زبان میں نئے ذائقے کی اساس کا تذکرہ خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی ایسا الفاظ درج کئے ہیں جن کا استعمال ظفر اقبال نے خاص کامیابی کے ساتھ کیا ہے)

شعر ۲ میں مضمون یہ ہے کہ ہم مختلف اور دور دراز کی چیزوں کو جمع کر کے (اپنی دنیا کی/لوگوں کی) داستان بناتے ہیں۔ اس مضمون پر کولرج کی بھی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

شعر ۳ میں یہ دعویٰ ہے کہ غزل کی زبان کے ساتھ جو زیادتیاں یا آزادیاں ہم برت رہے ہیں وہ دراصل زبان کی تعمیر اور ترقی کا کام ہے۔

---

* غنی کاشمیری نے چہرے کے رنگ کو اپنے گھر کی بنیاد قرار دیا ہے۔ (رنگ ریختن = بنیاد ڈالنا)۔

شکست از ہر در و دیوار سی بارد مگر گردوں — ز رنگ چہرہ ما ریخت رنگ خانہ ما را

متکلم کی شخصیت کا عدم تعین۔ ظفر اقبال کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ متکلم کا لہجہ کیا ہے۔ یہ بھی کہ ان کا متکلم مختلف شعروں مختلف معلوم ہوتا ہے۔ یہ صفت کلاسیکی غزل میں ہے۔ جدید اور قبل از جدید غزل متکلم کی یک رنگی اور وحدت پر زیادہ زور دیتی معلوم ہوتی ہے عندلیپ شادانی نے اس بات پر بڑا زور قلم صرف کیا ہے کہ غزل کے شاعر کو اپنے ذاتی محسوسات و تجربات ہی نظم کرنا چاہیئے۔ وہ قبل جدید غزل گویوں مثلا حسرت، جگر، فانی وغیرہ سے اس لئے خفا ہیں کہ ان کے کلام میں (بقول شادانی) ذاتی تجربات نہیں بیان ہوتے ہیں۔ ظفر اقبال نے کلاسیکی غزل کو قائم رکھتے ہوئے متکلم کی ہمہ رنگی کو دوبارہ رائج کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

یقیں کی خاک اڑاتے گماں بناتے ہیں مگر یہ ظرفہ عمارت کہاں بناتے ہیں

یہ طے کرنا مشکل ہے کہ فاعل (Subject) اپنی تحسین کر رہا ہے یا اپنا مذاق اڑا رہا ہے۔ یا ایک وقت دونوں ہی کام کر رہا ہے۔

کہ مل سکے نہ ہمارا سراغ ہم کو بھی بنائے ابروہوا پر مکاں بناتے ہیں

مطلع کی گونج یہاں بھی سنائی دیتی ہے۔ صاف کھلتا نہیں کہ اس کام میں چالاکی ہے یا سادہ لوحی۔ میر نے بالکل اخیر عمر میں کہا تھا۔

میر گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی (دیوان ششم)

مندرجہ ذیل شعر میں مظلومیت سے محبت پر طنز بھی ہے اور اسے بطور لائحہ حیات بھی بیان کیا گیا ہے۔

پرانے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لئے ہم اپنے سر پہ نیا آسماں بناتے ہیں

میر نے بڑا برجستہ شعر کہا تھا کہ غیر کو تو صرف قتل کیا اور مجھ پر ستم بھی کیا، پھر قتل کیا۔ اس صورت حال میں بچوں کا سا تفاخر بھی ہے اور تو قیر لذت آزار بھی، جسے غالب نے عام کیا تھا۔ میر، دیوان پنجم۔

غیر کے میرے مر جانے میں تفاوت ارض و سما کا ہے مارا ان نے دونوں کو لیکن مجھ کو کر کے ستم مارا

اس پر طرہ یہ کہ میر کا تفاخر یک گونہ شکایت بھی ہے، کہ مجھ پر بڑے بڑے ظلم کئے۔ رلا رلا کر مارا۔ غالب کی لذت آزار میں یک رنگی ہے۔

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

غالب کا ایک شعر "گر دو رنگ رنجہ دل" والے شعر کے سامنے رکھیں تو یہی صورت نظر آتی ہے کہ دونوں کے شعروں میں محزونی اور خود پر طنز ہے۔ غالب کے یہاں طنز نمایاں ہے اور ظفر اقبال کے یہاں سعی لاحاصل پر محزونی۔ ہاں غالب کا شعر روانی اور ظرافت کی ہلکی سی لہر کے باعث ظفر اقبال کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

مندرجہ بالا مختصر تجزیے پر اس غزل کا جائزہ ختم نہیں ہوتا۔ میں نے وقت اور صفحات کا لحاظ رکھتے ہوئے بات یہاں تمام کر دی ہے۔ ورنہ ابھی ان شعروں کا ذکر تو باقی بھی ہے جو تجزیے میں نہیں آئے، اور خود ان شعروں پر بھی، جو تجزیے میں شامل ہیں، بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اتنی بات تو اب بھی صاف ہے کہ اس غزل میں مضمون و معنی کی جتنی دبازت اور گھنا پن ہے، اور فن کے مختلف پہلوؤں پر جتنی دسترس اس غزل سے نمایاں ہے۔ اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں آج نہ ملے گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ نو شعر کی غزل میں کسی اور شاعر کے یہاں تین چار پانچ شعر ایسے ہوں جن میں پیکر اور استعارہ کی تو انگری ایسی ہو، فکر اور مضمون کی بلندی اور معنی کا گھنا پن ایسا ہو جیسا ظفر اقبال کے یہاں نو کے نو شعروں میں ہے۔ لیکن پوری غزل اتنی بلند رتبہ کہیں نہ ملے گی۔ اس پر طرہ یہ کہ غزل کی فضا جدید ہے، لیکن ربط بین المصرعتین، روانی، الفاظ کی مناسبت اور دروبست میں خالص کلاسیکی آداب کی پابندی بھی ہے۔

ظفر اقبال کی اور جدید اردو غزل کی بد قسمتی یہ ہے کہ ظفر اقبال کو محض "اینٹی غزل" کا شاعر قرار دیا جانے لگا۔ (اس مفروضے کو عام کرنے میں ظفر اقبال کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے، وہ الگ بات ہے۔) لوگوں نے تعریف یا تنقیص میں ظفر اقبال کے جس رنگ کی تقلید کی یا استہزا کیا، وہ یہی اینٹی غزل کا رنگ تھا۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال کی شاعری کا مجموعی انقلابی رنگ، اور خاص کر زبان کے بارے میں ان کی جرات مندی، خلاقی اور طباعی قبول کرنا اور ہضم کرنا ان لوگوں کا کام نہیں جن کی شعریات "آب حیات"، "مقدمہ شعر و شاعری"، "کاشف الحقائق"، "شعر العجم"، "ہماری شاعری"، "معائب سخن" اور طباطبائی کی شرح غالب پر مبنی ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو انگریزی شاعری کو فی نفسہ اردو شاعری پر فوقیت دیتے ہیں اور وہ اردو میں وہی دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے خیال میں انگریزی میں ہے۔ پنجاب، جہاں اردو شاعری میں جدیدیت اور جدت کا آغاز اب سے سوا سو برس پہلے ہوا، وہاں بھی "گلا فتاب" کو غیر مشروط طور پر قبول نہ کیا گیا۔ رسالوں کی ایڈیٹروں میں ظفر اقبال کی قبولیت کی تاریخ اس سلسلے میں سبق آموز ہے۔

"آب رواں" کی اشاعت کے بعد زیادہ تر لوگوں نے محسوس کیا کہ جدید غزل میں تازہ فکری، زبان پر قدرت اور عروض و آہنگ میں بے تکلفی کی ایک نئی مثال قائم ہو رہی ہے۔ "گلا فتاب" کے بارے میں ایک بار میں نے لکھا تھا کہ دیوان غالب کی اول اشاعت (۱۸۴۱) کے بعد اردو غزل کی تاریخ میں دوسرا انقلابی قدم "گلا فتاب" کی اشاعت (۱۹۶۶) تھی۔ بیچ میں کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اپنی تمام تر تازگی اور جدید کاری کے باوجود (بلکہ اس کی وجہ سے) ظفر اقبال کا کلام پنجاب کے باہر رسالوں میں بالکل نہ چھپا۔ کراچی کے حلقوں میں ظفر اقبال کو عام طور پر شک، اور خوف اور عدم اعتمادی کے ساتھ دیکھا گیا۔ خود پنجاب کے ایسے رسالے، جن کے مدیران میں حس مزاح (یا شے لطیف) کم تھی، ظفر اقبال کا کلام شائع کرنے سے گریز کرتے رہے اور گریز کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا کلام صرف "شب خون" میں چھپتا تھا اور ہے، اور اکثر اس کے خلاف خطوط اور اعتراضات (غیر سنجیدہ ہے، زبان غلط ہے، غزل کی نزاکت کو

غت ریو دکر دیا گیا ہے) چھپتے رہتے ہیں۔ کراچی کے رسالوں نے انھیں بہت دیر میں در خود اعتنا قرار دیا، اور وہ بھی بے تحفظات اور تکلفات کے ساتھ۔

''عیب و ہنر'' میں ایک غزل ہے ''حلقوم کی حد تک، معلوم کی حد تک''۔ ردیف و قافیہ کی ہی تازگی اس غزل کو کہیں بھی نمایاں مقام دلانے کے لئے کافی ہے۔ کراچی کے ایک موقر رسالے میں یہ غزل شائع ہوئی تو مدیر نے اس کے چند شعر حذف کر دیئے (اور بعد میں اپنے اداریے میں کچھ اتذار کے ساتھ انھیں چھاپا۔) ان میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

سوائے شکوۂ مقسوم خود بھی کچھ کیا ہوتا خدارا اس طرح مت کیجئے مقسوم کی ہتک

ظاہر ہے کہ دال اور تاے فوقانی کے اجتماع کے باعث ''ردیف ''حد تک'' کو ''ہت تک'' پڑھ یا سن سکتے ہیں۔ لیکن اس امکان پر نظر جانا بڑی خلاقی کی دلیل ہے، اور اس امکان کو بالقوت سے بالفعل بنانا بڑی جرات کی دلیل ہے، اور اس بات کی بھی، کہ شاعر اپنے بزرگ پیش روؤں کے طور طریقوں سے واقف ہے۔ ظفر اقبال نے مزید یہ کیا کہ عربی لفظ ''ہتک'' (بروزن ''کیک''، جو اردو میں بروزن ''فلک'' ہے) کا پنجابی تلفظ (بروزن ''کب تک'') استعمال کیا اور اس طرح ''ہت تک'' کی بے معنویت کو معنی بخش دیئے۔ ایسے شاعر کو خلاق معانی نہ کہیں تو کیا کہیں۔ لیکن کراچی کے مدیر گرامی کو یہ شعر چھاپنے کی ہمت نہ ہوئی، یا انھیں یہ ''زیادتی'' اچھی نہ لگی۔ کراچی کے ایک خاصے ضخیم رسالے کی تازہ اشاعت میں ظفر اقبال کی ایک غزل کے ساتھ ان کے خلاف تیس صفحے کا مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

ادبی تہذیبوں کا عام اصول ہے کہ زبان جیسے جیسے زبان ترقی کرتی ہے، شعرا کی آزادیاں بڑھتی جاتی ہیں اور وہ زبان کے ساتھ طرح طرح کے تجربے کرتے اور نت نئے طرز برتنے لگتے ہیں۔ فرانسیسی جیسی قدامت پرست زبان بھی لسان (یعنی langue) کے خلاقانہ استعمال کے سامنے گھٹنے ٹیکتی رہتی ہے اور ہر سال در جنوں الفاظ کے بارے میں Academic francaise کا اعلان باد لِ ناخواستہ شائع ہوتا ہے کہ اچھا صاحب ان ان ''اجنبی'' یا ''غیر مہذب'' الفاظ کو فرانسیسی زبان میں داخل ہونے کا پروانہ دیا جاتا ہے۔ رولاں بارت ڈرتے ڈرتے کہتا ہے، مگر کہتا ہے کہ شاعر زبان کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح بچہ ماں کے بدن سے کھیلتا ہے، اور ضرورت پڑنے پر وہ زبان پر تشدد اور توڑ پھوڑ بھی روا رکھتا ہے۔ لیکن اردو کا معاملہ ہمیشہ سے (نہیں، ہمیشہ سے تو نہیں، لیکن ایک عرصہ دراز سے) الٹی گنگا بہانے کا رہا ہے۔ یہاں الفاظ کو داخل کرنے کے بجائے خارج کرنے اور الفاظ و قوافی کی تازہ شکلوں کو قبول کرنے کے بجائے رد کرنے اور مردود قرار دینے کو موجب فخر و مباہات قرار دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کا دعواے استادی اسی بات پر قائم تھا کہ ہم نے اتنے الفاظ متروک قرار دیئے ہیں، اتنے فقروں اور تراکیب پر غلط ہونے کا حکم لگایا ہے، اور قافیے کی فلاں فلاں مزید پابندیاں اپنے اوپر عائد کی ہیں، اور فلاں فلاں ''حروف عربی و فارسی'' کے دبنے کو معیوب گردانا ہے۔

مصحفی کے زمانے تک یہ صورت حال نہ تھی۔ ان سے ایک بار کسی نے کہا کہ آپ نے فلاں جگہ لفظ "مفتی" کی یاے تحتانی دبادی ہے، درحالے کہ وہ لفظ عربی کا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ خود میرے تخلص (جو اصلاً عربی ہے) کی تحتانی سیکڑوں جگہ ساقط ہوئی ہے۔ کس کو دماغ ہے کہ اسے درست کرے۔ اس زمانے تک "بہار دامن / مارے دامن" (درد)، "زیبائی شمع / منگوایئے شمع" (قائم)، "واورے ہیں / باہرے میں" (انشا) جیسے قوانی، اور ردیفوں میں تصرف (جیساکہ انشا کی مندرجہ بالا مثال یا "آئی نہ / آئینہ وغیرہ) معیوب نہ تھے۔ آبرو کے زمانے سے (۱۶۸۵تا۱۷۳۳) تک قوس / رمس، ت / ط وغیرہ کا قافیہ عام تھا، اور ضرورت شعری کے تحت عربی فارسی الفاظ کے تلفظ میں تصرف بھی بے دریغ ہوتا تھا۔ یا پھر عربی فارسی الفاظ کو ان کے عام تلفظ کے اعتبار سے نظم کرتے تھے۔ دکنی شعرا کے یہاں تو تصرف، عام تلفظ کی پابندی، اور روانی کی خاطر لفظ کے تلفظ میں تبدیلی کرنے کی روش عام تھی۔ دکنیوں کے یہاں زبان خلاقانہ تصرف اور آزادی کی اس قدر خوش گوار فضا ملتی ہے، اور تخلیقی جوش کی وہ کثرت نظر آتی ہے کہ مجھے اپنے معاصروں پر ترس آتا ہے کہ کس قدر غیر فطری پابندیوں میں جی رہے ہیں۔ ظفر اقبال اگر ان پابندیوں کو کہیں کہیں اور کبھی کبھی توڑ رہے ہیں تو ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہیے، نہ کہ شاکی۔ مناسب بات تو یہ تھی کہ ان سے درخواست کی جاتی کہ ہل من مزید؟ لیکن ہم اردو کے ادیب ہی ایسی قوم ہیں جو زنجیروں کو زیور کی طرح قبول کرتے ہیں۔ ورنہ عام بولنے والا تو بے تکلف اپنے رجحان اور زبان کے مزاج کی پابندی کرتا ہے، اور کیوں نہ ہو؟ اس نے ہماری کتابیں پڑھی نہیں ہیں؟

شیکسپیئر کی طرح میر کو یہ بات معلوم تھی کہ زبان کے استعمال میں وہ سب باتیں قابل قبول اور قابل عمل ہیں جنھیں "اشراف" ناپسند کریں گے اور انھیں "لفنگا پن" "قباحت" سے گراں بار اور "شرافت" سے دور قرار دیں گے۔ عام پڑھے لکھے آدمی کی لفظیات بارہ پندرہ سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اوسط درجے کا اچھا مصنف ڈھائی ہزار الفاظ میں گزارا کر لیتا ہے۔ پھر شیکسپیئر نے چھبیس ہزار (۲۶۰۰۰) الفاظ کہاں سے برت لئے، جبکہ بقول بن جانسن (Ben Jonson) اس کا مبلغ علم Small Latin and less Greek (تھوڑی سی لاطینی اور اس سے بھی قلیل یونانی) سے زیادہ نہ تھا؟ ظاہر ہے کہ اگر وہ ہماری طرح قدغنوں میں رہتا تو اتنے الفاظ کا نصف بھی اس کو نصیب نہ ہوتا، اور اگر میر ہر لفظ اور فقرے کی منظوری کا پروانہ عربی فارسی کے عالم سے مانگتے جاتے تو ان کا بھی ذخیرۂ الفاظ آج کے شعرا کی طرح ہزار دو ہزار الفاظ سے آگے نہ جاتا۔ اور ایسا نہیں ہے کہ میر پڑھے لکھے نہ تھے۔ قاضی عبدالودود جیسے شخص نے میر کی علمیت کا لوہا مانا ہے اور ان کے مقابلے میں سودا کو جاہل ٹھہرایا ہے۔ مصحفی اور جرات کا بھی کلام آج اسی لئے زندہ اور متحرک معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نت نئے الفاظ اور استعمالات نظر آتے ہیں۔ افسوس کہ تازگی کا سرچشمہ مصحفی کے بعد سوکھنے لگا، اور ناسخ اور شاہ نصیر کی آنکھ بند ہوتے ہوتے وہ عین بالکل ہی خشک ہو گیا۔ غالب اگر فارسی تراکیب کے اس قدر غیر معمولی ماہر نہ ہوتے تو ان کی لفظیات بے حد مایوس کن ہوتی۔ لیکن

آج کے شاعر کو فارسی اس طرح نہیں آتی اور اردو کے باہر مقامی زبانوں سے اس کا ربط ضبط وہ نہیں جیسا کہ مصحفی اور ان کے معاصروں تک باقی تھا۔ اس وقت کے لوگ اردو کے علاوہ اودھی یا برج یا پوربی سے (اور اکثر ان تینوں سے) واقف ہوتے تھے۔ میر اور مصحفی کے یہاں ان کے علاوہ پنجابی کا بھی ہلکا سا لطف ہے۔ پھر فارسی عربی تو ان لوگوں کی علمی زبان تھی ہی۔ انشاء تو اور بھی کئی زبانوں سے بھی کام لیتے تھے۔ ظفر اقبال نے پنجابی سے وہ ہی کام لینا چاہا ہے جو میر و مصحفی جرات نے اودھی اور پوربی سے لیا تھا ظفر اقبال کے یہاں الفاظ کی فراوانی فارسی اور پنجابی کی مرہون منت ہے۔ اور ان کے یہاں مضمون کی فراوانی خود ان کی تخلیقی قوت کے علاوہ میر، غالب، مصحفی، انشاء اور نظیر اکبر آبادی کی مرہون منت ہے۔

انتظار حسین نے "عیب و ہنر" کے دیباچے میں ظفر اقبال کے کلام کو ٹپکے ہوئے یا درخت پر پکے ہوئے آموں کی ناند سے تشبیہ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اچانک میرے تصور نے پیچھے کی طرف ایک زقند لگائی اور میں اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ گیا۔ بس جیسے رم جھم بارش ہو رہی ہے، ناند میں بھرے پانی میں تربتر آم رکھے ہیں میں آم چوس رہا ہوں: ایک کھٹا، دوسرا کھٹا، تیسرا کچھ گلا ہوا، چوتھا کچی کیری اور پھر جو آم میرے ہاتھ میں آتا ہے تو تالو اور زبان کے بیچ رس گھل جاتا ہے۔ اور اب مجھے ظفر اقبال کی شاعری میں لطف آنے لگا تھا۔ اب مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس شاعر کو کیسے پڑھنا چاہیے۔ اب میں دوسروں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی اسے ایسے مت پڑھیے جیسے اور شاعروں کو پڑھتے ہو۔ ظفر اقبال کی غزلیں ایسے پڑھو جیسے آم کھا رہے ہو ٹیبل پر بیٹھ کر چھری کے ساتھ قلمی آم نہیں بلکہ جیسے کھٹے میٹھے دیسی آموں سے بھری ناند آپ کے سامنے رکھی ہے اور آپ آستینیں چڑھا کر اطمینان سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں"۔ اب اس لاجواب نثر کا جواب میں کیا لکھ سکتا ہوں، لیکن انتظار حسین کی بات سے بات ضرور ملانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال کی غزل پڑھ کر ایک نامیاتی جوش، ایک تخلیقی آبشار کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی غزل کی سب سے بڑی (یا سب سے نمایاں) خوبی اس کا وفور، اس کی کثرت، اس کی ہماہمی اور بھرا پن (Plenitude) ہے جس کے باعث ظفر اقبال کا کلام تخلیقی فطرت کی بے لگام قوت کا احساس دلاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اس کے کلام میں اچھا برا، پست بلند، خراب و خوب بے دردی سے رلے ملے ہوئے ہیں اور خراب کی زیادتی ہے، لیکن سب کو ایک ساتھ قبول کرنا ہوگا۔ اور ہر بار دریافت کی استعجاب کا لطف اٹھانے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ آموں کے پیڑ کی طرح ظفر اقبال کلام کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں۔ ایک ہی ڈال پر چار آم کھٹے، دو چار کھٹ میٹھے اور ایک دو میٹھے نکلیں گے۔ ظفر اقبال کے کلام میں اچھے برے شعر تاش کے پتوں کی طرح پھینٹے ہوئے نہیں ہیں اور ان کے قاری کو کھلاڑی نہیں بننا چاہیے کہ جواری کی طرح ہر بار کی توقع اور امید کے ساتھ گڈی میں ہاتھ ڈالتا ہے کہ اب کی بار لگتا ہوا پتہ یا جوکر ہاتھ آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ظفر اقبال نے خراب شعر نہیں کہے ہیں۔ ضرور کہے ہیں۔ لیکن انہوں نے (عجز نظم کے باعث یا لاپروائی کے باعث) غلط شعر نہیں کہے ہیں۔ ہمیں یہ حق تو ہے کہ ہم ان کے بعض شعروں کو اپنی ذاتی پسند ناپسند کی

روشنی میں مسترد کر دیں۔ لیکن ہمیں یہ بات خیال میں رکھنی چاہیئے کہ ظفر اقبال کی اپنی شعریات ہے اور یہ بڑی حد تک کلاسیکی غزل کی شعریات ہے، اور اس کی رو سے ظفر اقبال کے ان ہی شعروں کا جواز بنتا ہے اور ان کی قدر متعین ہوتی ہے جنھیں انتظار حسین یا دوسرے قاری ناپسند کرتے ہیں۔ ظفر اقبال کے بہت سے شعر حد اعتدال سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حد وہ ہے جو حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی اور فانی بدایونی اور فراق گورکھپوری وغیرہ نے مقرر کی تھی، غالب، میر، سودا، انشاء، مصحفی، ناسخ اور جرات نے نہیں۔

انتظار حسین کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ان سے اچھا قاری کم ہی آج کے زمانے میں کسی کو میسر آئے گا۔ وہ جتنے اچھے افسانہ نگار اور نثر نویس ہیں، اتنے ہی اچھے نقاد بھی ہیں۔ اور کلاسیکی معاشرے، اس کی تہذیب، مفروضات اور تصور کائنات سے ان کی واقفیت گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ظفر اقبال کے کلام میں لطف آتا ہے۔ انھیں اور ہم سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ہمیں ظفر اقبال کے کلام میں hit or miss کی کیفیت نظر آتی ہے تو یہی بات تو لوگ میر کے بارے میں بھی کہا کرتے تھے (اور شاید اب بھی کہتے ہیں۔) ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "میر کے یہاں کھیت کھیت پر ایک شعر نظر آتا ہے۔" میر کے بارے میں یہ بات اب غلط ثابت ہونے لگی ہے۔ ممکن ہے ظفر اقبال کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ مصحفی کو پڑھتے پڑھتے ہم تھک جاتے ہیں لیکن مصحفی شعر کہتے کہتے نہیں تھکتے (اور شعر بھی ایسے ویسے نہیں، ایسے شعر جو سب کے سب بہت نادر نہ بھی ہو تو نک سک سے درست ضرور ہوتے تھے۔) ظفر اقبال کی پر گوئی کے ڈانڈے میر اور مصحفی کی پر گوئی سے ملتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے بہت سے شعروں کو ناپسند یا مسترد کر سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ان لوگوں کا معاملہ عجز نظم یا تخیل کی ناکامی کا معاملہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری پشت پر ایک باقاعدہ، ترقی یافتہ شعریات ہے۔

یہاں دو بظاہر غیر متعلق لوگوں کا ذکر معاملے کو مزید واضح کرنے کی غرض سے کرتا ہوں۔ لوکاچ نے یورپی ناول کا مفصل فلسفیانہ اور ادبی مطالعہ اپنی مشہور کتاب Studies in European Realism میں کیا ہے۔ اسپینڈر سے ایک گفتگو کے دوران اس نے جوائس اور فرانس کے "نئے ناول" لکھنے والے ناول نگاروں کا ذکر کیا۔ جن کی حقیقت نگاری بظاہر روایتی حقیقت نگاری اور بیانیہ کی نفی کرتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی عظمت اور اہمیت کا قائل ہے، لیکن کہتا ہے کہ وہ مجھے متاثر نہیں کرتے۔ نہ وہ حقیقت پسند ناول کے لئے نمونے کا کام کر سکتے ہیں، اور نہ زندگی کے بارے میں اس کے علم میں کوئی اضافہ کرتے ہیں۔ پروست کو وہ پھر بھی بہت پسند کرتا ہے*۔ دوسری طرف، لوکاچ، سے کچھ پہلے فرائڈ نے اپنے زمانے میں تیزی سے مقبول ہوتے ہوئے مصوری کے تجریدی اور "غیر واقعیت پرست" اسالیب پر رائے زنی کی ہے۔ کم لوگوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ فرائڈ نے تخلیقی عمل، مزاح، مصوری وغیرہ کے تعلق سے بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ فرائڈ کو تجریدی مصوروں سے یہ شکایت تھی کہ وہ سیدھی لکیریں نہیں کھینچتے، ہر چیز بگاڑ کر ٹیڑھی میڑھی

*اگرچہ پروست بھی روایتی قسم کا حقیقت نگار نہیں

کر دیتے ہیں۔ لیکن اس نے یہ بھی لکھا کہ بے شک ایسا کرنا آسان نہیں، اور ٹیڑھی ترچھی لکیروں کو مصوری کا درجہ دے سکنا اسی وقت ممکن ہے جب مصور سیدھی لکیر اور معروف رنگ کو برتنے میں پوری طرح ماہر ہو چکا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ مجھے پسند نہیں آتے۔ لیکن ان کی مہارت کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہے۔

کچھ یہی معاملہ ظفر اقبال کے ساتھ بھی ہو تو انصاف کا تھوڑا بہت حق ادا ہو۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ زبان کے ساتھ جو تشدد ظفر اقبال نے کہیں کہیں روا رکھا ہے وہ اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ وہ ہمارے زمانے کے سب سے قادر الکلام شاعر ہیں، اور زبان کے روایتی اسالیب و قواعد کو وہ خوبی برت سکتے ہیں اور اپنے حسب دلخواہ برتتے ہیں بھی۔ زبان اور محاورے میں تصرف وہی کر سکتا ہے جو زبان اور محاورے سے پوری طرح واقف ہو، ورنہ بات ہی نہ بنے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال قدم قدم پر اپنی مہارت اور لیاقت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی طرح، جو لوگ ان کے یہاں غزل کی "روایتی خوبیاں" دیکھنے میں ناکام رہتے ہیں، وہ لوکاچ کا قول مد نظر رکھیں تو انھیں مشکل نہ ہو۔ جوائس کا ناول حقیقت پسندی کی نفی نہیں کرتا، لیکن وہ لوکاچ کے مقصود کی حقیقت پسندانہ تعبیر بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ لوکاچ کے کام کا نہیں، مگر وہ اس کی اہمیت کا معترف ہے۔ ظفر اقبال کی اہمیت کا اعتراف نہ کرنا خود اعتمادی کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔

حسرت موہانی وغیرہ کے زیر اثر ترویج و فروغ پانے والی غزل کی زبان اور شعریات کو مسترد کر کے ظفر اقبال نے بڑی قربانی دی ہے۔ اگر وہ "آب رواں" کی حدود میں رہتے تو معترضین کو موقع کم ملتا۔ لیکن پھر جدید غزل کی وہ توسیع اور جگہ جگہ سے تعمیر نو بھی نہ ہوتی جو ظفر اقبال کے ہاتھوں انجام پائی۔ ظفر اقبال آج بھی کم کوش اور کم تیز لوگوں کے لئے فیضان والہام نہیں بلکہ خوف و انکار کا سر چشمہ ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر اقبال کی تقلید آسان نہیں۔ جس طرح جوائس اور پروست کا ناول بعد والوں کے لئے نمونے کا کام نہ دے سکتا تھا۔ اسی طرح ظفر اقبال کی غزل دوسروں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ جو ان کی نقل کرتا ہے، منھ کی کھاتا ہے، اور پھر ظفر اقبال پر برستا ہے کہ آپ شاعری کو خراب کر رہے ہیں۔ کردن صد عیب و نہ کردن یک عیب کے مضمرات سے ظفر اقبال کو خوب واسطہ پڑا ہے۔

ظفر اقبال کی زبان کے اتنے چرچے ہیں کہ ہم لوگ اکثر یہ پوچھنا بھول جاتے ہیں کہ ظفر اقبال نے اس زبان کو کن مضامین و موضوعات کے بیان کے لئے استعمال کیا ہے؟ اس زبان سے انہوں نے کیسے پیکر اور استعارے بنائے ہیں؟ ان کی استعارہ سازی کی قوت کس طرح کی ہے اور کس چیز میں ہے؟ ان باتوں کی طرف تھوڑا سا شارہ افتخار جالب نے کیا تھا۔ انہوں نے ظفر اقبال کے استعاروں میں "مخفی لسانی مناسبتوں" کے علاوہ کسی اور شے کا نشان باقی نہ رہنے کا ذکر کیا تھا۔ پھر جہاں تک پیکروں اور استعاروں کے باہم در وبست کا سوال ہے، انہوں نے دو غزلوں (۱) لہو کی سر سبز تیرگی ہے کہ رنگ اڑتے لباس کا ہے اور (۲) میدان تھے جہاں وہاں جنگلے جنگل ہونے کا غیر معمولی تجزیہ پیش کیا تھا اور دکھایا تھا کہ یہاں محسوس اور معقول کے ذریعہ معمولی اور غیر معمولی، جنسی اور روحانی، ہر طرح کے تجربے کو "محسوسات کی ثابت و سالم شکل"

عطا کی گئی ہے۔ "گلافتاب" کے بہت سے اشعار کے لئے یہ حکم بالکل درست ہے۔ لیکن یہ ظفر اقبال کے اس طرز کی طرف ہمیں منعطف نہیں کرتا جو "آب رواں" کی اکثر غزلوں میں جھلکتا ہے اور "رطب ویابس" اور "غبار آلودہ سمتوں کا سراغ" کے زیادہ تر شعروں میں اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ اس اسلوب میں استعارے کی صلابت معقول سے زیادہ محسوس اور تخیل سے زیادہ فکر سے تشکیل پاتی ہے۔ یہاں سب سے پہلی بات معاصر دنیا کا خارجی سطح پر شعور ہے، جب کہ "گلافتاب" میں یہ شعور زیادہ تر داخلی سطح پر تھا۔ یعنی اب خارجی حوالے زیادہ صاف دکھائی دیتے ہیں، ابہام کم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ باصرہ، شامہ، سامعہ اور لامسہ نے براہ راست ترسیل کا کام شروع کر دیا ہے۔

کچھ کہہ سکو تو گوش بر آواز ہیں درخت ان جنگلوں میں مرگ صدا کا خطر نہیں
گر کے صد پارہ ہوا ابر میں اٹکا ہوا چاند سر پہ چادر سی نظر آئی شب تار مجھے
مجھے دیا نہ کبھی میرے دشمنوں کا پتہ مجھے ہوا سے لڑاتے رہے جہاں والے
ملا تو منزل جاں میں اتارنے نہ دیا وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا
پڑے برہنہ سری کو دعائیں دو کہ یہاں جنہیں کلاہ کا خطرہ تھا ان کا سر بھی گیا
پھر سر صبح کسی درد کے در وا کرنے دھان کے کھیت سے اک موج ہوا آئی ہے
کوئی شرر نہ اٹھا سنگ تیرہ بختی سے کوئی گوہر نہ یم حادثات سے نکلا
میں چپ رہوں تو ظفر میری موت ہے اس میں یہی فغاں میری جاں ہے پر اثر نہ سہی
فراز شام سے گرتا رہا فسانۂ شب گدائے گوہر گفتار نے سنا ہی نہیں
پڑے رہو کہ یہ جھنکار بھی غنیمت ہے کرو گے حلقۂ زنجیر سے نکل کر کیا
سیلاب تھا یہاں سے بھی ہو کر نکل گیا اب یاد ہے شکستن دیوار و در کسے

ان اشعار میں ذاتی المیہ اور خارجی دنیا کا شعور کم و بیش برابر کا درجہ رکھتے ہیں، اور بعض اوقات دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ یہاں پیکر اور استعارہ دونوں مجرد سے محسوس کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ شروع کے دونوں شعر خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ رائیگانی، انسانی اعمال و تاملات کی بے اثری، اور اظہار کی بے چینی بلکہ مجبوری، اس شاعر کے خاص اوصاف ہیں۔ آٹھویں شعر میں (خیال رہے کہ مصرع ثانی میں تسکین اوسط ہے) کہا گیا کہ اظہار برابر ہے زندگی کے، فغاں علامت ہے وجود کی، اور بیان روح ہے، زندگی ہے۔ اس کے بغیر متکلم کو ہر طرف موت نظر آتی ہے۔ اسی بات کو تاڈاراف نے الف لیلہ کے حوالے سے کہا ہے کہ جب تک کہانی باقی ہے زندگی باقی ہے۔ کہانی برابر ہے زندگی کے، اور خاموشی مرادف موت ہے۔ نویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ سننا بھی ایک طرح کی خاموشی، اور اس لئے ایک طرح کی موت ہے۔ دسویں شعر میں اسی بات کو اور رنگ سے کہا ہے۔

اوپر جو شعر میں نے نقل کئے وہ سب "آب رواں" سے لئے گئے ہیں۔ ان میں ظفر اقبال کے تمام

سر وکار، زندگی (داخلی اور خارجی) کے بارے میں ان کے رویے، شعر کے بارے میں ان کا تصور، علامت، پیکر اور استعارے سے ان کا شغف، سب نظر آتے ہیں۔ عام حالات میں تو آب رواں "کے مصنف کو زندگی بھر ان اشعار کی کمائی کھانی چاہیے تھی، لیکن ظفر اقبال عام شاعر نہیں، اور وہ عام حالات میں یقین بھی نہیں رکھتے۔ "گلافتاب" میں "آب رواں" کے بنیادی رنگوں کو تیز تر کرتے ہوئے ایک نیا عنصر شامل ہوتا ہے۔ افتخار جالب نے "گلافتاب" کے بنیادی رنگ حسب ذیل بتائے تھے: زبان، تجرید، اور مزاح۔ حقیقت یہ ہے کہ ہلکے ہی سہی، لیکن یہ سب رنگ "آب رواں" میں صاف نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ "آب رواں" سے "گلافتاب" تک ایسی طویل جست ہے جسے Quautum jump ہی کہہ سکتے ہیں، یعنی ایسی جست جو بیچ کے منازل کو چھوڑتی ہوئی عمل میں آئے۔ "گلافتاب" میں جنس اور اس کی مایوسیوں کا تجربہ اپنے اوپر ہنسنے کا انداز اور عشق و ہوس دونوں کے رائگاں ہونے کا احساس، یہ سب چیزیں نسبۃً نئی ہیں۔ زبان کے ساتھ وہ سلوک جسے رومن یاکبسن نے "منظم تشدد" کہا ہے۔ اور جسے اس نے شاعری کی بنیادی صفت بتایا ہے، یہاں تقریباً ہر غزل میں نمایاں ہے۔ کتاب ختم ہوتے ہوتے ایسی غزلیں سامنے آنے لگتی ہیں جن میں زبان کے بند تقریباً ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ زبان کے بند مکمل پوری طرح نہ توڑ سکنے کے باعث شاعر کو خود پر شدید غصہ ہے، اور وہ زبان کے آہنی در دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر اس غصے کو ظاہر کر رہا ہے یعنی "گلافتاب" کی آخری غزلوں کی بدحواس کن بے معنویت خود ہی استعارہ ہے، اس بات کا کہ ہم بقول نطشہ "زبان کے زنداں" میں قید ہیں۔ ہم کچھ بھی کریں، اگر ہمیں زندہ رہنا اور کلام کرنا ہے تو ہم زبان کے باہر نہیں جا سکتے۔ ظفر اقبال نے زبان (Parole) کو وسیع کرنے اور اسے لسان (langue) سے بیش از بیش حصہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی کوشش کی کامیابی اور ناکامی دونوں کا اظہار ان غزلوں میں ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں دونوں (کامیابی اور ناکامی) کے مابین تناؤ صاف جھلکتا ہے۔

لہو لہلوٹ سیاہی پھیلویں پھب کڈھب کاغذ طلب تحریرنے کے

دن درگاہوں لکھیا لیکھ ہوا کے نیلے درتال رت کرت چمک چانن میں فرق زمین اسماں کا

امشکل پیروی انجان ایجاد مگن متھیڈ عجب اشعارنے کا

فصیح فراست عزائم بلیغ عنقا میں کدام خاک اڑا نیم دشت دریا میں

اس بات سے قطع نظر کہ "دلدارنے کا رانکارنے کا" والی غزل جنسی تجربے کے تلزذ کا ایک ایسا شاہکار بیان ہے کہ شاید متنبی یا ابونواس کے یہاں، یا پھر ovid کے یہاں اس کی مثال ملے، ان تمام غزلوں میں ریختہ (یعنی فارسی اردو ملی جلی زبان، جو قدیم اردو کا ایک روپ تھی) کا اثر نمایاں ہے۔ ریختہ ایک طرح کی کھچڑی زبان (Creole) تھی اور زیادہ دن چلی نہیں۔ لیکن ظفر اقبال کے یہاں اس کریول کاری (Creolisation) کے ذریعہ زبان کے حدود وسیع کرنے کی کوشش کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ 'گلافتاب' کی یہ آخری غزلیں نمونے (model) اور زیست پذیر (viable) شاعری کی حیثیت سے ناکام سہی، لیکن

ایسی غزلیں کہنے والے کی بے مثال جرات اور بے نظیر قادر الکلامی کی داد ضرور دینی چاہیے۔ بعد کے مجموعوں، خاص کر "اطراف" اور "عیب و ہنر" میں شاعر نے اس تجربے سے کام بھی لیا ہے جو اسے "گلافتاب" کی ان غزلوں کو کہہ کر حاصل ہوا۔

"گلافتاب" کی منقولہ بالا غزلوں کے ساتھ ساتھ ظفر اقبال کی مملکت سخن میں استحکام اور انتظام و انصرام کی علامت کے طور پر ان کے لہجے میں وہ چیز مکمل ہو کر نظر آتی ہے جسے میں "حاکمانہ قدرت" کا نام دیتا ہوں۔ اپنے اپنے طور پر یہ صفت میر، سراج، سودا، ولی، قائم چاند پوری، غالب، ناسخ سب کے یہاں ہے یعنی شاعر خود سے، معشوق سے، آپ سے، زمانے سے یوں گفتگو کرتا ہے گویا وہ سب میں ممتاز اور سب سے الگ ہو، اور شاید سب سے بہتر بھی۔ گذشتہ مجموعوں میں تعلّی اور در مدح خود کے اشارے تھے، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ اب شاعر واقعی فراز مسند سے گفتگو کر رہا ہے۔ "رطب و یابس" میں اینٹی غزل کا جوش ہے، اور حاکمانہ غزل کا بھی۔ (اپنے طور پر اینٹی غزل بھی حاکمانہ ہے، لیکن وہ الگ بحث ہے۔) پڑھنے والوں نے اینٹی غزل کے آگے نگاہ نہ کی، ورنہ مندرجہ ذیل طرح کی غزلیں "رطب یابس" میں اور پھر بعد کے مجموعوں سے کثرت سے ہیں ؎

اک دن ادھر سوار سمندر سفر تو آئے	خود بڑھ کے روک لیں گے کہیں وہ نظر تو آئے
کچھ دیر پھڑ پھڑا کے نکل جائیے مگر	وہ دام دل پذیر کہیں زیر پر تو آئے
وہ درد لادوا ہی سہی دل پہ تو وا ہو	وہ حسن اک بلا ہی سہی اپنے سر تو آئے
یہ کیا کہ آبگینہ سلامت ہی لے کے آئیں	کچھ ٹوٹ پھوٹ تو رہے کوئی ضرر تو آئے
شامل نہیں جلوس ہمارے میں وہ تو کیا	یہ بھی بہت ہے بام سے نیچے اتر تو آئے
ارزاں ہے خون خلق تو پھر کوبہ کو تو ہو	ہے دستک ستم تو ذرا در بہ در تو آئے
آنکھیں چمک دکھائیں تو آساں ہو راہ مرگ	یعنی سحر سے پہلے چراغ سحر تو آئے
کچھ بن سکے نہ ہم تو بجو کر دکھادیا	یوں کارگاہ شوق میں کچھ کام کر تو آئے
نازاں ہو اپنے عیب سخن پر ہزار بار	لازم ہے آدمی کو ظفر کچھ ہنر تو آئے

قافیہ بھس، ردیف مشکل لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو محض اوسط درجے کا ہو۔ سب کے سب بلند رتبہ، سب کی بندش چست، مضمون ہر شعر میں پورا پورا بیان ہوا ہے۔ اور مناسبت الفاظ، ربط، لہجے کا بانک پن کثرت معنی سب موجود ہے۔ پوری غزل حشو و زوائد سے محفوظ ہے۔ اوپر اوپر ذرا خوش طبعی اور تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے رنگ کی تہ میں برہمی، المیہ اور سیاسی نکتہ چینی کے بھی کنائے ہیں شاعر / متکلم کا اپنے اوپر اعتماد اور لہجے میں برتری کا آہنگ ان چیزوں نے اس غزل کو خارجیت / داخلیت کی بحثوں سے اوپر اٹھادیا ہے۔ باہر والوں سے اور خود سے تخاطب، دونوں میں ایک طرح کی سچائی نمایاں ہے۔

سیاسی رائے زنی سے ظفر اقبال کا شغف پرانا ہے۔ لیکن "عہد زیاں" جو نئی غزلیں ہیں (اکثر غزلیں

جوں کی توں یایادنی تغیر "رطب یابس" کی ہیں) ان میں سیاسی باتوں کو غزل کی زبان میں بیان کرنے کی طرف دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ "غبار آلود سمتوں کا سراغ" میں لہجہ اور کیفیت بدل کر ذاتی نارسائی اور محرومی اور اس محرومی پر ذرا خشک طنز اور خوش مزاج خود استہزا کا رنگ چمک اٹھا ہے۔ "عیب و ہنر" سے سیاسی مضامین کی کثرت دوبارہ ہونے لگتی ہے۔ "سر عام" میں یہ مضامین بالکل بے پردہ ہو کر سامنے آتے ہیں۔

سراج منیر نے "سر عام" کی غزلوں کے لئے "سیاسی معاملہ بندی" کا دلچسپ فقرہ تراشا تھا۔ یہ بے تو حسب حال لیکن پورا حال نہیں بیان کرتا۔ خود ظفر اقبال اسے "اپنی ناکام شاعری" قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان غزلوں میں "موضوع اور شعریت کا توازن" برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔ یہاں خود ظفر اقبال کو وہ غلط فہمی ہوئی ہے جو ان کے مخالفین کا شیوہ ہے۔ سیاسی رائے زنی کلاسیکی غزل کی شعریات میں داخل ہے، بشرطیکہ رائے زنی کسی پارٹی لائن پر مبنی نہ ہو، بلکہ خود متکلم / شاعر نے سماج کے فرد آزاد کی حیثیت سے یہ رائے زنی کی گئی ہو۔ غزل کا متکلم ہمیشہ "باہر کا آدمی" (outsider) اور "غیر مقلد" (nonconformist) رہا ہے۔ جب وہ زاہد اور ملا اور شاہ و شحنہ پر بے محابا نکتہ چینی کر سکتا ہے تو اس کی آزادی رائے میں کیا شک؟ ہاں تہ داری اور بالواسطگی اور کثیر المعنویت غزل کی دنیا میں نہایت پسندیدہ ہیں، اور اگر سیاسی رائے زنی ان صفات کے ساتھ آئے تو کیا خوب۔ لیکن آبرو سے لے کر حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر تک غزل میں سیاسی خیالات کا جب اظہار کیا گیا تو برملا ہی کیا گیا۔ مصحفی کے کلام میں انگریزوں پر جو تنقید ملتی ہے وہ اس بات کو بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے ۔

دیوان سوم: ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی / کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

دیوان ہفتم: ہے یہ فلک سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی / رکھتا ہے مہ و خور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ

دیوان ہشتم: توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تیں / فوج دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

دیوان ہفتم کے شعر میں پیکر اور استعارہ کی تھوڑی سی کار فرمائی ہے۔ ورنہ بقیہ دو شعروں میں تلخی (دیوان سوم) اور طنز (دیوان ہشتم) نمایاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ سیاسی غزل گوئی کی شعریات اس تہ داری اور پیچیدگی بیان کا تقاضہ نہیں کرتی جو غزل کی عمومی صفت ہے۔ اس کے بجائے برہمی، طنز، تلخی، سخت و درشت لہجہ یہ چیزیں بروئے کار آتی ہیں۔ یہاں سوال اٹھ سکتا ہے کہ ایسا ہے تو نیاز حیدر اور حبیب جالب کو نمائندہ شاعر کیوں نہ مانا جائے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں شور زیادہ ہے، تلخی کم۔ اور طنز بہت اوا کلی سطح کا ہے۔ لیکن دوسرا اور زیادہ موثر جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کی شاعری مقررہ راہوں پر اور جانی پہچانی سمتوں میں سفر کرتی ہے اور پہلے سے طے شدہ نتائج نکالتی ہے۔ یہ نتائج نیاز حیدر اور حبیب جالب نہیں، بلکہ کوئی اور نکال کر ان کے حوالے کرتا ہے اور وہ اپنی نظم ان نتائج کے چاروں طرف تعمیر کرتے ہیں "سر عام" کی غزلوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاعر ہر طرح کی ناانصافی اور استحصال کے خلاف ہے۔ اس کی برہمی کے لئے چند مخصوص ہی ہدف نہیں ہیں۔ مثلاً ترقی پسندوں کے لئے ویت نام کے خلاف لکھنا

آسان تھا اور ہنگری یا افغانستان میں روسی استبداد اور خوں ریزی کے خلاف لکھنا غیر ممکن تھا۔ ممکن ہے "سر عام" کا شاعر بھی کچھ عملی سیاسی نظریات رکھتا ہو، لیکن وہ کامیو کی طرح ہمیشہ ہر طرح کے استحصال اور جھوٹ سے نبرد آزما نظر آتا ہے۔ علاوہ بریں، "سر عام" میں ایسی بھی غزلیں ہیں جو غزل کی عام شعریات پر پوری اترتی ہیں۔ براہ راست ان دونوں طرزوں کا بیان اور بالواسطہ بیان، انضمام بھی بعض غزلوں میں ہے۔ اور وہ غزلیں ہمارے زمانے کا قیمتی سرمایہ ہیں:

عرش پاتال ہو گئے میرے — لوگ بدحال ہو گئے میرے
شہر ویران ہو گیا یکسر — باغ پامال ہو گئے میرے
کوکلیں میری ہو گئیں خاموش — مور بے چال ہو گئے میرے
کوئی منظر کہیں جچا ہی نہیں — خواب کنگال ہو گئے میرے
رات دن بوجھ بانٹنے والے — فارغ البال ہو گئے میرے
گرہ کٹ چور اٹھائی گیر سبھی — قافلے وال ہو گئے میرے
دل کے اندر گرا تھا خون مگر — فرش کیوں لال ہو گئے میرے
کوئی پہچان ہی نہیں پاتا — کیا خدوخال ہو گئے میرے
گرم گفتار ہوں ظفر کتنا — حرف سیال ہو گئے میرے

اب اس بڑھ کر کوئی کیا کہے گا؟ اور لطف یہ کہ زبان کا چونچال پن، مناسبت الفاظ، توازن بین المصرعتین کلاسیکی غزل کی طرف اشارے اور صدائے بازگشت سب موجود ہیں۔ شعر (۶) کی رنجیدگی اور تلخی یکساں وار کرتی ہیں۔ "میرے" کی کثیر المعنویت کس قدر دلکش ہے۔ بعض دوسری غزلوں میں صرف و نحو کی پیچیدگی سے استعارے کا کام لیا گیا ہے:

غلط ہے اور میں اسے مسترد بھی کرتا ہوں — یہی کہ میرا مقدر دیا گیا ہے مجھے
بیان دیتا رہا کون صلح جوئی کے — ارادہ اور ہی بین السطور کس کا تھا
وہ نوک تیغ پہ رکھ لائے تھے ظفر دستار — قبول کر کے ہی آخر بچا ہے سر میرا

تیسرے شعر میں پیکر کی ڈرامائی دہشت ناکی قابل لحاظ ہے۔ امام ابو حنیفہ کو قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا اور بار بار پیش کیا گیا۔ انہوں نے ہمیشہ انکار کیا، آخر زندانی کیے گئے اور حبس ہی میں واصل بحق ہو گئے۔ تاریخ کو شعر میں یوں ڈھالتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کہیں مشکیزہ لکھ دیا، کہیں دشت لکھ دیا، کہیں قربانی کا ذکر کر دیا اور سمجھا کہ استعارہ، علامت، تمثیل کا سب حق ادا ہو گیا۔ استعارے کی تازگی کے علاوہ اس شعر میں بڑی بات یہ ہے کہ اس میں خود ترحمی کا شائبہ تک نہیں۔ پھر شعر کی صورت حال میں ڈراما ہے، لیکن اس ڈرامے کی مرکزی کردار وہ لوگ (وہ قوتیں، ادارے) قرار دیے گئے ہیں جو نوک تیغ پر دستار رکھ کر لائے تھے۔

ظفر اقبال کے لئے استعارہ ہمیشہ مکاشفہ اور توسیع معنی کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا استعارہ اس

قدر بالواسطہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر محسوس نہیں ہوتا۔ بیانیہ کی سطح پر شعر متاثر کرتا ہے، جب غور کریں تو اس کے دوسرے ابعاد کھلتے ہیں۔ مثال کے طور پر "گلا آفتاب" کا ایک بدنام شعر ہے ؎

پھرتا ہوں بازار میں رک جاؤں لیتا چلوں اس کی خاطر بریسیئر اپنے لئے دوائیاں

اس بات سے قطع نظر کہ دوہے کی بحر کو غزل میں بالکل صحیح صحیح برتا گیا ہے، اور یہ خود ہی ایک طرح کا استعارہ ہے، قابل دید نکتہ یہ ہے کہ بازار میں بے مقصد پھرنے والا شخص دراصل استعارہ ہے آج کل کے انسان کا جو جسمانی اور جذباتی (یا دونوں) لحاظ سے نامرد ہے۔ (یا پھر وہ کوئی بوڑھا ہے جس کی جوان بیوی ہے) بدن میں طاقت نہ ہونے کے باعث وہ خود کو بیوی کے سامنے چور محسوس کرتا ہے اور اس کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ لیکن گھر تو جانا ہی ہے، اور اگر بیوی کے لئے کوئی تحفہ خرید لے تو شاید آنکھ ملانا آسان ہو۔ تحفے میں بریسیئر استعارہ ہے بیوی کی جوانی کا، اور اپنے لئے دوائیں استعارہ ہیں متکلم کی جسمانی نااہلی کا۔ شعر میں اولین تہ طنز کی ہے، لیکن جب اس تہ کو کھولیں تو استعارہ ملتا ہے۔

استعاروں کی یہ لطافت "عیب و ہنر" کے اشعار میں قدم قدم پر ملتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اب تماشائے دنیا میں ایک تھکن، ایک اضمحلال شامل ہو گیا ہے۔ ممکن ہے یہ متکلم / شاعر کے روحانی ارتقا اور ذہنی سفر کی ایک منزل ہو۔ یا پھر یہ شعر ہمارے سارے زمانے اور صدی کے آخری دس بارہ برسوں کی دنیا کا استعارہ ہوں۔ گویا ظفر اقبال کا کلیات ایک عظیم الشان اسٹیج ہو جس پر دنیا روپ بدل بدل کر سامنے آ رہی ہو۔ جنس سے شغف بھی اب کم ہو گیا ہے۔ نہ کامیابی کے جشن ہیں، نہ ناکامی کے رنج، اور نہ اپنی ہوس یا نامردی پر طنز۔ یہ سراسر وہ چیز نہیں ہے جسے ملٹن نے "ذہن کا سکون، سارے جذبہ و درد و جوش کا نبڑ جانا" کہا تھا بلکہ اس میں کسی تازہ آگہی کی شان بھی شامل ہے۔ یعنی یہاں اختتام نہیں، بلکہ نئی طرح کی واردات آنے کا معاملہ ہے ؎

رات جگ مگ کر اٹھی ہے کچھ اندھیرا سا مگر دل کے اندر تھوڑی تھوڑی شام رہ جانے سے ہے

بہتا ہے نہ رہتا ہے کناروں میں سمٹ کر دریا ہی کچھ ایسا ہے کہ دریا نہیں لگتا

اب وہ کھٹ میٹھی محبت قصۂ ماضی سہی لیکن سو طرح کے بھولے بسرے ذائقے اب تک زباں پر ہیں

ایک اس کے وصل کی خوشبو کے پیچھے پھرنے والوں کا یہ شرف بھی کون سا کم ہے کہ رخش رائگاں پر ہیں

شعر ۳ اور ۴ کی بحر (رمل مثمن سالم کے آخر میں ایک سبب خفیف بڑھایا ہے) غیر معمولی عروضی مہارت کا ثبوت تو ہے ہی، یہ اس بات کا استعارہ بھی ہے کہ تخلیقی قوت کا وفور ہے، جہاں سے یہ مال آیا ہے وہاں ابھی اور بھی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ "عیب و ہنر" میں نسبۃً اجنبی بحریں کئی بار استعمال ہوئی ہیں۔ اور "وہم و گماں" میں اشعار محولہ بحر میں بھی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ایسی اجنبی بحر اور ہر غزل میں وہ روانی کہ باید و شاید۔

"عیب و ہنر" اور "وہم و گماں" دونوں میں انداز کی بے تکلفی، لہجے کی صفائی، شعر کی روانی یہ سب مشکل

چیزیں خود انتقاد (Self Criticism) خود استہزا (Self mocking) کاروبار حیات اور کاروبار عشق کا بیان جیسی غیر متوقع چیزوں کے ساتھ مل گئی ہیں کہ جدید غزل کا ایک بالکل نیا اور نا قابل تقلید رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے کہ میر کا بہت سا کلام ایسا ہے کہ پوری غزل پڑھے بغیر اس کا مکمل لطف نہیں حاصل ہوتا۔ یعنی کسی نہ کسی طرح کی نئی بات ہر شعر میں ہوتی ہے، اور لہجے کی بے ساختگی اور روانی اس کے لئے موسیقیاتی سنگت معلوم ہوتی ہے۔ ظفر اقبال نے "عیب و ہنر" کی غزلوں سے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مندرجہ ذیل دو غزلیں ملاحظہ ہوں۔ پہلی غزل "عیب و ہنر" سے ہے اور دوسری "وہم و گماں" سے۔

(۱)

مدت سے کوئی میرے بھی جیسا نہیں آیا
میں یوں ہی تو منظر پہ دوبارہ نہیں آیا

باقی ابھی کتنا ہے بدی کا یہ سمندر
ہوں کب سے رواں اور کنارہ نہیں آیا

موسم کئی گذرے ہیں اس پردۂ دل پر
بازو نہیں لہرائے ہیں چہرہ نہیں آیا

نکلے تھے یہ کس اندھیرے کے سفر پر
آنکھیں تو پلٹ آئیں تماشا نہیں آیا

کہتے ہیں کہ پانی ابھی گذرا نہیں سر سے
سیلاب ابھی شہر میں اتنا نہیں آیا

ہے کیسی مسافت کہ مری راہ میں اکثر
دیوار تو آئی ہے دریچہ نہیں آیا

ہم بھی وہی پھرتے رہے اطراف میں اس کے
البتہ ملاقات کا موقع نہیں آیا

یہ طرفہ لطیفہ ہے کہ اس آگ میں ہم کو
چلنا نہیں آیا بھی رکنا نہیں آیا

لوگوں میں ظفر آپ زباں ساز بھی کہلائے
اور بات بھی کرنے کا سلیقہ نہیں آیا

(۲)

شہر خوابیدہ کے اندر نہیں جانے والی
یہ صدا وہ ہے جو گھر گھر نہیں جانے والی

خود تو میں اور زیادہ نہیں جینے کا مگر
مجھ میں اک چیز ہے جو مر نہیں جانے والی

آگے پیچھے رہی وہ شام تماشا مجھ سے
کہ ابھی میرے برابر نہیں جانے والی

اک ہوا ہے جو میرے چاروں طرف چلتی ہے
اور کسی ایک ہی رخ پر نہیں جانے والی

رفتہ رفتہ کوئی مجھ میں سے گذرتی ہوئی شے
جا رہی ہے جو سراسر نہیں جانے والی

لہر سی ایک زمانوں کی مرے ساتھ ہی ساتھ
جاتی رہتی ہے جو اکثر نہیں جانے والی

کیوں نہ دشوار ہو اس شہر کو جاتی ہوئی راہ
جو مری خاک سے ہو کر نہیں جانے والی

اس طرف سے ڈرتی لرزتی ہوئی یہ موج نگاہ
جائے گی بھی تو مکرر نہیں جانے والی

میرے اندر جو کھلا کرتا ہے اک پھول ظفر
اس کی خوشبو کہیں باہر نہیں جانے والی

ان اشعار کے تجزیے اور توضیح میں کئی صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب تک جو کچھ میں کہتا رہا

ہوں اس کی روشنی میں شاید تفصیل کی ضرورت نہ ہو۔ "اطراف" کے دیباچے میں عبدلرشید نے لکھا ہے کہ "ظفر اقبال کی شاعری ایک ایسے معاشرے میں، جو عدم تحفظ کا شکار ہے، جہاں لفظ اپنے روایتی معنی کھو چکے ہیں، اور عصری حقیقتیں قبول کرنے کو تیار نہیں، اپنی واردات بیان کرنے کی سعی کرتی ہے۔" بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن جہاں تک لفظوں کے روایتی معنی کے کھو جانے کا سوال ہے، تو یہی بات یہ ہے کہ ہر بڑا شاعر زبان کو اپنے آپ میں زندہ کرتا ہے۔ اسی لئے والیری نے کہا تھا کہ شاعر کا منصب اور وظیفہ یہ ہے کہ وہ "قبیلے کی زبان کو مزکی (purify) کرے"۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب شاعر زبان کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو۔ یعنی وہ ایک طرف "وہم وگماں" میں ایسے ایسے شعر ڈال سکتا ہو کہ سودا، انشاء اور جرات کی ہجوؤں کو پسینہ آجائے۔

متوکل زندہ باد تقدیروں والے تھوہ
گڑ شکر بھلا ظفر انجیروں والے تھوہ

گورے گورے پاؤں تلے کالی اینٹیں کالے روڑ

تھوڑی اسی اس زمین پہ رم جھم کا ہے سوال چھوٹی سی آسماں پہ دھنک مانگتے ہیں لوگ

وہ جاگے ہوں کہ سوتے کھارہے ہیں ادھر ہم صرف غوطے کھارہے ہیں

پوچھا تو ناچار ظفر نے پنی ذات بتائی روٹی

وردی میں آنے کا کچھ اور مزا ہے بھائی ڈکیت
پہلے آنے والوں سے کی مچا ہے بھائی ڈکیت

ان سب اشعار میں غصہ زیادہ ہے، اتنا زیادہ کہ اگر زبان کی لگام ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو عجب نہ تھا۔ لیکن شاعر نے زبان کی ایک آدھ نزاکت ہر شعر میں پھر بھی رکھ دی ہے۔ دوسری طرف اب تک کے آخری مجموعے کا نام "اطراف" ہے، لیکن شاعر نے یہ واضح نہیں کیا کہ "اطراف" بروزن "اقبال" ہے، بمعنی "نئی نئی چیزیں پیدا کرنا" یا بروزن "اعمال" ہے بمعنی "طرف یا سمت کی جمع"۔ میر نے بھی کچھ ایسی ہی چالاکی سے کام لیا ہے، لیکن انہوں نے دوسرے مصرعے میں جس طرح کا استعارہ رپیکر رکھ دیا وہ زبان کو زندہ کرنے اور مزکی کرنے کا ایسا نمونہ ہے جو کسی بھی زمانے کے شاعر کے لئے آدرش کا کام کرسکتا ہے۔ دیوان ششم میں ہے۔

پہلے شگاف سینے کے اطراف درد سے کوچہ ہر ایک زخم کا بازار ہو گیا

ظفر اقبال اسی راستے میں ہیں، لیکن وہ جگہ جگہ کلاسیکی مضامین کو subvert بھی کرتے چلتے ہیں۔ میر کا مشہور زمانہ شعر ہے۔

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں آگے ہو مے خانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

میر نے ہوا سے رنگ ٹپکنے کا مضمون میر رضی دانش سے لیا، لیکن اس میں معنی کے اتنے امکان رکھ دیے کہ

رضی دانش کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ رضی دانش۔

در دشت ابر رنگ شبستان لالہ ریخت　　نقش و نگار خانہ تماشا چہ ی کنی

میر رضی دانش کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ یہ شعر آصف نعیم کی مرتب کردہ بیاض "گنجینۂ بازیافتہ" میں ہے۔ یہ بیاض برٹش میوزیم میں محفوظ رکھے ہوئے مخطوطوں پر مبنی ہے یہ تفصیل اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ "شعر شور انگیز" میں میر کے منقولہ بالا شعر پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے رضی دانش کے شعر کا حوالہ نہ دیا تھا۔ آصف نعیم کی کتاب اس وقت معرض وجود میں نہ آئی تھی، اور نہ "وہم و گماں" جہاں سے میں مندرجہ ذیل شعر نقل کرتا ہوں۔

رنگ سا پھیلتا جاتا وہ ہوا کا ہر سمت　　وہم سا پھر بھی ہے یہ تھر تھری ہے بھی کہ نہیں

یہاں کلاسیکی مشاہدے (وہم؟) کو جس طرح معرض سوال میں لایا گیا ہے، اس پر بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن لفظ "تھر تھری" کی پیکری شدت اور کثیر المعنویت کی داد دیئے بغیر نہیں بنتی۔ وکٹر ہیوگو نے بودلئیر کو لکھا تھا کہ تم نے آسمان شعر پر ایک نئی تھر تھری (frisson) پھیلا دی ہے۔ بودلئیر کی لائی ہوئی تھر تھری اب تک باقی ہے۔ ظفر اقبال بھی کوئی چالیس برس سے اردو غزل میں ایک نئی تھر تھری پھیلا رہے ہیں، اور یہ ابھی تو رکتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ آگے کا حال اللہ جانے۔

الہ آباد

جنوری ۱۹۹۷

شمس الرحمن فاروقی۔ سکونت: الہ آباد (بھارت)

نوٹ: ظفر اقبال کے شاعر یا غیر شاعر ہونے کے متعلق صاحب نظر قاری کے اختلاف رائے کی آزادی مقدم ہے۔ ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)

اردو شعر و ادب بیسویں صدی کے تناظر میں۔ ۲

ریاض صدیقی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مضمون

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جب قوم پرست اہل الرائے اور علماء نے اس کوچے میں قدم رکھا تو انگریز اہل الرائے اور مسلمان علماء نے ان کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ان حقائق کا تجزیاتی مطالعہ ترقی پسند اہل نظر نے کیا مگر ان کی بھی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی۔ حتیٰ کہ ان پر بے سروپا الزامات لگائے گئے۔ سرسید تحریک کے سیاسی، تعلیمی اور سماجی موقف کے نتائج سے قطع نظر جو نقصان دہ ثابت ہوئے، اس تحریک نے زبان و ادب اور مذہب کی اصلاح کے حوالوں سے جو کارنامہ انجام دیا، اس کی افادیت سے یقیناً انکار کرنا زیادتی ہوگی مگر مشکل یہ ہے کہ اول الذکر اور آخر الذکر دھاروں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی، قومی، اور سیاسی موقف کے تانے بانے میں نو آبادیاتی سامراجیت کے جو رجحانات گھل مل گئے تھے اس کے اثرات بیسویں صدی کے شعر و ادب پر بھی مرتب ہوئے کیونکہ زبان اور شعر و ادب اور تعلیم و سیاست اور اقتصادیات کے مابین گہرے رشتے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علی گڑھ کے اندر ہی طالبعلموں کا ایک قوم پرست باغی دھڑا پیدا ہو گیا تھا، جس کو انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے سے انتظامیہ روک رہی تھی مگر جب ان باغیوں نے احکامات سے روبہ گردانی کی تو ان کو بورڈنگ ہاؤس سے نکال دیا گیا اور ان کے داخلے منسوخ کر دیئے گئے۔ ان باغی طالبعلموں نے علی گڑھ ہی میں ایک متبادل یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دی۔ علمائے دیوبند اور کانگریس نے ان باغیوں کی پیٹھ تھپتھپائی۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل مولانا حسرت پہلے آدمی تھے، جنہوں نے بعد میں کمیونسٹ پارٹی بنائی اور انگریزوں کے خلاف کمر کس کر میدان میں اترے۔ سرسید کے اپنے وفادار عناصر خمسہ میں شبلی پہلے تھے جنہوں نے اپنے محسن کے سیاسی موقف سے اختلاف کیا اور کانگریس کی طرف جھکے۔ انہوں نے بعد میں علی گڑھ چھوڑ کر اپنا ادارہ بنا لیا تھا۔ حالی نے بھی سرسید کی تعلیمی پالیسی کی دبے دبے لہجے میں مخالفت کی مگر وہ تحریک سے کبھی علٰحدہ نہیں ہوئے۔ اول الذکر مزاحمت کے مقابلے میں سرسید تحریک کے خلاف مخالفت کا جو رجحان ابھرا وہ کسی تنقیدی اور تجزیاتی اندازِ نظر کی دین نہیں تھا بلکہ کٹر پنتھی ملاؤں اور رجعت پسند قسم کے شرفا کی نری جذباتیت کا مظاہرہ تھا، جس میں ان کی مذہبی حسیت کا عمل دخل تھا۔ علمائے دیوبند نے تنقیدی حوالوں سے سرسید کے موقف کی مخالفت کی۔ یہ پروپگنڈا کہ علمائے دیوبند سائنس اور نئے علوم کے

کلیتاً مخالف تھے صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند وہ خط بھی ہے جو مولانا قاسم نانوتوی نے سرسید کو لکھا تھا۔ (دونوں خطوں کو کتابچے کی صورت میں دارالاشاعت کراچی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا تھا مگر یہ کتابچہ اب دستیاب نہیں ہے۔ اسے دوبارہ چھاپا نہیں گیا اور غالباً دارالاشاعت اب بہ وجوہ اسے شائع بھی نہیں کرنا چاہتا ہے) دوسری بڑی سند علی گڑھ کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مولانا محمود الحسن کا وائس چانسلر ہونا ہے۔ علمائے دیوبند کا سیاسی کردار ترقی پسندانہ اور سامراج شکن تھا جس کے نتیجے میں انگریزوں کے ہاتھوں انہوں نے بہت جان لیوا اذیتیں جھیلیں۔ ان کا کردار عوامی تھا اور ان کو اپنے معیار زندگی میں بہتری پیدا کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے علمی و فکری اور سیاسی و نظریاتی کردار کو بٹوارے کے بعد ہمارے یہاں بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور مورخوں نے بھی ان کو حوالہ نہیں بنایا۔ ان کی جو نسل ہجرت کر کے یہاں آ گئی تھی، وہ بھی علمائے دیوبند کے موقف سے دستبردار ہو گئی تھی۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ جمہوری ملکوں میں علم و ادب اور فکر و نظر کے شعبے بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں اور ان کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے علما اور اہلِ نظر قومی سالمیت اور حب الوطنی کے سرکاری موقف کو جواز بنا کر اپنی حق گوئی اور بے باکی کا سودا نہیں کرتے ہیں۔ انگلستان میں بھی ایسے مستند اہلِ نظر تھے، جنہوں نے اپنے حکمرانوں کی نوآبادیاتی سامراجیت کی مخالفت کی اور اس دور میں کی جب سرکار برطانیہ کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بھی جنگ کی مخالفت کرنے والے اہلِ نظر مخالفت کرتے رہے اور آخر تک اس جنگ کو سامراجی مفادات ہی کی جنگ قرار دیتے رہے۔ انگلستان کے حکمرانوں نے ان پر کبھی غداری کا الزام لگا کر ان کے سر قلم نہیں کئے۔ ہندوستان کے حکمرانوں نے بھی آل انڈیا مسلم لیگ کا خاتمہ نہیں کیا اور مدراس کی جن دو سیٹوں پر وہ جیتتی رہی، آج تک جیت رہی ہے۔ ایک اچھے روشن نظر اور مہذب سماج کی ان آفاقی خوبیوں سے ہمارے اہلِ نظر، حکمرانوں اور ان کے پالیسی سازوں کو کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس ان خوبیوں کو وہ غداری، شر پسندی اور قومی سالمیت کے خلاف ایک چیلنج گردانتے ہیں۔ اس وقت بھی یہی صورتِ حال ہے تو پھر مورخ صحیح اور مستند تاریخی متون کس طرح مرتب کر سکتے ہیں اور جنہوں نے اتنے مشکل حالات میں یہ کام کیا، ہمیں ان کو سر آنکھوں پر بٹھانا چاہئے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں کے دوران اردو شعر و ادب اور زبان میں ملے جلے رجحانات کی ریل پیل تھی اور ایسی ادبی تنظیمیں نہیں بنی تھیں جن کی کوئی ملک گیر صورت ہو۔ صرف سرسید یا علی گڑھ تحریک ہی کا پھیلاؤ پورے ملک پر حاوی تھا۔ اردو کے ایسے شعرا اور قلمکار بھی اس دور میں نمایاں ہوئے، جنہوں نے قوم پرستی اور وطن دوستی کو موضوع بنایا (اقبال اور چکبست)۔ کچھ شاعروں نے نیچر اور رومانیت کو ترجیح دی اور ان پر انگریزی

ہوورنا کیولر مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے نظام کی سرپرستی کی تھی اور خود بھی کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس نے رائج نظامِ تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لئے ایک لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ بھی جاری کی تھی۔ راجہ رام موہن رائے اور ان کے چیلوں نے لارڈ ارن ہیٹ پر زور ڈالا کہ وہ انگریزی طرز کے نظامِ تعلیم کو رائج کریں اور سرکاری رقم کو مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں پر ضائع نہ کریں۔ ولیم ہیٹنگ نے ان کے مشوروں کو ماننے میں دیر نہیں کی اور ہیٹنگز کی پالیسی کو ٹھکانے لگادیا۔ بعد کے دور میں اس کی ہندوستان دوستی کا حساب کیا گیا۔ اس پر کرپشن کے الزامات لگائے گئے اور کردار کشی کی گئی۔ راجہ موہن رائے نے انگریزوں کے تعاون سے کلکتہ میں پہلا کالج قائم کیا۔ انگریزوں کو مقامی زبانوں اور ثقافتوں سے آگاہ کرنے کے لئے بنائے جانے والے فورٹ ولیم کالج کو تین برسوں کے بعد بند کر دیا گیا۔ انیسویں صدی میں جب انگریزوں نے ہندی اردو اختلاف کو ہوا دینا شروع کیا تھا، ان دنوں سماج پر اردو لکھنے والوں کے اثرات ہی حاوی تھے اور ان میں کسی کو انگریزی زبان نہیں آتی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے محسوس کیا کہ اردو دانشوروں کے اس طبقے کو انگریزی کلچر علوم اور سائنس سے آگاہ کرنے کے لئے ایک ایسے تعلیمی ادارے کی ضرورت ہے، جہاں ان مضامین کی تعلیم اردو ہی میں دی جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے دہلی کالج بنایا گیا کیونکہ اردو دانشوروں کا بہت بڑا طبقہ جو سماج میں محترم اور معتبر سمجھا جاتا تھا، دہلی میں تھا۔ دہلی کالج کے کرتادھرتاؤں نے اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا اور تمام مضامین کی نصابی کتابیں بھی اردو ہی میں لکھوائیں۔ دہلی کے اردو اہلِ نظر کے اکثر متعلقین نے دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی اور جو نہیں بھی حاصل کر سکے، ان کے رابطے دہلی کالج سے تھے۔ فارسی پڑھانے کی ملازمت کے لئے غالب اور مومن نے دہلی کالج سے رجوع کیا تھا مگر اس کے لئے امام بخش صہبائی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مولوی ذکا اللہ اور رام چندر جو عیسائی ہوگئے تھے، دہلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ یہاں پڑھنے والے پہلی بار اقتصادیات، جغرافیہ، تاریخ، ڈرائینگ، حساب، اور سائنسی مضامین سے آشنا ہوئے۔ تاریخ کے ذریعہ ان کو برطانیہ اور یورپی ملکوں کے تمام حالات کا علم ہوا۔ دہلی کالج نے ان طالبعلموں کے ذہنوں کو تبدیل کیا، جو بعد میں اردو شعروادب کے منظر پر آئے تھے۔ گویا کالج نے سرسید کے لئے اہلِ نظر کا ایک ہراول دستہ تیار کر دیا تھا۔ مولوی عبدالحق کا یہ خیال کہ انگریزوں کو اردو کی اہمیت کا احساس تھا یقیناً صحیح نہیں ہے کیونکہ اردو مقامی زبانوں اور مشرقی علوم کے خلاف لارڈ میکالے نے پروپگنڈہ شروع کر دیا تھا اور جو تعلیمی پالیسی اس نے وضع کی تھی اس میں انگریزی زبان، علوم اور سائنسوں ہی کو ترجیح دی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں کو انگریزیانے اور نوآبادیانے (COLONISE) کے معاملے میں اس کا موقف بہت سخت تھا۔ اس دور میں صرف ایڈورڈ تھامس نے

کہانی سے آگاہ تھے مگر اس سے بھی انہوں نے کوئی سبق نہیں لیا۔ مولوی عبدالحق اور پڑھا لکھا اردو داں طبقہ علی گڑھ ہی کے پروردہ تھے۔ اس ہجوم میں صرف مولانا محمد علی جوہر ہی تھے، جنہوں نے اپنے رسالے "کامریڈ" میں مضمون لکھا اور اردو کو برِ صغیر کی لنگو فرانکا زبان قرار دیا۔ جو کہ تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح موقف تھا۔ ترقی پسندوں کا بھی یہی موقف تھا اور اس وقت ہم اردو کو لنگو فرانکا کی صورت میں دیکھ رہے ہیں جس کو اقوامِ متحدہ نے دنیا کی پانچویں بڑی اور عالمگیر زبان مانا ہے۔ ہمارے یہاں اگر انگریزی زبان اردو کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو بھی گئی، جس کے امکانات واضح نظر آرہے ہیں تو بھی اس کی لنگو فرانکا حیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اردو کو ہٹا کر اس کی جگہ پنجابی کو لانے کا ایک کمزور سا رجحان بھی پیدا ہوا ہے مگر اس سے بھی اردو کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

سر سید اور علی گڑھ تحریک نے بیسویں صدی میں جو پڑھی لکھی روشن خیال نسل پیدا کی، اس نے بھی انگریزی زبان اور انگریز حکمرانوں کے نو آبادیاتی کردار کو سمجھے بغیر ان کی ہاں میں ہاں ملائی تاکہ برطانوی ہندوستان کی انتظامیہ میں ان کو بھی ملازمتیں ملیں۔ اسی طبقے نے آزاد تجارت، صنعت و حرفت اور بینکنگ کی طرف رخ نہیں کیا چنانچہ مقابلے کی دوڑ میں ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے۔ اس سے دو نقصانات ہوئے اول کہ مسلمان اقتصادی قوت سے محروم رہے اور دوم ان کے مزاج میں آزادی کا رجحان نہیں پیدا ہوا۔ علی گڑھ کے پروردہ چند ہی تھے، جنہوں نے علی گڑھ کی انگریز نواز ذہنیت سے اختلاف کیا اور نو آبادیاتی سامراجیت سے ٹکرائے ورنہ عموماً مسلمانوں میں یہ رجحان پیدا نہیں ہوا کیونکہ راجہ رام موہن رائے ان کے برہمو سماج، بنگال کے اکثر دانشور اینگلو انڈین اور پارسی اور علی گڑھ سب ہی انگریزی زبان کے فروغ اور انگریزی طرزِ تعلیم ہی کو ہندوستان کے عوام کی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی کے آواخر میں البتہ ہندوؤں میں انگریزی داں اہلِ نظر کا ایک قوم پرست اور سامراج شکن حلقہ پیدا ہو گیا تھا، جبکہ مسلمانوں میں ایسا کوئی حلقہ پیدا نہیں ہوا۔ انگریزی زبان اور طرزِ تعلیم کے ہمنواؤں نے اپنے ایشیائی پڑوسی جاپان سے بھی کوئی سبق نہیں لیا، جس نے صنعت و سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے طور طریقوں سے تو استفادہ کیا مگر انگریزی زبان اور کلچر کی درآمد اور وہاں سے آنے والوں پر اپنی سرحدیں بند رکھیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان اور نیپال ہی ایسے علاقے ہیں، جہاں نو آبادیاتی حکمرانوں کے قدم نہیں پہنچے۔ اول الذکر مقامی انگریزی دانوں کے مقابلے میں تو وہ چند انسان دوست اور علم پرور انگریز بھلے تھے جو مقامی زبانوں اور ثقافتوں پر ہاتھ صاف کرنے کے حق میں نہیں تھے اور برطانیہ سے آنے والے انگریزوں کو بھی مقامی زبانوں اور ثقافتوں سے آگاہی حاصل کرنا پڑتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے (۱۸۱۷) میں اورینٹل

جس پر نوآبادیت کے اثرات نہیں تھے، حکمرانوں پر زور دیا تھا کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ذریعہ انگریزی کو نہ بنایا جائے اور انگریزی کی تعلیم اور تدریس کو صرف اعلیٰ مدارج میں رائج کیا جائے۔ دہلی کالج نے اردو داں اہلِ نظر کی جو نسل تیار کی تھی وہ اگر بصارت اور بصیرت سے کام لیتی تو اس دور کی تباہ حال توہم پرست اور ان پڑھ مسلمان قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کر سکتی تھی۔ انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں کے دوران جب انگریزوں نے اپنے پیر مظبوطی سے جما لئے تھے، پنشن یافتہ بادشاہ کو قلعہ معلّی کی چار دیواری تک محدود کر دیا تھا اور اس فقرے کو زبان زد خاص و عام بنایا تھا کہ سکہ بہادر شاہ کا اور حکمرانی کمپنی بہادر کی تو گویا انہوں نے اپنا سامراجی کردار ادا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے اردو اور مقامی زبانوں کے مستقبل کو ختم کر دیا تھا۔ اسی پالیسی کا کرشمہ تھا کہ بیسویں صدی میں انتظامی اور تعلیمی نظام پر انگریزی سوار ہو گئی تھی اور اس نے اردو و ہندی کی شہ رگ کو دبوچ لیا تھا۔ اسی پالیسی کے نتیجے میں پڑھے لکھے مقامی طبقے اور عام اکثریت کے درمیان علٰحدگی کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت جب ملک آزاد و خود مختار ہے بالکل یہی صورتِ حال موجود ہے۔ بیسویں صدی میں پورے برِ صغیر میں انگریزی طرزِ تعلیم رائج ہو گیا تھا اور اسکول کالج اور یونیورسٹیوں کا ایک جال پھیل گیا تھا۔ ذریعہ تعلیم اگر مقامی زبانوں ہی کو بنایا جاتا اور مقامی تاریخ و ثقافت کو ترجیح دی جاتی تو نیا اور ترقی یافتہ تعلیمی نظام واقعی ہندوستان کے لئے کار آمد ثابت ہوتا مگر اب اس نئے تعلیمی نظام میں طالبعلموں کو روزانہ سویرے سویرے "لانگ لیو دی کنگ یا کوئین" کا ورد کرنا پڑتا تھا برطانوی پرچم کو سلامی دینا ہوتی تھی انگریزی لازماً پڑھائی جاتی تھی اور تاریخ میں یورپین تاریخ بھی شامل کی گئی تھی۔ دوسری خامی یہ تھی کہ تعلیم ہر شہری کے لئے ضروری قرار نہیں دی گئی تھی چنانچہ غریب عوام کی اکثریت تعلیم سے محروم رکھی گئی اور صرف اعلیٰ دولت مند اور متوسط طبقے ہی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اینگلو انڈین طبقہ پہلے ہی اپنی مادری زبانوں اور مقامی لباس سے گلو خلاصی حاصل کر چکا تھا۔ نوآبادیاتی علاقوں میں عیسائیت کی تبلیغ اور مقامی باشندوں کے نچلے طبقے کو عیسائی بنانا نوآبادیاتی حکمرانوں کی محض مذہبی ہی نہیں سیاسی پالیسی کا بھی حصہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان حکمرانوں نے شرم و حیا کی عادی غریب ہندوستان کی عورتوں کو بھی غلام بنایا اور پھر ان کے بطون سے ناجائز اولادوں کی ایک فوج ظفر موج بھی پیدا کی اور انہوں نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ مدراس اور جنوبی ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو انگریزی پڑھے لکھے طبقے کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ بنگال کے علاقے پر بھی انگریزی حاوی تھی۔ برطانوی حکمران سرکاری نوکریوں میں اعلیٰ عہدوں پر آنے والے ہندوستانیوں کو مزید تعلیم و تربیت اور پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیجتے تھے اور ان پر یہ شرط بھی لاگو کی جاتی تھی کہ وہ وہاں قیام کے دوران انگریزی زبان وہاں کے کلچر

اور طور طریقوں کا مطالعہ کریں اور خود کو اسی رنگ میں ڈھال لیں۔ ہندوستانیوں نے اس شرط کی تکمیل کی بلکہ اکثر تو جب وہاں سے لوٹتے تھے تو ایک میم بھی ساتھ لاتے تھے جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک تیر بہدف نسخہ تھا۔ ہندوستان کے مقامی قوم پرست اور امرا و شرفا بھی اعلیٰ تعلیم و تربیت انگلستان ہی میں حاصل کرتے تھے۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی لندن جانا پڑتا تھا جس کے نتیجے میں بیرسٹروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان میں بھی اسی قسم کے ادارے بنائے جا سکتے تھے مگر انگریز حکمرانوں نے ایسا نہیں کیا۔ فوجی افسروں کو بھی تعلیم اور پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لئے لندن بھیجا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان امرا و شرفا کے لئے جو اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان نہیں بھیج سکتے تھے، ایسے تعلیمی ادارے بنائے گئے جس میں متوسط اور نچلے طبقے کے بچوں کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے پڑھے لکھے لندن پلٹ اور اعلیٰ مقامی اداروں سے تعلیم پانے والی نسل میں ایک واضح ذہنی تبدیلی پیدا ہو گئی اور مغرب کی برتری کا تصور ان کے ذہنوں میں رچ بس گیا۔ یہ نسل چونکہ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کو کنٹرول کرتی تھی، اس لئے مغرب کی برتری کا تاثر ہندوستانی عوام پر بھی مرتب ہوا اس تبدیلی کا ایک منفی پہلو یہ تھا کہ پڑھے لکھے اور اقتدار و اختیار میں شامل انگریزی داں طبقے اور عوام کی اکثریت کے درمیان ایک حد سکندری قائم ہو گئی اور اس کے اثرات ہندوستان کی لسانی اور ادبی روایت پر بھی مرتب ہوئے اور مغربی فکر و فلسفہ کے مختلف رجحانات اس روایت کے تانے بانے میں شامل ہو گئے۔ آزادی کے بعد بھی اس صورتِ حال میں تبدیلیوں کی جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور جو کچھ اور جیسا نو آبادیاتی دور میں تھا وہی برقرار رہا۔ حتیٰ کہ جن خاندانوں نے عیسائیت قبول کی تھی، ان کے ذہنی اور جذباتی رشتے بھی مغربی کلیسا سے جڑ گئے۔ آزادی کے بعد بھی وہ جال جو ہندوستان اور پاکستان میں عیسائی مشنریوں نے پھیلایا تھا اس کی کارکردگی میں کمی نہیں آئی بلکہ وہ اور زیادہ فعال اور سرگرم ہو گئے۔

(جاری ہے)

ریاض صدیقی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

نوٹ: اس مضمون کی پہلی ہی قسط پڑھ کے اختلاف رائے کے اظہار کے طور پہ ممتاز شاعر و نقاد ارمان نجمی نے ایک گراں قدر جوابی مضمون سہ ماہی تشکیل کے اگلے شمارہ میں اشاعت کے ارسال کیا ہے۔ (ادارہ)

* افسانہ نگار عبدالرشید حواری نے ابھی صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ ساکنانِ رانچی (بہار۔ بھارت) پرکاش فکری اور اختر یوسف کا سہ ماہی تشکیل کراچی (پاکستان) سے غیر مشروط اور بے لاگ واسطہ قائم ہے۔ تاہم ابھی ایک مفصل انکشاف ہونا باقی ہے کہ صلاح الدین پرویز نے "نیا عہد نامہ" رانچی کو کس بھاؤ خریدا! (ادارہ)

بیدؔل اور غالبؔ آئینہ در آئینہ۔۔۔ ۲

ابراہیم اشک　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مضمون

جس طرح غالب کے اشعار کی شرح لکھنے والوں نے اکثر غلط مفہوم تلاش کئے ہیں اسی طرح بیدؔل کے تعلق سے اس شعر نے بھی ناقدوں کو خاصا پریشان کیا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ غالبؔ طرز بیدل میں ریختہ کہنے میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اس مشکل طرز کو اپنانے میں انہیں قیامت نظر آنے لگی۔ اور غالبؔ نے اس طرز کو جو کہ مشکل تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے کاش ہوتا تو غالبؔ کی شاعری بھی اپنے ہم عصر ذوقؔ دھلوی کی طرح آسان زبان وبیان کی شاعری ہو کر رہ جاتی۔

ہوا تو یہ کہ طرز بیدؔل ہی میں غالب رمتا چلا گیا اور اتنا آگے نکل گیا کہ وہاں سے پلٹنا اس کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا۔ اس مقام پر پہنچ کر اسے صاف طور پر یہ اعلان کرنا پڑا......

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"　　(۱۸۲۱ء)

یا پھر یہ کہ......

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی　　(۱۸۲۱ء)

لیکن غالبؔ کو اس بات کا بھی خاصہ احساس تھا کہ اس کی شاعری بھلے ہی مشکل ہو، بے معنی نہیں ہے طرز بیدؔل کے اثر سے وہ تو گنجینۂ معنی کا طلسم بنتی جا رہی ہے۔ اس کا اعتراف خود غالبؔ نے یوں کیا ہے......

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے　　(۱۸۳۲ء)

جب غالبؔ اِس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے شعر میں آنے والا لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے چاروں طرف اس کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگتے ہیں اس کا شمار استادوں میں ہونے لگتا ہے اور اتنا ہی نہیں حضرت ذوقؔ دھلوی کے انتقال کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا وہ استاد بن جاتا ہے تو ایسے وقت میں غالبؔ جیسی سیمابی فطرت والا شاعر اگر دبی زبان میں یا کھلے بندوں اپنے آورش پر نکتہ چینی کر گزرے تو اسے اسکی اپنی انا کی تسکین سمجھ لینا چاہئے نہ کہ حرف آخر سمجھ کر اس کے تمام حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضاؔ نے غالبؔ کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے......"غالب اپنے

مکتوب بنام مولوی عبدالرزاق شاکر میں لکھتے ہیں .... ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیامت ہے......

خط پر تاریخ درج نہیں مگر یہ یقیناً مرزا کی زندگی کے آخری چند سالوں میں لکھا گیا ہوگا۔ ابتدائے فکر سخن کے معنی یہی ہیں کہ شعر ۱۸۱۲ء تذکرہ عمدہ منتخبہ کی اولین روایت ترجمہ غالب کے لگ بھگ کہا گیا ہوگا۔ مگر یہ سب شعر ۱۸۲۱ء تک کے ہی ہیں۔ اس عہد کے بعد اردو میں ایک شعر بھی بیدل کی مداحی میں نہیں کہا اور گلِ رعنا (انتخاب کلام از غالب ۱۸۲۸ء سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک غالب طرزِ بیدل کی تقلید قریب قریب ترک کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ بیدل کے اثر سے کلیتاً کبھی آزاد نہیں ہوئے۔ تخیل اور تخّیل کے گل بوٹے اور خیالی مضامین کے ہوائی قلعے، کلام کا انتخاب کرنے کے باوجود کہیں نہ کہیں جھلک دکھاہی جاتے ہیں......"

غالب کا خط، شعر اور رضا صاحب کی تحریر غور طلب ہے۔ غالب کے مزاج کا خیال بھی کرنا ضروری ہے...... رضا صاحب نے یہ بات درست کہی ہے کہ یہ خط مرزا کی زندگی کے آخری چند سالوں میں لکھا گیا تھا۔ لیکن یہ قطعی صحیح نہیں ہے کہ مرزا نے شعر ۱۸۱۲ء میں کہا ہوگا۔ غالب نے خط میں لکھا ہے کہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا۔ اگر مقطع تھا تو غزل بھی ضرور ہونا چاہیے لیکن غزل کہیں نہیں ملتی، مطلع بھی نہیں ملتا ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت ہی یہ ایک شعر غالب کے ذہن میں آیا ہوگا اور انہوں نے اسی وقت خط میں تحریر کر دیا ہوگا۔ بیدل کے ساتھ اسیر اور شوکت کے نام لیکر غالب نے بیدل کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ اسیر اور شوکت کی طرز میں غالب کے اشعار ملنے کی بات آج تک کسی بھی اہلِ نظر نے نہیں کہی ہے۔ ظاہر ہے کہ طرزِ بیدل اُس وقت مرزا غالب پر غالب ہے جبکہ وہ اس سے انحراف کرنے کی بیجا کوشش کر رہے ہیں کیا وجہ ہے کہ خط میں غالب نے یہ نہیں لکھا کہ ...... "طرزِ اسیر میں ریختہ کہنا" یا "طرزِ شوکت میں ریختہ کہنا" ...... وہ اگر چاہتے تو مصرع یوں بھی لکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں لکھا نام زبان پر آیا تو وہی جو اُن کا محبوب شاعر تھا ان کا آدرش تھا۔

۱۸۲۱ء کے بعد بیدل کی مداحی میں کوئی شعر نہیں ملتا لیکن اس سے پہلے تک جتنے اشعار ملتے ہیں کیا اردو کے کسی دوسرے بڑے شاعر کے یہاں یعنی میر، ولی، ذوق، اقبال کے یہاں اپنے پیش رو کی عقیدت میں دو چار اشعار سے بھی زیادہ اشعار ملتے ہیں؟ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ غالب اپنی ہر دوسری تیسری غزل میں بیدل کی مداحی میں شعر کہنے کا فرض انجام دیتے۔ یہ اس بات کی پختہ دلیل نہیں ہے کہ غالب بیدل کی تقلید

کرنا چھوڑ چکے تھے جبکہ ان کی شاعری کی معنی آفرینی اور اسلوب میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اگر کچھ فرق محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ زندگی کے آخری دور میں جب وہ بالکل سادہ یعنی...... "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے"...... جیسی غزلیں کہنے لگے تھے۔ لیکن اس غزل میں بھی انہوں نے بیدؔل کے خیالات ہی کی عکاسی کی ہے...... غالبؔ کی عظمت ان غزلوں کی وجہ سے نہیں ہے جو سادہ اور عام فہم ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جہاں معنی آفرینی اور بیدؔل کی مشکل پسندی سے آزاد ہونے کی کوشش غالبؔ نے کی ہے وہیں ان کی شاعری کا معیار اور زیادہ بلند ہونے کی بجائے کچھ کم ہی ہوا ہے۔ کالی داس گپتا رضاؔ نے یہ اعتراف تو کیا ہے کہ غالبؔ بیدؔل کے اثر سے کلیتاً کبھی آزاد نہیں ہوئے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ اس کا ثبوت غالبؔ کے کئی اشعار پیش کرتے ہیں، جن میں بیدؔل کے مضامین، رنگ و آہنگ، لفظیات اور فکر و فن موجود ہیں...... غالبؔ کے بہترین اشعار میں شامل کئے جانے والے زیادہ تر اشعار وہ ہیں جن کا رشتہ کسی نہ کسی طرح بیدؔل کے کلام سے ضرور جڑا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو......

آہم ز نارسائی شد اشک و با عرق ساخت
پستیت گر خجالت شبنم کند ہوا را
......بیدؔل

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا (۱۸۲۱ء)

غالبؔ نے اپنے اس شعر میں کہا ہے کہ مارے ضعف کے آنسو دمِ سرد بن گئے اسلئے پانی کا ہوا ہو جانا یاد آیا۔ پانی گرمی سے بھاپ بن کر اڑتا ہے سرد ہونے پر تو جمنے لگتا ہے اگر آنسو دمِ سرد بن گئے ہیں تو پانی کا ہوا ہو جانا یاد آنا بے معنی ہے غالبؔ کا مشاہدہ غلط ثابت ہوتا ہے جبکہ بیدؔل نے اپنے شعر میں چابک دستی سے یہ مضمون صحیح باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آہ نارسا ہوئی تو اس نارسائی پر آنسو نکل پڑے یعنی آہ اشک میں مبدل ہو گئی۔ آہ تو بلندی کی طالب ہے اور جب تک رسا ہے ہوا کی طرح بلند ہے لیکن نارسائی کی خجالت نے اس ہوا کو شبنم میں تبدیل کر کے زمین کی طرف پستی میں گرا دیا محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ خجالت نارسائی کی اور نارسائی پستی کی دلیل ہے بیدؔل کا مشاہدہ، مضمون بندی اور معنی آفرینی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مطلبم از مے پرستی تر دماغیہا نبود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را ......بیدؔل

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے (۱۸۲۱ء)

غالبؔ کو مئے سے خوشی حاصل ہو اسلئے نہیں پیتا ہے بلکہ وہ اسلئے پیتا ہے کہ دن رات بیخودی میں مست رہ سکے۔ جبکہ بیدلؔ یہ کہہ رہا ہے کہ میری مئے پرستی تر دماغی کے لئے نہیں ہے میں تو ایک دو ساغر گریۂ مستانہ کو آبدار بنانے کے لئے پی لیتا ہوں۔ گریۂ مستانہ کو آبدار بنانے میں جو معنویت ہے وہ لاجواب ہے اور پھر ایک دو ساغر کہہ کر بیدلؔ نے یہ بھی جتادیا ہے کہ وہ شراب کا عادی نہیں بلکہ شوقیہ پینے والا ہے۔ جبکہ غالبؔ کے شعر میں مسلسل شراب میں ڈوبے رہنے کی بات کہی گئی ہے۔

سحر آہ و گلستاں نکہت و بلبل فغاں دارد

جہاں سوئے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

اس شعر میں بیدلؔ نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ گلستاں میں صبح کی آہ، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نالے سب ایک عالم پریشانی کی طرح ہے اور یہ کارواں بصد حسرتِ بیرنگی کی طرف بڑا چلا جارہا ہے اس شعر کی تہہ میں جھانکئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ صبح کی آہ پریشان ہو کر بکھرتی ہے، نکہت بھی پریشان ہو کر پھیلتی ہے اور بلبل کے نالے بھی جب گونجتے ہیں تو پریشاں ہوتے ہیں بکھرتے ہیں اور بیدلؔ نے اسی لئے ان سب کو ایک عالم پریشانی کا کارواں کہا ہے اس سے بڑھکر معنی آفرینی اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر یہ پریشانی کا کارواں حسرتِ بے ر[illegible] کی طرف رواں ہونے کی بات کہہ کر بیدلؔ نے عظمتِ کمال کو پیش کر دیا ہے۔ یہ بیدلؔ کا خاصہ ہے جسے کوئی اور چھو بھی نہیں سکتا۔ غالبؔ نے اس خیال کو اردو میں یوں باندھا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (۱۸۵۲ء)

اپنی جگہ شعر بہت اچھا بن گیا ہے۔ لیکن اس میں بیدلؔ کی وہ تہہ داری کہاں جو اس نے ایک عالم پریشانی کا کارواں کہہ کر پیدا کی ہے اور پھر حسرتِ بیرنگی کی طرف روانہ ہونا سونے پر سہاگہ ہے۔

خلقے بعدم دود دل و داغ جگر برد

خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد

بیدلؔ کہتا ہے کہ ایک دنیا دل سے اٹھتا ہوا دھواں اور داغِ جگر لیکر زمین کی کوکھ میں دب گئی۔ اب اسی کی مٹی سے گل اور سنبل پیدا ہو رہے ہیں جن سے اٹھنے والا دھواں وہی دل کا دھواں ہے اور یہ گل و سنبل وہی داغِ جگر ہیں...... بے پناہ شعر ہے ایسا بے پناہ کہ جس کی تعریف الفاظ میں کرنا شعر کی توہین کرنا ہے۔

اسے تو محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے یہ مضمون اپنے مطلع میں خوب باندھا ہے اور مقبول بھی بہت ہوا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں (۱۸۵۲ء)

بیدل اپنے ایک شعر میں کہتا ہے......

عالم فریب دیدۂ عاشق نمی شود
آئینۂ خیال تو صورت پرست نیست

کائناتِ عالم کی تمام صورتیں فریب دینے کے لئے ہیں لیکن سچا عاشق ان صورتوں کا دیوانہ کبھی نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا آئینۂ خیال صورت پرست نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ خدا کی کوئی صورت نہیں ہے اور اس کے عشق میں جو بھی مبتلا ہو جاتا ہے اس عالم کی کوئی بھی صورت فریب نہیں دے سکتی۔ تصوف اور عشقِ حقیقی کا بیان اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی شعر سے استفادہ کرتے ہوئے غالب نے کہا ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے (۱۸۲۱ء)

ذرا سی ترمیم نے اس شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ غالب نے تمام حلقۂ دامِ خیال کہہ کر اس دنیا کو ایک ایسا فریب کا مقام بتایا ہے جہاں انسان کی زندگی خواب و خیال سے زیادہ معنی نہیں رکھتی۔ اس فریب کے جال سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ بیدل کہتا ہے......

در سایہ ابرو نگہت مست و خراب است
چوں تیغ زسر در گزر عالم آب است

یعنی تیرے ابرو کے سائے میں تیری نگاہ مست و خراب کا یہ عالم ہے جیسے تلوار کے سرے کے نیچے گزرتی ہوئی آب۔ یعنی تیرے ابرو کی تلوار کو تیری آنکھوں نے آبدار بنا رکھا ہے......غالب نے اسے اپنے انداز سے یوں کہا ہے......

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہئے (۱۸۲۱ء)

ابرو کا ترجمہ بھوں کیوں کیا گیا۔ یہ تو غالب ہی جانتے لیکن یہ لفظ شعر کی ابتدا میں اتنا بھونڈا معلوم دیتا ہے کہ سماعت پر بار گذرتا ہے۔ غالب نے ابرو کو محراب سے تشبیہ دی ہے اور اس کے زیرِ سایہ آنکھ کو

خرابات کہا ہے۔ کچھ لوگوں کا اعتراض اس پر یہ ہو سکتا ہے کہ ہر مسجد کے زیر سایہ خرابات ہو یہ لازم تو نہیں۔ لیکن تلوار کی دھار کی آب جس پر اثر کرے گی اُس کا خراب ہونا لازم ہے۔

ایسی ہی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں......

یاد آزادیست گلزار اسیرانِ قفس
زندگی گر عشرتے دارد امیدِ مردن است
۔بیدل

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
......غالب بعد از ۱۸۲۶ء

سازِ ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائی راکہ وادیدم خموشی می سرود
.......بیدل

نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروغ کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے (۱۸۲۱ء)
۔غالبؔ۔

رنج دنیا، فکرِ عقبیٰ، داغِ حرماں، دردِ دل
یک نفس ہستی بدوتم عالمے را بار کرد
۔بیدل

فکرِ معاش، عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
تھوڑی سی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے؟
......غالبؔ

بیدل من وآں دولت بیدار سرِ فقر
کز نسبت او چینی خاموش سفال است
......بیدل

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے بعد از (۱۸۴۷ء) ۔غالبؔ

زہد و تقویٰ ہم خوشست اما تکلف برطرف
درد دل را مند دام درد سرے در کار نیست
۔بیدلؔ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی......
۔غالبؔ (۱۸۴۷ء)

اگر علم و فنے داری نیاز طاقِ نسیاں کن
کہ رنگ آمیزیت نقاش می سازد خجالت را
......بیدلؔ

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
......غالبؔ (۱۸۵۲ء)

اگر غالبؔ پر بیدلؔ کے اثر والے اشعار کی تاریخی ترتیب پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۱۲ سے لیکر ۱۶، ۲۱، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۳، ۴۷ اور ۱۸۵۲ء تک ہمیں ایسے حوالے مل جاتے ہیں جن میں مضامین، فکر و خیال، زبان و بیان کے اعتبار سے غالبؔ پہ بیدلؔ کا اثر برقرار ہے۔ ۱۸۵۲ء میں غالبؔ کی عمر ۵۵ برس کی ہو جاتی ہے اور یہ دوران کی شاعری کے عروج کا دور ہے۔ اس کے بعد اُن کی شاعری میں وہ عظمت، وہ بلندی کم ہوتی چلی گئی ہے جو غالبؔ کا خاصہ ہے اور جس کی وجہ سے غالبؔ جانے مانے اور گردانے جاتے ہیں ......عمر کے آخری کچھ سالوں میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شاعری کے ساتھ جی بہلا رہے ہوں نہ تو پہلے کا سا جوش و خروش دکھائی دیتا ہے نہ پروازِ خیال اور معنی آفرینی ایسی حالت میں بھی غالبؔ اور بیدلؔ کا ساتھ چھوٹا نہیں پہلے شاعری میں اور اب بیدلؔ غالبؔ کے خطوط میں نظر آنے لگے۔ ملاحظہ ہوں غالبؔ کے وہ خطوط جن میں بیدلؔ بطور حوالہ موجود ہے...... یہ خطوط کالی داس گپتا رضاؔ نے بھی مقالہ "بیدلؔ اور غالبؔ" (اسد اللہ خاں غالبؔ مرد ۱۹۹۱ء) میں پیش کئے ہیں۔

۲۹ جون ۱۸۵۶ء کو اپنے خط بنام انوار الدولہ میں لکھتے ہیں ...... "اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں وہ زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے ...... فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدلؔ۔

جہد ہا، در خور توانائیست

ضعف یکسر فراغ می خواہد۔"

۱۹۔ نومبر ۱۸۶۰ء سرور کو لکھتے ہیں ...... عبدالقادر بیدلؔ کا یہ مصرع گویا میری زبان ہے ...... "عالم ہمہ افسانہ مادارد وما ہیچ"

غالبؔ نے بیدلؔ کے اس مصرع پر گرہ بھی لگائی ہے ملاحظہ ہو۔

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ

"عالم ہمہ افسانہ مادارد و ما ہیچ

۱۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہؔ کو لکھتے ہیں :۔

"میاں نہ مرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کو جگہ ہے، ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کہا جائے ...... میرزا عبدالقادر بیدلؔ خوب کہتا ہے۔

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام

زیں ہوس ہا بگذر یا بگزر، می گزرد

۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :۔

"خدا جانے پنشن جاری ہو گا یا نہ ہو گا۔ احتمال تعیش و تنعم بشرط تجرید صورت اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔ بیدلؔ شعر مجھ کو مزا دیتا ہے

...... نہ شام مارا سحر نویدی، نہ صبح مارا دم سپیدی

چو حاصل ماست ناامیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں میں انور الدولہ شفقؔ کو لکھتے ہیں :

"ارنی کی "ر" کی حرکت و سکون کے باب میں قول فیصل یہی ہے جو حضرت نے لکھا ہے۔ مرزا عبدلقادر بیدلؔ۔

چورسی اطلو رہمت ارنی سگوود مگریز

کہ نیر زد این تمنا بہ جواب لن ترانی"

مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی کو (مہر اسد اللہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء) لکھا ہے......

"یہ جو قبلۂ اہلِ سخن فردسی طوسی علیہالرحمتہ کے ہاں آیا ہے۔ ← میراں کسے راو ہرگز میر۔
مجاز ہے، امر بھی اور تعدیہ بھی، متاخریں میں سے بھی عبدالقادر بیدل کہتا ہے......

"میر اے سرکش تایک دم بیاسائی"

ان تمام خطوط کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں ۱۸۵۵ء، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰ اور ۱۸۶۱ء تک غالب برابر بیدل کے مداح بنے رہے۔ ۱۸۶۲ء میں غالب کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔ اور غالب کی شہرت تمام ہندوستان میں آسمان کو چھو رہی تھی۔ بھلے ہی تخلیقی اعتبار سے غالب سرد پڑ چکے تھے اور اس کا احساس بھی انہیں ہو چلا تھا لیکن ماحول کو گرمائے رکھنے اور اپنے شاگردوں کو خوش رکھنے کے لئے کچھ فرمان تو وہ جاری کر ہی سکتے تھے۔ یہ بات غالب کی فطرت میں شامل تھی ان کی زندگی پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو کئی مقام ایسے مل جائیں گے جہاں دوسروں کا مذاق اڑا کر غالب نے اپنے قد کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ افسوس کہ غالب کی اس فطرت کا شکار بیدل کو بھی ہونا پڑا۔ ملاحظہ ہو بیدل کے تعلق سے غالب کے چند کلمات......

ایک خط میں سرور کو لکھتے ہیں :۔

ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے سوا کوئی مسلّم الثبوت استاد نہیں ہوا ...... آرزو، فقیر اور شید ا اور بہار غیر ہم، انہیں میں ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا! ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟"

اپنے شاگرد رشید منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو، پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں نبرد کا فاعل معدوم۔ حلقۂ زا کی زے پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے نسخہ میں لکھا کہ نہ حلقۂ را درست، نہ حلقۂ زا درست، مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے خیر رہنے دو۔

ایک اور خط میں سرور کو لکھتے ہیں :۔

"...... ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لیکر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں......"

وہ وقت بھی تھا جب غالب نے کہا تھا......

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

صاف ظاہر ہے کہ جب تک بیدلؔ کا قلم عصائے خضر کی طرح صحرائے سخن میں غالبؔ کی رہنمائی کرتا رہا غالبؔ سیدھی راہ پر چلتے رہے۔ لیکن عمر کے آخری سالوں میں یہ عصا مارے ضعف ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گمراہ ہو گئے اب نہ اُن کی شاعری میں عروج تھا نہ باتوں میں صداقت۔ اگر انہیں امیر خسروؔ سب سے بڑے استاد نظر آتے تھے تو ان کے رنگ میں ہندی اور فارسی کے میل سے شعر کیوں نہیں کہے؟ بیدلؔ ہی کے لئے تمام عمر دل فرشِ رہِ ناز کیوں بنا رہا؟ جس بیدلانا فارسی کی بات وہ کرتے ہیں اپنے فارسی دیوان کے آخری شعر تک اسی فارسی کے رنگ و آہنگ سے کیوں متاثر رہے؟ ظاہر ہے کہ غالبؔ نے جملے تو اُچھال دیئے لیکن ان کا تسلی بخش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے کیا اچھا جملہ لکھا ہے..... ''آج جب ہم یہ کہہ کر ناز کرتے ہیں کہ غالبؔ نے اردو ادب کو فکری شاعری سے روشناس کرایا تو لامحالہ اس کا کچھ نہ کچھ کریڈٹ ہمیں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کو بھی دینا پڑتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ مضمون مکمل کیا جائے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ غالبؔ کو سمجھنے کے لئے بیدلؔ کی عظمت کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ جو لوگ بیدلؔ کو رد کر کے غالبؔ کی عظمت کو جاننا چاہتے ہیں وہ مرزا نوشہ کے ساتھ قطعی انصاف نہیں کرتے ہیں۔ والمیکی نے رامائن سنسکرت میں لکھی ہے اور تلسی داس نے ہندی میں۔ اب اگر والمیکی کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا ہے تو اس سے تلسی داس کی عظمت کم نہیں ہوتی بلکہ والمیکی کو جان لینے کے بعد تلسی داس کی قدر و قیمت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیدلؔ کو جان لینے کے بعد غالبؔ کی قدر و قیمت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ بیدلؔ اگر فارسی کا والمیکی ہے تو غالبؔ اردو کا تلسی داس ہے اور جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے..... آخر میں ایک شعر اور موضوع کی مناسبت سے ملاحظہ ہو۔

اے اشکؔ شعر کہنے میں ہر لحہ مست تھا
غالبؔ تمام عمر ہی بیدلؔ پرست تھا

ابراہیم اشکؔ۔ سکونت: ممبرا (بھارت)

سنسکرت کی نثری شاعری

عنبر بہرائچی

مضمون

اردو کے مشہور افسانہ نگار، تخلیقی شاعر اور تنقید نگار احمد ہمیش کو اس بات پر اصرار ہے کہ نثری نظم کی جڑیں سنسکرت کے ڈراموں اور مقدس ویدوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ان کے اس موقف پر بھارت خصوصاً پاکستان میں مثبت اور منفی دونوں طرح کا ردعمل ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت میں نثری شاعری (गद्यकाव्य) باقاعدہ ایک صنف سخن کی شکل میں مقبول ہوئی۔ اس کی نشوونما چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہر ترقی یافتہ زبان میں سب سے پہلے شاعری کے نمونے ہی ظاہر ہوتے ہیں بعد میں نثر کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے احمد ہمیش کے موقف کی بنیاد ٹھوس دلائل پر قائم ہے۔ رگ وید (ऋग्वेद) کے مقدس زمزموں میں شعری محاسن وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ میرے خیال میں دنیا کے سبھی قدیم صحیفوں میں شعری محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بہر کیف چونکہ برصغیر یعنی ہندوپاک اور بنگلہ دیش کی مشترکہ قدیم وراثت کی بات چل رہی ہے اس لئے یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ قدیم سنسکرت ادب میں جہاں تک نثر کا تعلق ہے دو دھارے ظاہر ہوئے اول وہ جس کا تعلق فلسفہ اور مذہبیات سے تھا۔ اس میں یجور وید (यजुर्वेद) برہمن تصانیف (ब्राह्मण-ग्रंथ) اپنشد (उपनिषद) وغیرہ تو آتے ہی ہیں ان کے ساتھ رشی پتنجلی (पतंजलि) کا مہابھاشیہ (महाभाष्य) رشی شبر (शबर) کا میمانسا بھاشیہ (मीमांसा भाष्य) اور شنکر اچاریہ کا شاریرک بھاشیہ (शारीरिक-भाष्य) بھی اس میں شامل ہیں۔ چونکہ ان تصانیف کے موضوعات ادق تھے اس لئے ان کا اسلوب بھی بہت بوجھل ہے اس دھارے کے علاوہ دوسرا دھارا وہ تھا جس کا تعلق فکشن سے تھا۔ اس کے بھی دو روپ سامنے آئے۔ اول تفریحی کہانیاں دوئم اخلاقی کہانیاں۔ تفریحی کہانیوں میں برہت کتھا (वृहत्कथा) برہت کتھا شلوک سنگرہ (वृहत्कथाश्लोकसंग्रह) برہت کتھا منجری (वृहत्कथामंजरी)، کتھا سرت ساگر

(कथासरितसागर) ویتال پنچ ونشیکا (वेतालपंचविंशतिका)، جسے عرف عام میں بیتال پچیسی کہا جاتا ہے، دویتر نشت سنگھاسن پُتلکا (द्वित्रिंशतसिंहासनपुत्तलिका)، جسے عرف عام میں سنگھاسن بتیسی کہتے ہیں، واسودتا (वासवदत्ता)، کادمبری (कादम्बरी) وغیرہ تصانیف آتی ہیں، جب کہ سبق آموز یا اخلاقی کہانیوں میں رگوید (ऋग्वेद) میں موجود قصے، برہمن تصانیف میں موجود کہانیاں، اپنشدوں میں موجود قصے، پنچ تنتر، ہتوپدیش (हितोपदेश) جاتکوں کے قصے، تنترا کھیایکا (तंत्राख्यायिका)، مہابھارت کی کہانیاں اور تنترا کھیان (तंत्राख्यान) وغیرہ آتے ہیں۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی اعتبار سے سنسکرت کا قدیم نثری ادب دو حصوں میں تقسیم کیا سکتا ہے۔ اول مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دوسرا وہ جس میں عوامی تخیل نے جانداروں کے قصوں (Animal Tales) کی تخلیق کی ان میں پریوں کی کہانیاں (Fairy Tales)، قدیم روایتی قصے (Legends)، مثالی قصے (Parables)، مقبول عام قصے (Popular Tales) اور اخلاقی کہانیاں (Fables) آتی ہیں، جو بعد میں گناڈھیہ (गुणाढ्य) کی پیشاچی (पिशाची) زبان میں لکھی گئی برہت کتھا (वृहतकथा) میں نمودار ہوئیں۔ بدقسمتی سے گناڈھیہ کی برہت کتھا آج دستیاب نہیں ہے لیکن اتنا طے ہے کہ قدیم نثر کا سب سے قدیم روپ اس میں ضرور رہا ہوگا۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ سنسکرت شعریات کی رو سے سنسکرت کے افسانوی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ آچاریہ بھامہ (भामह) نے انہیں آکھیایکا (आख्यायिका) اور کتھا (कथा) کہا ہے بعد میں آچاریہ دنڈی (दंडी) آچاریہ وامن (वामन) اور آچاریہ وشوناتھ (विश्वनाथ) وغیرہ نے ان دونوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ آکھیایکا (आख्यायिका) کسی تاریخی واقعے کے افسانوی بیان پر منحصر ہے جبکہ کتھا (कथा) تخیل سے پیدا ہوا افسانہ ہوتا ہے۔ لفظ 'آکھیایکا' کا ماخذ لفظ 'کھیا' ہے جس کا مفہوم ہے 'عرض کرنا' اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اس

کی بنیاد زبانی روایت(Oral Tradition) ہے، جیسا کہ ہمارے یہاں داستانوں کے ضمن میں یہی صورت حال رہی ہے۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے جو نثر معرض وجود میں آئی اس کی بھی دو شکلیں ہیں اول سادہ اسلوب والی نثر دوسری صنائع بدائع آمیز نثر۔ پہلی میں پنچ تنتر(पंचतंत्र)اور اس کے بعد سنگھاسن دواترنش پتلکا(सिंहासनद्वत्रिंशत्पुत्तलिका)، بیتال پنچ ونشتکا(बेतापंचविंशतिका)، بھوج پربندھ(भोजप्रवन्ध)اور پرش پریکشا(पुरुष परीक्षा) وغیرہ آتے ہیں۔ دوسری شکل خالص تخلیقی اور صنائع بدائع آمیز ہے جس میں سبندھ(सुबन्धु) کی واسودتا(वासवदत्ता)دنڈی(दंडी) کی دشکمار چرت(दशकुमार चरित)اور وانٹ بھٹ(वाणभट्ट) کی کادمبری (कादम्बरी)اور ان کے بعد کی تصانیف آتی ہیں۔ یہی ہمارے موضوع کا مرکز ہیں۔ یہ صنائع بدائع آمیز تخلیقات، سنسکرت کے دو عظیم شعراء اشوگھوش(अश्वघोष) اور کالداس(۱)(कालिदास) کے اسالیب کے زیر اثر خلق ہوئیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نثری شاعری میں ایجاز کا استعمال سبندھ، دنڈی اور وان بھٹ نے ہی شروع کیا۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سنسکرت کی جس نثری شاعری کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ وہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے مہذب معاشرے کے قارئین اور سامعین کے لئے ہی خلق کی گئی تھی۔ ان تخلیقات میں مواد پر اسلوب کو فوقیت دی گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ حالانکہ نثری شاعری میں کسی قصے کو ہی بیان کیا گیا ہے لیکن اس بیان میں ایجاز، ایہام گوئی، ذو معنیین، تجنیس اور تشبیہ وغیرہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ صنعتوں کے باقاعدہ استعمال کے لئے کوئی عشقیہ داستان ہی منتخب کی جاتی تھی تاکہ زیب و زینت والے اسلوب کو کامیاب بنانے میں آسانی ہو۔ اس اظہار کی اولین مثال سبندھ(सुबन्धु) کی واسودتا (वासवदत्ता) ہے۔

حالانکہ واسودتا کی تخلیق کا زمانہ ابھی تک متعین نہیں کیا جاسکا ہے، لیکن علماء نے اندازہ یہی لگایا ہے کہ سبندھ، چھٹی صدی عیسوی کے درمیان موجود تھے اور یہ کہ

(۱) صحیح تلفظ یہی ہے کالیداس غلط ہے۔

سبندھ، ڈنڈی اور وان بھٹ ۵۵۰ء سے ۶۵۰ء کے درمیان اپنے اپنے کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔ ان تینوں میں سبندھ پہلے پیدا ہوئے ان کے بعد ڈنڈی اور ڈنڈی کے بعد وان بھٹ ہوئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ سنسکرت کے زیادہ تر فنکاروں نے انکسار اور بے نیازی کے سبب اپنے بارے میں اپنی تخلیقات میں کچھ نہیں لکھا، جس سے ان کی زندگی، ان کے خاندان اور ان کے وطن کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، ان کے ہم عصروں نے یا ان کے تخلیق کاروں نے حوالوں کی شکل میں جو بھی مواد ضمناً تحریر کیا ہے اس کی روشنی میں صرف اندازہ سے ہی کچھ نتیجہ اخذ کرنے میں ہمیں مدد ملتی ہے اور اسی کی بنیاد پر سبندھ کو کشمیری مانا جاتا ہے۔ ان کی ایک ہی تصنیف واسودتا دستیاب ہے۔

واسودتا، (वासवदत्ता) کا سنسکرت کی مشہور تصنیف ادین کتھا (उदयन कथा) سے کوئی تعلق نہیں ہے کیوں کہ دونوں میں صرف نام کی مماثلت ہے۔ سبندھ کی وسودتا کا قصہ دوسری جگہ نہیں ملتا۔ کتھاسرت ساگر (कथासरित सागर) اور برہت کتھا منجری (वृहतकथामंजरी) میں یہ قصہ دستیاب نہیں ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ سبندھ نے لوک کہانیوں اور عوامی بنیادی تصور (Motif) کی روشنی میں اپنے زرخیز تخیل کی مدد سے اس عشقیہ قصے کو خلق کیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قصے کی بنت میں وہ کساؤ نہیں ہے، جس کا یہ متقاضی تھا۔ اس میں وہ تاثر بھی نہیں ہے جس کی اس میں ضرورت تھی۔ یہ قصہ اس طرح ہے کہ راجہ چنتامنی (चिन्तामणि) کے بیٹے کندرپ کیتو (कन्दर्पकेतु) نے خواب میں ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ کو دیکھا۔ اس کے حسن سے شہزادہ اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اسے تلاش کرنے کے لئے اپنے دوست مکرند (मकरंद) کے ساتھ نکل پڑتا ہے اور وندھیا چل (विंध्याचल) کے پاس ایک گھنے پیڑ کے نیچے آرام کرنے کے لئے ٹھہر جاتا ہے۔ رات میں اسی درخت پر طوطے کا جوڑا باہم گفتگو کرتا ہے جسے کندرپ کیتو سنتا ہے۔ نر طوطا چونکہ دیر سے آیا ہے اس لئے مادہ طوطا کے استفسار پر وہ بتاتا ہے کہ پاٹلی پتر (पाटली पुत्र) کی شہزادی واسودتا بہت خوبصورت ہے اور یہ کہ اس نے خواب میں

کندرپ کیتو کو دیکھا ہے اور وہ شہزادے کی تلاش میں اپنی مادہ طوطے تمالکا (तमालिका) کے ساتھ نکل پڑی ہے۔ درخت کے نیچے موجود دونوں دوست یعنی کندرپ کیتو اور مکرند یہ سن کر بہت خوش ہوتے ہیں اور بعد میں طوطوں کے تعاون سے عاشق و معشوقہ دونوں مل جاتے ہیں واسودتا کا باپ شرنگار شیکھر (श्रृगार शेखर)، واسودتا کی شادی ودیادھر (विद्याधर) نام کے ایک شخص سے کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات جب کندرپ کیتو کو معلوم ہوئی تو وہ واسودتا کے ساتھ جادو کے ایک گھوڑے پر بیٹھ کر وندھیاٹوی (विध्याटवी) بھاگ جاتا ہے، صبح کے وقت جب کہ کندرپ کیتو سویا ہوا تھا، واسودتا سیر کو نکل جاتی ہے، جسے جنگل میں شکاریوں کے دو گروہوں نے دیکھ لیا اور وہ شہزادی کا پیچھا کرتے ہیں، دونوں جماعتوں میں شہزادی کو لیکر خوفناک جنگ ہوتی ہے واسودتا اس موقع کا فائدہ اٹھاتی ہے اور چپکے سے ایک رشی کے آشرم میں داخل ہو جاتی ہے، وہیں ایک رشی کی بددعا سے واسودتا چٹان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر کندرپ کیتو، خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، تبھی ہاتف غیب اسے ایسا کرنے کے لئے منع کرتا ہے۔ آخرکار وہ جنگل میں گھومتے ہوئے واسودتا کو تلاش کر لیتا ہے اور اس کے لمس سے وسودتا دوبارہ اپنی اصل شکل اختیار کر لیتی ہے اور یوں وہ رشی کی بددعا کے اثر سے نجات پا جاتی ہے۔ بعد میں مکرند بھی مل جاتا ہے اور کندرپ کیتو نیز واسودتا کی خدمت میں ہنسی خوشی دن گذارتا ہے۔

واسودتا کے قصے میں لوک کہانیوں کے روایتی عناصر کو قبول کیا گیا ہے، مثلاً ہیرو اور ہیروئن کا ایک دوسرے کو خواب میں دیکھنا اور اس خواب کے سبب دونوں کا ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو جانا، ہیرو اور ہیروئن کے وصل میں پرندوں کا معاون ہونا، جادو کے تیز رفتار گھوڑے کے ذریعہ ہیرو اور ہیروئن کا چپکے سے فرار، بددعا کے اثر سے ہیروئن کا چٹان میں تبدیل ہو جانا، ہاتف غیب کا ہیرو کو خودکشی سے روکنا وغیرہ عناصر پہلے سے ہی رائج عوامی بنیادی تصور کا تتبع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ روایتیں ہندوستان کے مشہور رزمیہ، مہابھارت میں بہت پہلے سے ہی لوک کہانیوں

کی تتبع میں قبول کی گئی تھیں کیوں کہ ان لوک کہانیوں میں عام انسانی زندگی کی حقیقی عکاسی موجود رہی ہے، ان لوک کہانیوں میں پریوں، اڑن کھٹولوں اور مابعد الطبعیاتی عناصر کی موجودگی ان لوک کہانیوں کو بہت دلچسپ بنائے رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ سنسکرت کے بعد اپھر نشوں، پراکرتوں اور بعد میں ہر علاقائی زبان میں ان عناصر کو قبول کیا گیا ہے اور دنیا کی ہر زبان میں تقریباً ان سارے عناصر کو اپنایا گیا ہے۔ اردو کی داستانوں اور قصوں میں بھی انہیں قبول عام حاصل ہوا۔ سبندھ نے اپنی واسودتا میں انہیں عناصر کو قبول کرتے ہوئے رومانی قصے کو بیان کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ سطور بالا میں ہم عرض کر چکے ہیں سبندھ کا اولین مقصد واقعات کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ان واقعات کے اجزاء کو فنکاری آمیز بیان سے پر کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وہ چندر کیتو اور واسودتا کے سراپا کا بیان پوری تخلیقی مہارت سے کرتے ہیں۔ ان دونوں کے محسوسات، خیالات اور جذبات کی عکاسی وہ پوری فنکاری سے کرتے ہیں وہ قصے میں آنے والے ندی، سمندر، پہاڑ، جنگل، صبح وشام، طلوع ماہ اور جنگ وغیرہ کا بیان پوری فنی چابک دستی سے کرتے ہیں جس سے قصے کی بنت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اسی لئے علماء کا خیال ہے کہ وہ الفاظ کی بازیگری میں ہی اپنی توانائیاں صرف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ فطرت کی عکاسی میں وان بھٹ کی ہمسری نہیں کرپاتے اور انسانی زندگی کی حقیقی مرقع سازی جو کہ دنڈی کا طرۂ امتیاز ہے، کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ امر قابل ستائش ہے کہ سنسکرت کی نثری شاعری کے حوالے سے وہ اولین فنکار ہیں اس لئے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، وہ ایجاز بیانی اور تجنیس کے بہت گرویدہ ہیں ایک مثال ملاحظہ ہو۔ واسودتا اپنے عاشق چندر کیتو کے ہجر میں تڑپ رہی ہے اور اپنی سہیلیوں سے روتی ہوئی یوں مخاطب ہے:-

> "اے سہیلی کا لیمتی! میرے آنسوؤں کو دھیرے دھیرے پونچھ دے! جوہی کے پھولوں سے سجی ہوئے اے سہیلی یوتھکا! کنول کے پتوں کے پنکھے جھل کر مجھے ٹھنڈی ہوا پہنچا دے! اے نیند کی دیوی!

میرے اوپر رحم کر جسم کے دوسرے حصے بیکار ہیں۔ خالق کائنات نے
میرے جسم کے تمام حصوں کو آنکھ ہی کیوں نہیں بنادیا؟ اے پھولوں
کی کمان والے بھگوان کامدیو! تمہارے قدموں میں اپنا قلب پیش کرتی
ہوں۔ عشق کو ہی سب کچھ ماننے والی مجھ پر اپنے کرم کی بارش کرو۔"

ایسا کہتی ہوئی واسودتا بے ہوش ہو گئی۔ یہ مثال اصل متن میں تجنیس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ حالانکہ سبندھ عام طور سے چھوٹے چھوٹے جملے ہی استعمال کرتے ہیں مگر جب طبیعت زوروں پر آتی ہے تو وان بھٹ کی طرح ایجاز آمیز طویل جملے بھی لکھ جاتے ہیں مثال کے طور پر ہیرو چندر کیتو جب ہیروئن واسودتا کو خواب میں دیکھتا ہے تو اس کیفیت کے بیان میں سبندھ بیس صفحات خرچ کر ڈالتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بیس صفحات کا یہ بیان ایک ہی جملہ میں ادا ہوا ہے۔ ایسے بیانوں میں سبندھ زیادہ تر تشبیہ، ایہام گوئی، ذو معنیین اور تجنیس کا سہارا لیتے ہیں۔ زیادہ تر حصے صنائع بدائع آمیز ہیں، لیکن کبھی کبھی فصاحت کے تحت فطری بیان کی کامیاب مثالیں پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ ہاتھی اور شیر کی جنگ کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

"دیکھئے وہ خوفناک قدو قامت والا شیر، ہاتھی پر حملہ کر رہا ہے اس
کے جسم کا اگلا حصہ اٹھا ہوا اور پچھلا حصہ جھکا ہوا ہے۔ اس کی دم
ساکت اور ایستادہ ہے، اس کی دم کا اگلا حصہ قدرے خم ہے جو کہ اس کی
پشت کو چھو رہا ہے۔ اس کا بڑا سا منہ دانتوں کے کناروں سے خوفناک
لگ رہا ہے۔ اس نے اپنی ایال اٹھا رکھی ہے اپنے کان کھڑے کر رکھے
ہیں۔"

مگر اس طرح کے بیانات بہت کم ہیں۔ واسودتا کا بیشتر حصہ صنائع بدائع آمیز ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے عام قاری کیا پڑھے لکھے قاری کو بھی شرحوں کی مدد اس لئے لینی پڑتی ہے کیوں کہ سبندھ نے ذو معنیین، ایہام گوئی اور ایجاز کے استعمال میں جو استادی دکھائی ہے وہ بہت ادق ہے۔ یہی وراثت وان بھٹ کو ملی مگر وان بھٹ کے یہاں ذو معنیین کا نظام

بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ باقی دوسری خصوصیات کو وان بھٹ نے سبندھ سے مستعار لینے میں کوئی تکلف نہیں برتا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں سبندھ کی واسودتا میں تصنع آمیز بیان کی زیادتی ہے وہیں وان بھٹ کے یہاں شعریت آمیز کیفیت موجود ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ سبندھ نے نثری شاعری کا ایک کھردرا ماڈل پیش کیا تھا جو وان بھٹ کے ہاتھوں میں پہنچ کر خوبصورت اور دلآویز ہو گیا۔ میں سبندھ کے ایجاز، تجنیس، ایہام گوئی اور ذومعنین سے آمیز اظہار کی مثالیں پیش کرنے میں تکلف اس لئے برت رہا ہوں کہ یہ مثالیں سنسکرت زبان کی مخصوص ساخت اور تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان میں مستعمل الفاظ اور تراکیب کا جب تک باقاعدہ ادراک نہ ہو، انہیں سمجھ پانا مشکل ہے اور انہیں واضح کرنے کے لئے کئی صفحات چاہئیں۔

سبندھ کے بعد سنسکرت کی نثری شاعری میں ونڈی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک ماہر شعریات بھی تھے ان کا اسلوب، سبندھ اور وان بھٹ کے اسلوب سے مختلف تھا، اور زندگی کی برہنہ سچائیوں کے عین مطابق تھا۔ علماء کا خیال ہے کہ جس طرح سنسکرت کے ڈراموں میں مرچھ کٹک (मृच्छकटिक) اپنے موضوع کے مطابق ہی سادہ اور فصیح اسلوب لئے ہوئے ہے بالکل ویسا ہی اسلوب ونڈی کے دشکمار چرت، (दशकुमारचरित) میں موجود ہے، علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ ونڈی پر گناڈھیہ (गुणाढ्य) کی برہت کتھا (बृहत्कथा) کا بھی اثر تھا۔ برہت کتھا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ نثری تخلیق نہ ہو کر منظومے کی شکل میں تھی۔ آچاریہ شیمندر نے اپنی برہت کتھا منجری (बृहत्कथामंजरी) میں اور سوم دیو نے اپنی کتھا سرت ساگر (कथासरित्सागर) میں جس کشمیری برہت کتھا کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یقیناً گناڈھیہ کی برہت کتھا (اصل عنوان بڈھ کہا बड्ढकहा) سے مختلف ہوگی۔ اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ لوک کہانیوں کا ایک مجموعہ کشمیر میں بھی معرض وجود میں آیا ہوگا۔ بہر حال عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ برہت کتھا کے طرز پر ہی ونڈی نے دش کمار چرت میں کہانیوں کو بیان کیا ہے۔ کیوں کہ

برہت کتھا میں نرواہن دت (नरवाहनदत्त) اور اس کے ساتھیوں کی کہانیاں ہیں بالکل اسی طرح دش کمار چرت میں راج واہن (राजवाहन) اور اس کے سات ساتھی بھی نرواہن اور اس کے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں اور مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے الگ الگ تجربات سے دوچار ہوتے ہیں اور آخر کار سبھی دوبارہ مل جاتے ہیں اور اپنے اپنے تجربات ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ ان قصوں میں عملی زندگی کے مختلف پہلو آشکار ہوتے ہیں ان کے بیان میں واقعیت ہے یہ قصے حقیقی زندگی کے نمائندہ ہیں اسی بنیاد پر علماء نے دش کمار چرت، کو پنچ تنتر کی طرح اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ بتایا ہے، لیکن در حقیقت ایسا ہے نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس تخلیق میں اخلاقیات، سیاسیات اور جنسیات سے متعلق بیانات ملتے ہیں لیکن اس تخلیق کا مجموعی تاثر قلبی انبساط کو ہی فروغ دیتا ہے۔ اس تخلیق میں شائستہ، غیر شائستہ، اچھے، برے، مہذب، غیر مہذب، عالم و جاہل، جنسی خواہش سے مغلوب درویش ماریچ (मारीचि) اور انہیں دھوکا دینے والی طوائف کام منجری (काम मंजरी)، شوہر کو کنویں میں ڈھکیل کر خراب جسمانی ساخت والے آدمی پر عاشق ہو جانے والی عورت دھومنی (धूमिनी)، شوہر پرست نتمب وتی (नितम्बवती) کا دھوکے سے جسمانی استحصال کرنے والے کلہ کنٹک (कलहकंटक) چور اور جواری وغیرہ سبھی کرداروں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس طرح واضح ہوا کہ دنڈی نے عوام الناس میں مقبول قصوں کو اپنی شاعرانہ صلاحیت سے شعریت عطا کی ہے اور اس کے ذریعہ انہوں نے دنیاوی دانش (Worldly Wisdom) کے کئی باب وا کیے ہیں۔

سبندھ اور وان بھٹ موضوع پر زیادہ توجہ نہیں دیتے انہیں ہر قدم پر اسلوب کی فکر لاحق رہی ہے جب کہ دنڈی واقعیت پر اتنا زور دیتے ہیں کہ دش کمار چرت میں بعض مقامات پر ان کی جزئیات نگاری کو دیکھ کر بعض علماء ان پر فحش نگاری کا الزام بھی لگاتے ہیں جب کہ دنڈی کا یہ طرز نگارش ہمارے منٹو اور عصمت جیسا ہے جو کہ معاشرے کی برائیوں کو بڑی بے دردی سے بے نقاب کرتا ہوا نظر آتا ہے اور قاری کی نگاہ اس برائی پر جا کر ٹھہر جاتی ہے دنڈی اپنے عہد کا کچا چٹھا کھولنے میں اتنا مگن رہتے

ہیں کہ وہ مارواڑی عناصر اور سماج کے اونچے طبقے کا تذکرہ ضمناً ہی کرتے ہیں۔ وہ 'دش کمار چرت' میں موضوع اور اسلوب میں ایک توازن قائم کئے ہوئے ہیں اسی لئے یہ خصوصیت سنسکرت کی نثری شاعری کی کسی تصنیف میں نہیں پائی جاتی ہے۔ دنڈی کا اسلوب اپنے موضوع کے مطابق ہی اپنی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ وہ فصاحت کا دریا بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اوہ ایجاز (समास) کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور لفظی نیز معنوی صنائع سے پرہیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اظہار کی سادگی نیز معنی کی صفائی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسرے باب میں شہزادی کے حسن کا بیان یوں کرتے ہیں:-

"اس کی ہتھیلی سرخ ہے، جس میں جو، کنول مچھلی اور کلس وغیرہ کی مختلف سعد لکیریں ہیں۔ اس کے دونوں پیر پر گوشت ہیں ان کی رگیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ٹخنوں کے جوڑ ایک جیسے بھرے ہوئے ہیں اس کی پنڈلیاں ایک جیسی سڈول ہیں۔ اس کے سرین کا حصہ رتھ کے پہیئے کی طرح وسیع ہے، اس کی ناف چھوٹی، خمیدہ اور گہری ہے اس کے شکم پر تین بل پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے پستان پورے سینے پر پھیلے ہوئے، ایستادہ اور وسیع ہیں۔ اس کی دونوں بانہیں نازک ہیں۔ انگلیاں سرخ ہیں، شانے جھکے ہوئے ہیں ناخن نازک اور چکنے ہیں اور جوڑ بھرے ہوئے ہیں .... اس کا کنول چہرہ نیلم کی طرح خوبصورت گھنیری سیاہ زلفوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس نے اپنے لمبے لمبے کانوں میں کنول کی نال کو دہرا کے گوشوارہ کی شکل دے رکھی ہے، جس کے سبب اس کے دونوں کان خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ (دشکمار چرت چھٹا باب)

تیسرے باب میں وہ سورج کے طلوع ہونے کا بیان یوں کرتے ہیں:-

"...... جس وقت میں ایسا سوچ رہا تھا تبھی رات ختم ہو گئی، جیسے کہ سمندر سے تیزی سے نکلتے ہوئے سورج کی شکل میں ایک گھوڑے کی

تیز سانس چھوڑنے سے وہ (رات) ایک طرف اڑا دی گئی ہو اور سورج دکھائی پڑا جو بہت کم گرم اس لئے دکھائی پڑ رہا تھا کیوں کہ سمندر کے پانی میں رہنے کے سبب اس کی گرمی نرم اور ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔"

چھٹے باب میں سوکھا پڑنے کا بیان ونڈی یوں کرتے ہیں:-

"............ ان کی زندگی میں ایک بار بارہ برس تک بارش نہیں ہوئی۔ ساری فصلیں بیکار گئیں، جڑی بوٹیاں بانجھ ہو گئیں، پیڑوں نے پھل دینا بند کر دیا، بادل پانے سے خالی ہو گئے، ندیوں میں پانی کم رہ گیا، تالابوں میں صرف کیچڑ رہ گیا، آبشار سوکھ گئے...... چوروں کے گروہ در گروہ بڑھ چلے۔ لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگے۔ مردوں کی سفید کھوپڑیاں بگلوں کی طرح ادھر ادھر لوٹنے لگیں۔ کوے پانی کی تلاش میں جابہ جا گھومنے لگے اور شہر، گاؤں نیز چھوٹی بستیاں سبھی خالی ہو گئیں"۔

اوپر کی مثالوں سے واضح ہو گیا کہ ونڈی موضوع کے انتخاب، اسلوب اور اظہار میں ایک متوازن رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

ونڈی کے بعد وان بھٹ نے سبندھُ کے اسلوب کو اور زیادہ خوبصورتی عطا کی۔ وان بھٹ کے اسلوب میں وہ خصوصیات ہیں جو انہیں کالداس (कालिदास) ماگھ (माघ) اور بھو بھوتِ کا ہم پلہ بناتی ہیں۔ سنسکرت کے بیشتر شعراء اور نثر نگاروں کی بہ نسبت وان بھٹ کی زندگی کے واقعات کے بارے میں مواد موجود ہے۔ دراصل وان بھٹ نے خود اپنی تصنیف ہرش چرت (हर्षचरित) اور کادمبری (कादम्बरी) کے آغاز میں اپنا تعارف پیش کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ساتویں صدی کے اوائل میں موجود تھے اور راجہ ہرش وردھن کے دربار سے منسلک تھے۔ ان کے ساتھ ہی اس زمانے کے مشہور سنسکرت شاعر میور (मयूर) اور دواکر مان تنگ (दिवाकर मानतुंग) بھی ہرش وردھن کے دربار کی زیب و زینت میں اضافہ کر رہے تھے۔ وان بھٹ کی دو

تصانیف زیادہ مشہور ہیں اول ہرش چرت (हर्षचरित) دوئم کادمبری۔ ہرش چرت کا شمار آکھیایکا میں ہوتا ہے اور کادمبری کا شمار 'کتھا' میں ہوتا ہے۔ ہرش چرت' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' راجہ ہرش وردھن کی زندگی سے متعلق ایک تاریخی تصنیف ہے، لیکن یہ پوری نہیں کی گئی جبکہ کادمبری میں تخیل کا سہارا لیتے ہوئے یہ تخلیق پیش کی گئی۔ یہ تصنیف بھی ادھوری رہ گئی کیونکہ وان بھٹ کا انتقال ہو گیا تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کادمبری کا باقی حصہ ان کے بیٹے بھوشن (भूषण) یا پلند (पुलिंद) نے پورا کیا۔

کادمبری کے قصے میں دو ہیرو ہیں۔ اول چندراپیڈ (चन्द्रापीड) دوئم پُنڈریک۔ ان دونوں کے تین تین جنموں کے قصے 'کادمبری' میں بیان کئے گئے ہیں۔ آغاز میں راجہ شودرک کے بارے میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں، جس کے دربار میں چنڈال(۱) ذات کی ایک لڑکی ایک ایسے طوطے کو لیکر آتی ہے جو انسانوں کی طرح بولتا ہے۔ اسی طوطے سے کادمبری کے قصے کو کہلوایا گیا ہے۔ یہ عوامی بنیادی تصور (Motif) "واسودتا" میں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح قصے سے قصہ نکلنے کا بنیادی تصور (Motif) بھی کادمبری میں ملتا ہے۔ طوطا سب سے پہلے چندراپیڈ اور ویشمپاین (वैशम्पायन) کا قصہ سناتا ہے۔ چندراپیڈ، راجہ تاراپیڈ کا بیٹا ہے اور ویشمپاین، راجہ کے وزیر شُک ناس (शुकनास) کا پسر ہے۔ چندراپیڈ اور ویشمپاین میں گہری دوستی ہے۔ قصے کے درمیان مہاشویتا (महाश्वेता) کے ذریعہ مہاشویتا اور پنڈریک کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مہاشویتا سے ملنے پر چندراپیڈ کادمبری سے ملتا ہے۔ کادمبری اور چندراپیڈ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کے وصل کا بیان قصے کے آخر میں کیا جاتا ہے۔ چندراپیڈ کو وصل سے قبل ہی اجین لوٹنا پڑتا ہے۔ بعد میں پتر لیکھا (पत्रलेखा)، کادمبری کا پیغام لیکر پُنڈریک سے ملنے آتی ہے۔ یہاں تک وان بھٹ کی تخلیق ہے باقی حصہ وان بھٹ کے بیٹے نے خلق کیا ہے۔ خود اسلوب اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس حصے میں چندراپیڈ، کادمبری سے ملنے کے لئے روانہ ہوتا ہے اور

---

(۱) بھنگی، خاکروب

سب سے پہلے مہاشویتا سے آکر ملتا ہے۔ مہاشویتا کے ذریعہ اسے اپنے دوست ویشمپاین کی پریشانیوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ ویشمپاین، مہاشویتا کو دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہے اور تنہائی میں اس سے اپنے دل کا حال بتاتا ہے۔ مہاشویتا اس سے ناراض ہو کر اسے بددعا دیتی ہے جس سے ویشمپاین طوطا بن جاتا ہے۔ یہ سن کر چندراپیڈ پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کادمبری اس کی لاش پر آکر بین کرنے لگتی ہے۔ تارا پیڈ اور رانی ولاس وتی (विलासवती) اپنے بیٹے کی موت کی خبر پاکر بہت غمگین ہو جاتے ہیں۔ جابال (जाबालि) کی کہانی یہیں ختم ہوتی ہے۔ بعد میں طوطے یعنی پنڈریک کو تلاش کرتا ہوا اس کا دوست کپنجل (कपिंजल) جابال کے آشرم میں آتا ہے اور اپنے دوست کی حالت کو دیکھکر بہت دکھی ہوتا ہے۔ ایک دن طوطا جابال کے آشرم سے اڑ جاتا ہے اور اسے ایک جگہ ایک چنڈال پکڑ لیتا ہے اور اپنی بیٹی کو دے دیتا ہے۔ وہ لڑکی اسے لیکر شودرک (शूद्रक) کے پاس آتی ہے۔ طوطا اس بات سے بے خبر ہے کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ چنڈال کی لڑکی اپنا تعارف خود کراتی ہے کہ وہ پُنڈریک کی ماں لکشمی ہے اور پنڈریک ہی پہلی جنم میں چندراپیڈ تھا۔ اتنا بتا کر لکشمی غائب ہو جاتی ہے اور اس کے بعد شودرک اور طوطا اپنا اپنا جسم چھوڑ دیتے ہیں۔ چندراپیڈ کی لاش میں دوبارہ زندگی دوڑ جاتی ہے۔ پنڈریک آسمان سے اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور آخرکار مہاشویتا پُنڈریک سے اور کادمبری چندراپیڈ سے ملتی ہیں، چاروں ہنسی خوشی اپنی زندگی گزارتے ہیں اور یوں کادمبری کے قصے کا اختتام ہوتا ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ وان بھٹ نے یہ قصہ 'برہت کتھا' (वृहतकथा) کے راجہ سُمانس (सुमानस) کی کہانی سے اٹھایا ہے کیونکہ اُس کہانی کی طرح ہی کادمبری میں بددعا اور تناسخ (Transmigration) والے عناصر قبول کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ برہت کتھا کی اس کہانی (راجہ سُمانس) اور کادمبری کے جذبات میں مماثلت نہیں ہے۔ ان دونوں قصوں کا اختتام بھی مختلف ہے۔ قصے کے اندر قصے کا نظام بھی برہت کتھا سے قبول کیا گیا ہے۔ قصہ گوئی کا یہی نظام پنچ تنتر (पचतत्र) کی اخلاقی

کہانیوں میں بھی ملتا ہے اور یہی نظام کتھا سرت ساگر (कथासरित्सागर) میں بھی دستیاب ہے۔ ان ساری تصانیف میں ایک کہانی سے دوسری کہانی اور دوسری سے تیسری کہانی پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے اس عنصر کو مغرب میں Emboxment of Tales کہا گیا ہے۔ پنچ تنتر میں قصوں کے کردار خود کہانیاں کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کادمبری کے دونوں ہیرو یعنی چندراپیڈ اور پُنڈریک کو تین تین جنم لینے پڑتے ہیں۔ لیکن ہیروئن یعنی کادمبری اور مہاشویتا اپنے ایک ایک ہی جنم کو گزارتی ہیں۔ انہیں کئی جنم نہیں لینے پڑتے۔ وان بھٹ اپنی اس لازوال تخلیق میں تین تین جنموں تک پھیلے ہوئے عشق کی کرشمہ سازیوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ عشق کے ساتھ ہی موت اور موت کے بعد کلیجہ پھٹنے والے ماحول اور محسوسات کی عکاسی اور اس کے بعد بھی معشوق یا عاشق سے دوبارہ ملنے کی امید وغیرہ کی تصویریں اپنی طرف دفعتاً کھینچ لیتی ہیں۔

اب چند باتیں وان بھٹ کے اسلوب پر بھی کرلی جائیں جس کے سبب کادمبری اور اس کے خالق کو شہرت ملی وان بھٹ معاملہ بندی کے بیان میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کادمبری اور چندراپیڈ جب پہلی بار ملتے ہیں تو اس حالت کا بیان یوں پیش کیا گیا ہے۔

> "چندراپیڈ کی مردانہ وجاہت کو دیکھتے ہی کادمبری کا قلب کامدیو کے تیر سے زخمی ہو گیا۔ اور اس سے اس کے جسم پر کئی فطری اثرات دکھائی پڑنے لگے۔ لوگوں کو کہیں ان کیفیات کا پتہ نہ چل جائے اس لئے عشق میں ڈوبی ہوئی کادمبری کی حیا آمیز حالت کو چھپانے میں کئی چیزوں نے اس کی بہت مدد کی۔ بظاہر ایسا معلوم پڑتا تھا کہ کادمبری جیسی نازک بدن کو شہزادہ چندراپیڈ کا احترام کرنے کی غرض سے یک دم ایستادہ ہونے کے سبب پسینہ آگیا ہے، لیکن اس پسینے کا اصل سبب تو کامدیو ہی تھا، جس نے پھولوں کے تیر سے کادمبری کے قلب کو

زخمی کرتے ہوئے پسینہ پیدا کر دیا تھا۔ چندرا پیڈ کو دیکھ کر جنسی جذبے
کے سبب کادمبری کی رانیں کانپنے لگی تھیں اور اس کی رفتار رک گئی
تھی لیکن کادمبری کے گھنگھروؤں کی آواز سن کر نزدیک آئے ہوئے
ہنسوں نے اس کی رفتار روک دی تھی، ایسا ہی لوگوں نے سمجھا۔
کادمبری کی تیز ہوئی سانسوں کے سبب سینے کا ملبوس جنبش کرنے لگا
تھا، لیکن دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا تھا کہ مور چھل جھلنے کے سبب
چلنے والی ہوا سے دوپٹہ ہل رہا ہے کادمبری کا ہاتھ اچانک دل کے اوپر
آکر گرا جیسے کہ دل میں موجود چندرا پیڈ کو چھونے کے لالچ میں اس کا
ہاتھ ادھر بڑھا ہو، لیکن وہی ہاتھ مرد سے اولین ملاقات سے شرمائی
ہوئی کادمبری کے سینے کو ڈھکنے کا بہانہ بن گیا۔ چندرا پیڈ کو دیکھنے سے
پیدا ہوئے انبساط کے سبب کادمبری کی آنکھوں سے آنسو گر پڑے
لیکن لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ کادمبری کے کانوں میں اڑسے ہوئے
پھولوں کا زرگل پڑنے کے سبب اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔
حیا کے بوجھ سے اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ لیکن
لوگوں نے یہی سمجھا کہ پدمنی کادمبری کے منہ کی خوشبو کے لالچ میں
اس کے منہ کے پاس اڑتے ہوئے بھونروں نے ہی اسے بولنے نہیں دیا
ہے۔ کامدیو کے تیر کی پہلی ضرب سے کادمبری سسک اٹھی، لیکن
لوگوں نے یہ سمجھا کہ پھولوں کے درمیان پڑا ہوا کیتکی کا کانٹا چبھ جانے
سے وہ سسک اٹھی ہے۔"

آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ اوپر کی سطور میں جس اسلوب میں دو نوجوان عاشق و معشوق کی اولین ملاقات کا بیان ہوا ہے اس میں شعریت قائم رکھنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ بہت دلآویز ہے اور اس میں فطری بہاؤ ہے لیکن اس اسلوب میں جذبات نگاری بھی ہم پایہ ہے۔ یہی وان بھٹ کا کمال ہے اسی طرح جب مہاشویتا اور پنڈریک

پہلی بار ملتے ہیں اس کا بیان بھی دیدنی ہے۔

"مہا شویتا کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کہ اس کے سارے حواس کو پنڈریک کے نزدیک پھینک رہے ہوں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس کا دل اسے کھینچ کر اس کے سامنے لے جا رہا ہو یا یہ کہ کامدیو اسے عقب سے آگے ڈھکیل رہا ہو اور مہا شویتا بڑی مشکل سے خود کو روک پا رہی ہو۔"

ہجر کے بیان میں بھی وان بھٹ نے بڑی چابک دستی دکھائی ہے کادمبری اور مہا شویتا کی اشک باریاں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ سراپا کے بیان میں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ہے۔ چاہے وہ چنڈال لڑکی کے حسن کا بیان ہو یا کادمبری اور مہا شویتا کے حسن کا بیان ہو وان بھٹ نے اپنے زرخیز تخیل کے سہارے بڑے شاندار مرقعے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے مردانہ حسن کے بیان میں بھی کامیاب تصویریں سجائی ہیں، چاہے شودرک اور چندراپیڈ جیسے راجاؤں کے مردانہ حسن کا بیان ہو چاہے جابال (जावालि) اور ہاریت (हारीति) جیسے سادھوؤں کی جسمانی ساخت کا بیان ہو وان بھٹ کے قلم نے ہر جگہ اپنا جادو جگایا ہے۔ ان کے اس بیان میں تشبیہ، تجنیس اور ایہام گوئی کا بہت خوبصورت استعمال موجود ہے اور کمال یہ ہے کہ ان تحریروں میں خیال، جذبہ اور اسلوب باہم مربوط ہیں کہیں بھی تصنع دکھائی نہیں پڑتا۔

سنسکرت کی نثری شاعری کی معراج وان بھٹ پر ختم ہوئی۔ ان کے بعد ان کا تتبع کئی شاعروں نے کیا لیکن بات نہیں بن پائی کیونکہ انہوں نے اپنی نثری شاعری کے بیچ بیچ میں پابند اشعار بھی شامل کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک نئی صنف چمپو کاویہ (चम्पू-काव्य) کا جنم ہوا جس میں نثر کا حصہ کم اور شاعری کا حصہ زیادہ ہو گیا۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ نثر اور شاعری کے ملے جلے روپ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ حالانکہ اس روپ کو چمپو کاویہ نہیں کہا جا سکا۔ یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ رگ وید میں اشعار ہی ملتے ہیں۔ علماء کا اندازہ ہے کہ رگ وید میں نثری حصہ تھا مگر وہ

حافظے میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ رگ وید کے زمزمے زبانی روایت (Oral Tradition) کے ذریعہ ہی معاشرے میں محفوظ رہے۔ غالباً رگ وید کے بعد لکھنے کا فن ایجاد ہوا جس سے نثر بھی محفوظ ہو گئی۔ یجور وید میں اسی لئے نثر محفوظ ہے بعد میں برہمن تصانیف میں آکھیایکا اور مذہبی تصانیف میں باقاعدہ نثر معرض وجود میں آئی۔ برہمنوں کے بعد بدھ عہد میں پالی میں لکھے گئے جاتکوں(۱) میں بھی نثر اور شاعری دونوں کا چلن ساتھ ساتھ ملتا ہے۔

جاتکوں کے بعد بودھ عالم آریہ شور (आर्यशूर) نے اپنی تصنیف جاتک مالا (जातकमाला) سنسکرت میں پیش کی۔ آریہ شور، سبندھ، ڈنڈی اور وان بھٹ سے بہت پہلے یعنی تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوئے تھے ان کے سامنے پالی میں لکھے گئے جاتکوں کے نمونے تھے۔ جن میں شاعری اور نثر دونوں موجود تھیں۔ جاتک مالا میں بھی گوتم بدھ کے کئی جنموں سے متعلق کہانیاں ہیں۔ وان بھٹ کی بہ نسبت آریہ شور کی نثر کا اسلوب سادہ اور دلآویز ہے۔ انہوں نے اپنے طویل جملوں میں صفتوں (Adjectives) کے ذریعہ کادمبری کی طرح اپنا بیان پیش کیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جہاں کادمبری میں صنائع بدائع کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے وہیں جاتک مالا میں آریہ شور نے صرف فصاحت پر ہی زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن جائے افسوس ہے کہ اس خوبصورت تخلیق پر سنسکرت شعریات کے علماء نے کوئی توجہ نہیں دی آچاریہ ڈنڈی، بھامہ اور وشوناتھ نے ان پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہی ہے کہ چونکہ جاتک مالا کا تعلق بودھ مذہب کے بانی سے تھا، اسلئے اس پر ان علماء نے کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، ورنہ جاتک مالا نثری شاعری کی بہترین نمائندگی کرتی ہے اور یہ کارنامہ آریہ شور نے سبندھ، ڈنڈی اور وان بھٹ سے بہت پہلے انجام دیا تھا لیکن انہیں فراموش کیا گیا۔ اس طرح کی بددیانتی اور لاپروائی کی مثالیں ہر زبان وادب

---

(۱) جاتکوں کی کہانیاں حضرت عیسیٰ سے پانچ صدی قبل سے لیکر دوسری صدی عیسوی تک لکھی گئیں جاتک سے مراد ہے پیدائش سے متعلق کہانیاں۔ ان میں گوتم بدھ کے کئی جنموں کی کہانیاں ہیں جو سبق آموز ہیں اسی لئے انہیں ناصحانہ قصے (Didactic Tales) بھی کہا جاتا ہے۔

میں موجود ہیں مثلاً ہمارے یہاں اردو میں نعتیہ شاعری خصوصاً مولانا احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی نثر، مومن کی غزل، جاسوسی ادب، آریہ سماج اور رام کرشن مشن کی اردو خدمات کے سلسلے میں ہم نے زبردست بے توجہی برتی ہے۔

سنسکرت کی نثری شاعری پر اجمالاً سطور بالا میں جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ قدیم یونان میں بھی نثری شاعری لکھی گئی تھی۔ مشہور مستشرق A. Berriedale Keith نے اپنی کتاب 'سنسکرت ادب کی تاریخ' میں ان دونوں متوازی دھاروں کی کاوشوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رائش Reich کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان اور یونان دونوں کی نثری شاعری میں، پہلی ہی نظر میں عشق ہو جانا اور خواب میں عاشق و معشوقہ کا ایک دوسرے کو دیکھنا، خوش قسمتی کا بدبختی میں تبدیل ہو جانا، دلیری کے کارنامے، سمندر میں جہاز کا ٹوٹ جانا، بے پناہ حسن کے مالک ہیرو اور ہیروئن، محبت اور فطرت کی خوبصورت عکاسی وغیرہ مماثلتوں کے باوجود دونوں ملکوں کی نثری شاعری مختلف ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر کیتھ A. B. Keith لاکوت (Lacote) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں کہانی کی نشو و نما فطری تھی اور اسی طرح اس کو ارتقا حاصل ہوا لیکن لاکوت کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ یونانی فکشن، ہندوستانی فکشن کے اثر میں پیدا ہوا۔ انکا یہ بھی کہنا ہے کہ یونانی نثری شاعری ہیئت کے اعتبار سے بھی یکساں نہیں تھی وہ بتاتے ہیں کہ Heliodoros کبھی خود قصے بیان کرتے ہیں تو کبھی ہومر (Homer) کی طرح اپنے کرداروں کے ذریعہ ان کے کارناموں کو بیان کراتے ہوئے نظر آتے ہیں Xenophon صرف اپنا بیان پیش کرتے ہیں جبکہ Achilles Tatius اپنی کہانی کو Kleitophon کی زبان سے پیش کراتے ہیں۔ اس طرح بہت سی مماثلتوں کے ہونے پر بھی دونوں ملکوں کی نثری شاعری اپنے اپنے ملکوں کے جغرافیائی حالات کی طرح مختلف ہے۔ پروفیسر کیتھ ایل۔ ایچ گرے (L. H. Gray) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یونانی نثری شاعری میں حالانکہ ادق ایجاز، تجنیس اور تکرار کا استعمال ضرور

ملتا ہے لیکن سنسکرت کی نثری شاعری میں صنائع بدائع کا زبردست استعمال قدرتی مناظر کے لطیف بیانات، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی اوصاف کا وسیع بیان ہی خصوصیت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ بہر حال ان دونوں ملکوں کی نثری شاعری میں جو مماثلتیں ہیں وہ بغیر ایک دوسرے سے متاثر ہوئے فطری طور پر اپنی اپنی زبان میں بیان ہوئی ہیں۔

ظاہر ہوا کہ دونوں قدیم تہذیبوں کی بلند فکر نے اپنے اپنے حالات میں اپنے اپنے انداز میں نثری شاعری کے اعلیٰ نمونے سیکڑوں برس پہلے پیش کر دیئے تھے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں مشرق میں نثری شاعری مغرب سے آئی۔ مغرب کی یہ نثری شاعری قدیم یونان کی نثری شاعری سے بظاہر کوئی علاقہ نہیں رکھتی اسی طرح جو نثری شاعری مشرق خصوصاً برصغیر میں لکھی گئی ہے اس کا بظاہر کوئی تعلق سنسکرت کی قدیم نثری شاعری سے نہیں ہے لیکن یہ فطری سوال ایک باشعور قاری کے ذہن میں ضرور اٹھنا چاہئے کہ آخر نثری شاعری کی جڑیں کہاں ہیں اس سوال کو ہمارے یہاں اردو میں احمد ہمیش نے سب سے پہلے اٹھایا بھی ہے اور جواب دینے کی پہل بھی کی ہے اور ان کا موقف اپنی جگہ درست بھی ہے۔ اس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

منظر نگاری اور تجسّس کا قادر۔ابن صفی۔ا

ڈاکٹر ایثار صفی مضمون

اردو میں جاسوسی ادب کا طبع زاد ناول نگار ابن صفی کو مانا جاتا ہے۔ابن صفی نے اُس دور میں جاسوسی ادب کے اندر جدت طرازی کے اسلوب کو اپنایا جبکہ اردو میں صرف چند تراجم ہی ملتے تھے۔

ابن صفی اپریل ۱۹۲۸ء میں الہ آباد کے قصبہ نارہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہی حاصل کی وہیں پلے بڑھے۔اور اپنی جدت پسند طبیعت کے باعث اردو کے جاسوسی اَدب پر طبع آزمائی کی۔چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی اِس لیے شاعرانہ مزاج نے اُس میں چاشنی پیدا کر دی اور جاسوسی ادب جیسا خشک مضمون بھی دلکش اور پُر تجسّس بن گیا۔ان کے قلم سے نکلنے والی کہانی میں جو روانی ہوتی تھی اسمیں وہ منظر کشی اور تجسّس کے رنگ بھرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ قاری اُن کہانیوں میں گم ہو جاتا تھا اسی لیے کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ وہ واحد مُصنف تھے جن کے ناول ایک نشست میں ختم کیے جاتے ہیں۔

ان کی تحریروں کے معترفین میں مولوی عبدالحق، خواجہ ناظم الدین، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر مجاور حسین، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، مستنصر حسین تارڑ اور امجد اسلام امجد اور دیگر دورِ حاضر کے اکابرین شامل ہیں۔اوسلو یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر فین تھیسن بھی ابن صفی کے متعرف نظر آتے ہیں بقول ان کے "اردو کی بقا کے لیے ابن صفی نے بہت کچھ کیا ہے۔ورنہ اردو تو مرتی ہوئی زبان ہوتی جارہی تھی کیونکہ یہ صرف بوڑھوں کے پاس ملتی تھی"۔

ابن صفی اردو کے واحد مصنف ہیں جنکے بارے میں مکمل استفادہ اب انٹرنیٹ پر بھی کیا جاسکتا ہے (http://:www .IbneSafi.Com)۔

کسی بھی ادیب کو اپنی تحریر میں رنگ بھرنے کے لیے خوبصورت مناظر کا سہارا لینا پڑتا ہے، یہ بات بھی مُسَلّم ہے ان میں رنگ بھی وہی بھر سکتا ہے جسکی سوچ شاعرانہ ہو یا خود شاعر ہو۔ابن صفی چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور بارہ برس کی عمر میں جگرؔ اور داغؔ کے انداز کی شاعری کر لیتے تھے جس کی مثال یہ قطعہ ہے

ہمیں تو ہے مئے گُلِ رنگ و گُل رُخاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے

بس اتنا یاد ہے اسرار وقتِ مے نوشی
کسی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

ابن صفی جب اپنی کسی کہانی کا پلاٹ ترتیب دیتے ہیں تو وہ مناظر، حالات کا بغور اور باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں، جس کو پڑھنے کے بعد قاری واقعات کے پس منظر میں کھو جاتا ہے۔

ابن صفی کی تخلیق شدہ کتابوں کو مختلف پس منظر میں تقسیم کیا جاسکتا ہے وہاں گھریلو اور نفسیاتی مسائل، خاندانی وراثتی جھگڑے، سائنس فکشن، حکومتی سازباز، مختلف اداروں کے باہمی جھگڑے، حکومتوں کے مابین اختلافی جھگڑے، مختلف گروہوں کے آپس کے تصادم بھی کچھ نظر آتا ہے۔

منظر کشی کے اصول کے تحت ایک تخلیق کار کو اس منظر کی تمام جزویات کا علم ہونا ضروری ہے۔ وہ اس کو اس خوبصورتی سے بیان کرے کہ قاری کا ذہن اُسے فوراً قبول کرے۔ اسی طرح کسی کے مزاج اور کردار کے بارے میں بیان کرنے لگے تو اس مخصوص طبیعت کے لوگوں کے مزاج کا بغور مشاہدہ کرے تاکہ کوئی بات متضاد نہ لگے۔ حتیٰ کہ اُسے ان کے سوچنے کا انداز بھی پتہ ہو یہ بات اس وقت زیادہ اہم ہوتی ہے کہ جب وہ کسی خاص نقطۂ نگاہ کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہو، یا کسی خاص ملک کے لوگوں کا رہن سہن ظاہر کرنا چاہتا ہو اس ضمن میں میں ذاتی طور پر ایڈلاوا سیریز کا حوالہ دینا ناگزیر سمجھتا ہوں جس میں عمران ایک مشن پر اٹلی جاتا ہے، اُن ناولوں میں جس خوبصورتی سے اطالوی معاشرے، مقامات اور لوگوں کی سوچ کی عکاسی کی اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اُن میں رہا ہو۔ راقم الحروف کو کیونکہ اٹلی میں تعلیم کے دوران خاصہ وقت گزارنے کا موقع ملا اس لیے وہاں کے مقامات اور معاشرتی معاملات کو بالکل ویسا ہی پایا جیسا کہ کتابوں لکھا ہے۔ وہ شیاع ویا نومینتانا ہو، یا تیسرے درجے کا ہوٹل یا بازار یا گومو کی جھیل یا سسلی کے ساحل سمندر۔ کوئی بھی اس قدر عمدہ اور دلکش عکاسی کو دیکھ کر یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اس ناول کا تخلیق کار کبھی اس ملک میں نہیں آیا! لیکن یہ حقیقت کہ ابن صفی پاکستان بننے کے بعد سوائے ہجرت کے کوئی سفر ملک سے باہر نہیں کیا۔ یہ اُن کے اپنے قلم کا طلسم تھا کہ وہ نقشہ اس خوبی سے کھینچتے تھے کہ قاری کو احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود اس ماحول میں ہو۔ (چاہے وہ عمران کا لندن کا سفر ہو یا افریقہ کے جنگلوں کا یا برازیل میں دریائے ایمیزن کے نظارے)۔

ابن صفی کی تحریروں کی دوسری بڑی خاصیت تجسس ہے، وہ کہانی کا جال کچھ اس انداز سے پھیلاتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے، جس کا ازالہ وہ اس کو ایک نشست میں پڑھ کر کرتا ہے جس زمانے میں دوسرے ناول کے لیے پڑھنے والے کو ایک ماہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا، وہ انتہائی کرب سے گزرتا تھا۔ ابن صفی کے مداح آپس میں بیٹھ کر کرداروں اور واقعات پر بحث کرتے تھے اُن کے قلم کے سحر زدہ

مداحوں کا انداز بھی کچھ اس طرح ہوتا جیسا کہ آجکل ہم کر سیاست یا حالاتِ حاضرہ پر بحث ہوتی ہے۔ کسی بھی ادیب کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ لوگ اس کی تحریر کے منتظر رہیں۔ لوگ ان کو خطوط لکھ کر اور ملکر اپنی بے چینی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ شائد لوگوں کے علم میں نہ ہو جو مصنف فکشن کے اعلیٰ مقام پہ فائز تھا، جس کے تخیل پر بہت سی ایجادوں نے جنم لیا۔ جس کی سوچ ہمیشہ آسمانوں سے اونچی اُڑتی تھی اُس نے اپنے گھر پر ٹیلی فون اس اندیشہ کے تحت نہیں لگایا تھا کہ مداحوں کے فون کے جواب دینے کی وجہ سے لکھنا نہ رہ جائے۔

ان کے تخیل کی پرواز طلسم ہوشربا کی اُن جلدوں کے مرہونِ منت تھی جو سات برس کی عمر میں ان کی گھٹی میں اتر چکی تھی۔ اُن کے کردار عمران، فریدی، سنگ ہی اور تھریسا اُن ہی پر تجسس طور پر کام کرتے نظر آتے ہیں جیسے کہ کوئی طلسم ہوشربا کی داستان ہو۔ ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے طلسم ہوشربا کو دورِ جدید کے نئے زاویے میں لکھ ڈالا۔ جس نے ان کے کرداروں کو پڑھا انہیں کا ہو رہا۔ پھر کچھ دوسرے نقال لکھنے والوں نے بھی انہیں خطوط پر لکھنا چاہا لیکن ابن صفی کا قاری اصل اور نقل کو کسوٹی پر پرکھنے لگا، وہ چند سطریں پڑھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ تحریر کس کی ہے۔ یہ ابن صفی کے قلم کا کمال تھا کہ انہوں نے تین نسلوں کے ذہنوں پر حکومت کی۔ ابن صفی کے ناولوں میں تجسس کا ایک ایسا جال بُنتا ہے کہ قاری خود کو اُس کہانی کا کردار سمجھنے لگتا ہے، قاری کو پتہ ہے کہ کرنل فریدی کہانی میں کب داخل ہو گیا اگر فریدی مجرموں سے برسرِ پیکار بھی ہے اور اس نے کوئی اور روپ دھار رکھا، قاری اس روپ کو پہچانتا ہے اور اس کے کارناموں پر متحیر ہوتا ہے اور آخیر میں دوسرے کرداروں پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ اصل میں فریدی تھا۔ یہ قاری اپنے دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے کہ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا..... یہ اپنے دام میں حصار کرنے کے لیے وہ گر تھا جو صرف ابن صفی کے یہاں ملتا ہے..... قاری کرداروں کے ساتھ قلبی رشتہ جوڑ لیتے ہیں اگر کبھی ابن صفی کے قلم سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو قاری کے خیال میں نامناسب ہوتی تو بہ مثل گوشمالی خطوط کے ڈھیر لگا دیتا۔ جاسوسی ناول "زمین کے بادل" میں فریدی اور عمران کو یکجا کر کے زیرولینڈ کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ فریدی پسندوں کو شکایت تھی کہ عمران نے فریدی کے مرتبے کے اعتبار سے گفتگو نہیں کی۔ عمران پسندوں کو اعتراض تھا کہ یہ کیس فریدی صاحب کا نہیں تھا" انہوں نے یہ کیوں کہا کہ وہ ایک دن دنیا کو بتائیں گے کہ زیرولینڈ کہاں ہے؟" یہی وجہ تھی کہ ابن صفی نے "زمین کے بادل" کے بعد ان دو کرداروں کو کبھی اکٹھا نہیں کیا۔

عمران کا کردار اپنی نوعیت کا واحد کردار ہے۔ وہ ایسے کھلنڈرے مگر تعلیم یافتہ نوجوان کا کردار ہے جس

کا ظاہرانہ رویہ لاپروئی اور مسخرہ پن کا مظہر ہے۔ جسکو اس کے باپ جو انٹیلیجنس سروس کے ڈائریکٹر تھے اس کی حرکتوں کے باعث گھر سے الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن اصل روپ کچھ اور ہے۔ فارن سیکریٹری کے تحت ایک سپر سیکریٹ سروس کا انچارج اور اعلیٰ عہدے دار ہے۔ جس کو اس کے ماتحت ایکس ٹو کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ٹیلی فون پر ان سے رابطہ رکھتا ہے اس بات کا دعویٰ رکھتا ہے کہ اُسے اُس کے ماتحتوں کی پل پل کی خبر ہے۔ اس کی آواز کی ہیبت سے ماتحت کانپتے ہیں۔ لیکن یہی عمران جب اپنی تمامتر حماقتوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو کوئی اس کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ اس کو چٹکیوں میں اڑا کر محظوظ ہوتے ہیں۔

اس تمام منظر اور تذبذب کے عالم سے جو اصل میں محظوظ ہوتا ہے وہ ہے عمران کا قاری جو کہ اس کی ذہانت اور باریک بینیوں پر نظر رکھتا ہے۔ اگر عمران کسی مصلحت کے سبب اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں ہوتا پھر بھی اپنی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے۔ یہ ابن صفی کا قاری ہے جو غیر ارادی طور پر اس ناول کا حصہ بن جاتا ہے، اور اتنی دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے جیسا کہ وہ تمام واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ ایک طرف قاری ابن صفی کا ناول پڑھ رہا ہوتا ہے دوسری طرف اپنے طور پر کیس کو حل کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔ چونکہ ابن صفی کو پڑھتے پڑھتے اتنا مشاق ہو چکا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ عمران سے پہلے کیس حل کر لیتا ہے لیکن کرداروں اور واقعات کی اونچ نیچ میں اتنا غرق ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ ناول ایک نشست میں مکمل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایثار صفی۔ سکونت: کراچی (پاکستان)

ہماری کہانی کی تاریخ ــــ ۱۲

میر انیس

احمد ہمیش — مضمون

اس سرزمیں کے گل نظر آتے ہیں مجھ کو خار	نشتر سے کم نہیں ہے رگ جاں کو یہ سبزہ زار
یہ بادِ تند تیر سی ہوتی ہے دل کے پار	اس بن کی خاک سے مری خاطر پہ ہے غبار

"دشت بلا" انتخاب میر انیس

گوتم بدھ نے کہا تھا"سات سمندوروں میں اتنا پانی نہیں ہوگا جتنا آدمی کی آنکھ سے آنسو بہا ہے"۔ یہاں اگر ایک گہری نظر کی جائے تو سات سمندروں کے پانی سے بھی زیادہ آدمی کی آنکھ سے بہا آنسو بھی دراصل میر انیس کا سلسلہ نسب ہے اور یہی میر انیس کا مرتبۂ سخنوری بھی ہے۔ اس لئے کہ میر انیس مرثیہ نگار نہیں، مرثیہ کے خالق تھے۔ اس لئے کہ میر انیس سے پہلے مرثیہ لکھا تو جاتا رہا، مرثیہ خلق نہیں کیا گیا اس لئے کہ مرثیہ کا سلسلہ نسب بھی تو رامائن اور مہابھارت کی رزمیہ کتھا یہاں تک کہ ہومر کے EPIC اور تھامس گرے کی تخلیق "اے کنٹری چرچ یارڈ" سے جا ملتا ہے۔ اگر بات محققانہ اور ناقدانہ سطح پہ کی جا سکتی تو یہ کہنے میں کوئی عار نہ ہوتا کہ میر انیسؔ کے مرتبۂ سخنوری کے شایانِ شان جو حق ادا کیا جا سکتا تھا وہ بہ وجوہ ادا نہ ہو سکا۔ حالانکہ دور دور تک کوئی بھی تو نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ میر انیس کی عظمتِ سخنوری سے ہندی تہذیب بہ رنگ اسلام کا اجرا یا ہندو مسلمان کی تہذیبی و تمدنی شناخت معتبر ہوئی مگر اسے تاریخ کے جبر نے اجاگر نہیں ہونے دیا۔ یہاں اگر ایک سرے سے نظر کی جائے تو محمد بن قاسم اور محمد غوری کے وقت سے بہادر شاہ ظفر کے عرصۂ اقتدار تک مسلمانوں کی علیحدہ تہذیبی پہچان تھی ہی نہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے پر شکوہ شاندار عمارتیں تو بنوائیں مگر تہذیبی جمالیاتی نظام کی تشکیل کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور ظاہر ہے یہ نظام ہندی اور اسلامی رنگ کے امتزاج سے ہی قائم ہو سکتا تھا۔ البتہ اس حساب سے اگر میر انیس شاہجہاں اور اورنگزیب کے عہد میں ہوئے ہوتے تو کیا ان کے ہونے کا جواز بساطِ سخنوری کے شایانِ شان ہوا ہوتا! شائد نہیں۔ اس لئے کے کہ اس عہد میں ابھی تاریخ کا جبر واضح نہیں ہوا تھا۔ ہر چند ہندو مسلمان اپنے عقائد اور مسالک کی رو سے اپنے تیوہار مثلاً، ہولی، دیوالی، دسہرا، شب برات، اور عید وبقر عید جس انداز سے مناتے

آرہے تھے، اس کے شواہد تو بیشتر شہنشاہ اکبر کے زمانے سے ہی ملتے آئے تھے۔ بیشتر رسوم ورواج کی ظاہری پیروی ہوتی آرہی تھی۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں تلسی داس نے رامائن لکھی لیکن ابھی تلسی داس کی چوپائیوں کو بیچ دسہرے پڑھے جانے کا رواج شامل نہیں ہوا تھا جبکہ محرم کے دس دن کے دوران عزاداری ہوتی آرہی تھی۔ بلکہ قلی قطب شاہ جسے پہلا مرثیہ گو شاعر کہا جاتا ہے اور اس کے عہد میں مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ پھر بھی اجتماعی سطح پر بیشتر ہندوؤں کا تہذیبی اور تمدنی رنگ غالب تھا۔ یعنی محض نام نہاد مسلم اقتدار کے دوران ہندی تہذیب و تمدن کے اجارہ دار بیشتر ہندو ہی تھے۔ جبکہ برِ صغیر میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام تصنیف اور تالیف اور تراجم کا مجموعی مقصد سنسکرت اور فارسی کے ادب عالیہ (سنسکرت ناٹک اور شعریات، فارسی مثنوی اور حکایات) کا گراف گراتا تھا، اسے گرایا گیا۔ تب بد نصیب اردو کی جھولی میں پراکرتوں کی ذیلی لوک کتھائیں، کہاوتیں اور محاورے ڈال کے اسے جیسا کا تیسا چھوڑ دیا گیا۔ پھر انگریزوں کی عمل داری قائم ہوتے ہوتے اردو کو روشن خیالی اور ترقی کے نام پر ذہنی اور معاشی غلام بنادیا گیا۔ جبکہ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ میر انیس کے ہم عصر تھے غالب اور آتش۔ مگر لُم طیور کے ساتھ شرابِ انگلشیہ غالب کو بہت مرغوب تھی۔ "دستنبو" میں انگریز آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے غالب نے ہم وطنوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ تاہم جب کبھی اندر ہی اندر عزتِ نفس پر کوڑے پڑنے لگتے تو محض برائے عافیتِ سخن غالب اپنے ہمعصر میر انیس کے مرتبۂ سخن کی داد دیئے بنا بھی رہ نہ پاتے۔ یا پھر انتہائی فراخدلی سے داد دینے کا انداز تھا آتش کا۔ جب انہوں نے مجلس کے دوران میر انیس کو کچھ یوں مخاطب کیا "کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو"۔ سوائے اس کے کہ سر سید کی تحریک کے تحت روشن خیالی اور ترقی کی عجلت میں اہلِ اردو کو شاعری سے ہٹا کے انگریزی نثر کے اتباع میں اردو نثر نگاری کی طرف مائل کیا گیا۔ ایسے میں میر انیس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ سر سید کے رفقاء حالی اور شبلی نے مصلحتِ پیروی مغربی اور خوشنودی انگلشیہ میر انیس کا ذکر محض ضمناً کیا۔

البتہ قیاس سے کہا جاسکتا ہے کہ انگریز سرکار در پردہ میر انیس کی پاک بازی، پارسائی اور شانِ بے نیازی سے خائف بھی رہی ہوگی! مبادا مرائی میر انیس ہومر کے رزمیہ EPIC پر حاوی نہ ہو جائے! اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی حق بہ جانب ہوگا کہ میر انیس نے مرثیہ اور رزمیہ کو یکجا کر دکھایا۔ جبکہ یونانی رزمیہ مع تصور المیہ اور برِ صغیر کے رامائن اور مہابھارت میں "ہیرو" کا تصور حق و باطل کے فرق سے بڑی حد تک عاری تھا۔ ان کے یہاں ہیرو حق و باطل کا فرق قائم کئے بنا بے معنی جنگ کا بے معنی فاتح بن جاتا۔ اسی لئے رامائن کے ہیرو رام کو شمالی ہند میں تو تسلیم کیا جاتا رہا تھا مگر جنوبی ہند میں رام کے مقابل راون کو ہیرو سمجھا جاتا رہا تھا

البتہ چونکہ دسہرے کے مقابل محرم کو مقدم ٹھہرانا بھی ناگزیر تھا۔ لہٰذا اسلام رنگ ہندی تہذیب کی تعمیر کے لئے عزاداری کے جلوس اور مجالس میں مراثی میر انیس کا شامل ہو جانا تاریخ کا عظیم واقعہ ثابت ہوا۔ جبکہ انگریز سرکار تاریخ کے جبر کی صورت انیس شناسی کی تعینِ قدر میں حائل ضرور ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ اودھ کے فرمانروا اور امرا نے میر انیس کی سرپرستی کی۔ اور کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں محرم کی مجالس کے دوران تب بڑا پر شکوہ اہتمام ہوا کرتا تھا، اور چوگرد محلوں، بارہ دریوں، حویلیوں، چوباروں، برجوں، دریچوں اور چھجوں کے منقش و آراستہ ماحول میں عزاداری اور مرثیہ کی سماعت کی ایک اپنی تہذیب برپا ہوتی تھی، جب میر انیس منبر پر جلوہ افروز مرثیہ پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے ہندی اسلامی تہذیبی شناخت کا عام و خاص نظارہ اس اجتماعی لاشعور میں شامل ہو رہا ہوتا تھا جو ایک طرح سے دسہرے کی ہندو اجتماعی اجارہ داری کے مقابل اس پر غالب آتا ہوا نظر آتا تھا۔ پھر یہ کہ میر انیس نے تو مرثیہ کے پیرایہ میں بے پناہ علم و بصیرت اور خلاقانہ قوت کے باوصف کربلا کا نظارہ کائناتی تسلسل میں کرایا۔ اور پہلی بار خیر و شر اور حق و باطل کے فرق کو چار دانگ عالم پر واضح کرتے ہوئے حضرت امام حسین کو روئے زمین پر مظلوم انسانیت کا ہیرو باور کرایا۔ اور خلاف اس کے یزید کو دنیا بھر کے ظلم و جبر اور شر کا علامتی کردار بنا چھوڑا۔ اس طرح انکشاف یہ ہوا کہ ظلم و جبر کے ہاتھ بیعت نہ کر کے کلمۃ الحق بلند کرنے والے اہلِ بیت عالمگیر احتجاج و جنگ کا لافانی نقش بن گئے۔ یہاں اگر غور کیا جائے تو برِصغیر میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کے ابتدائی محرک مراثی میر انیس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بھی کہ مرثیہ کا تعلق کبھی دربار سے نہیں رہا، مرثیہ راست عوام سے مخاطب رہا۔ جبکہ میر انیس کے یہاں تو مرثیے میں کہانی کی واقعیت، ماجرائیت اور بیانیہ کو ظلم کے خلاف احتجاج کی صورت وسیع کینوس پہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو تا رہا یا ہو تا رہے گا، وہیں کربلا کا ہونا بھی ناگزیر ہوا یا ہو گا۔ ظاہر ہے، یہ تجسس تو ہو سکتا ہے کہ کیا کربلا کا جغرافیہ مسلمانوں کی تاریخ کے ابتدائی عہد میں خطۂ عرب تک محدود تھا! یا کیا حضرت امام حسین کا جس قوم سے سامنا تھا، وہ مسلمان تھی یا کچھ اور! یا کیا محمد کے نواسہ کی عظیم قربانی کسی ایک مخصوص نسب اور کسی ایک مخصوص قوم کے لئے تھی!

کس قوم سے درپیش ہے حضرت کو لڑائی مولا نے غلاموں کی نہ کیوں فوج بلائی
کون ایسے ہیں سرکش، انہیں کچھ شرم نہ آئی کرتے ہیں محمد کے نواسے سے لڑائی

بڑی بات یہ ہے کہ میر انیس نے بحیثیت قائدِ سخن مرثیہ خوانی سے عالمگیر عوامی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ سردار جعفری نے تو بس اس حد تک تسلیم کیا کہ مراثی میر انیس سے ترقی پسند شاعری متاثر ہوئی۔ مگر یہ بھی

وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد میر انیس نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ یہاں تک کہ ذرا پہلے پریم چند کے یہاں افسانہ میں بیانیہ مراثی میر انیس کے زیر اثر آیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں بہ شمول منٹو اور قرۃ العین حیدر کے یہاں بیانیہ میں جو موضوعی تو سیعی ہوئی، وہ بھی مراثی میر انیس کے زیر اثر ہوئی۔ جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کی رہنمائی مراثی میر انیس سے حاصل کی گئی۔

اس کے باوجود مقامِ حیرت ہے کہ جہاں میر انیس کے مرتبۂ سخن کو نامی گرامی اہلِ حرف ولفظ نے انتہائی سراہا۔ مثلاً مسعود حسن رضوی کی تصنیف "روحِ انیس" میں لسانی نزاکتوں پر میر انیس کی قدرت کو موضوع بنایا گیا۔ پروفیسر کرار حسین نے منظر نگاری کی بوی اور مکمل امیج پیش کرنے میں میر انیس کی بہ درجہ کمال قدرت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی نے میر انیس کی سحر انگیز شخصیت کے خوشہ چینوں کا ذکر کیا۔ جبکہ ہمارے زمانہ کے نابغۂ روزگار علامہ طالب جوہری نے میر انیس کو انسانی رشتوں کا عظیم شاعر قرار دیا...... وہیں مراثی میر انیس سے بیسویں صدی کے جدید مرثیہ کی گراں قدر مثالوں تک مرثیہ تصنیف نو کے شاعر و محرک ڈاکٹر ہلال نقوی جب اپنے مقالہ "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" میں یہ شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "یہ ایک ادبی المیہ ہے کہ ہماری اردو تنقید نے مرثیہ کو بہت سنجیدگی سے اپنے احاطہ میں نہیں لیا، مرثیہ کئی زمانوں سے اپنی اس جلاوطنی کا کرب جھیل رہا ہے" ...... تو اس کے جواب میں آسانی سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سوائے اس کے کہ ادھر ادھر کی بھیڑ سے ہٹ کر اگر میر انیس کے مرتبۂ سخن وری اور مراثی میر انیس پر از سر نو توجہ کی جائے تو اصل موقف سے انصاف ہو سکتا ہے۔

دراصل ہم ایک پیچیدہ (Complexed) زمانہ میں رہ رہے ہیں۔ اس زمانہ میں ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم مشرق کی عظمتوں کو از سر نو قائم کرنے کے لئے مغرب کے مادی اور شیطانی ذہن کو لاجواب کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار ہوں۔ اس کے لئے ہمیں کسی بھی عقیدہ، مسلک اور نظریہ کی اجارہ دارنہ قید سے باہر نکلنا ہوگا۔ تاہم اب یہ بھی ناگزیر ہے کہ تمام عقائد، مسالک اور نظریات کی پابندیوں سے نکل کے میر انیس کی شعری و ادبی عظمت کی تعینِ قدر بلکل آزاد فضا میں کی جائے تو مشرق کے نشاۃِ ثانیہ کے اس اکابر کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

احمد ہمیش۔ آبائی وطن: ضلع بلیا (بھارت) سکونت: کراچی (پاکستان)

اقبال مجید کا ناول "نمک"

انجلا ہمیش

تحریری مطالعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے "زمانہ دو ہی دن کا نام ہے ایک دن موافق ہوتا ہے اور ایک دن مخالف پڑتا ہے"۔ دراصل انسان ہمیشہ زمانہ کے ماتحت رہا کبھی اپنے نفس اور کبھی کمزور اعصاب ہونے کی وجہ سے۔ جس دور کو انسان اپنے موافق سمجھتا ہے وہ دراصل آزمائش کا دور ہوتا ہے لاعلم انسان اپنے نفس کے چلتے ایسا غافل ہوتا ہے کہ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے آنے والا وقت اسے اس کے کئے کا کیا صلہ دے گا۔ اب اقبال مجید کے ناول "نمک" کی زہرہ خانم کو لے لیجئے! وہ جو عشوہ ناز سے بڑے بڑے لوگوں کے دل مٹھی میں لے لیتی تھی اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں اسے اس کی اولاد ایک پورے گھر سے الگ کر کے ایک کمرے میں قید کر دیتی ہے۔ یوں زہرہ خانم عرف محبوب جان اپنی باقی زندگی کے بتیس سال پرانی یادوں کے سہارے روتے دھوتے گزار دیتی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے یہ۔ کچھ لمحوں کی خوشی کے بدلے اتنی طویل اذیت جھیلنی پڑتی ہے۔ بیس کمروں کے دارالاشکبار، میں جہاں ہر وقت رونق رہتی تھی، دعوتیں ہوتی تھیں۔ وہاں کمرہ نمبر ایک میں پڑی زہرہ خانم کی حیثیت کسی بوجھ سے کم نہیں۔ وہ تو اتنی بے اختیار تھی کہ اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ کب اس کی اولادوں نے اُسے زہرہ خانم سے زہرہ سلطان بنا دیا اور جب اُسے معلوم ہو بھی گیا تو اس نے کیا کر لیا؟ اُس کے کمزور اعصاب اب اس قابل نہیں تھے کہ وہ اپنی شناخت اور اپنی شخصیت کے لئے لڑ سکے اب مجبوراً اسے دوسروں کے دیئے ہوئے حوالوں کے سہارے زندہ رہنا تھا۔

ایسا وقت تو سب پر آئے گا۔ زہرہ خانم کی نواسیوں استم اور سم سم پر بھی ایسا ہی وقت آئے گا۔ زندگی کی تمام گہما گہمی، افراتفری اور مصروفیت کے بعد استم اور سم سم کے بھی اعصاب جواب دے جائیں گے۔ اور پھر وہ بساڑھی کی شکنیں درست کرنے والی استم وہ استم نہ رہے گی اور نہ ہی اپنے دوست آشوتوش کے ساتھ تحقیق کرنے والی سم سم وہ سم سم نہ رہے گی۔

وقت کبھی کسی کے لئے ایک سا نہیں رہتا۔ کسے معلوم متوازن زندگی گزارنے کے لئے کتنا نمک درکار ہے۔ اور اقبال مجید صاحب نے اسی المیہ کو اپنے ناول "نمک" میں بیان کیا ہے۔ جو کہ منفرد تو نہیں مگر معاشرتی حوالہ سے ایک اہم ناول ہے۔

B 132,H-B Colony Koh-Faza,Bhopal-462001(India) :رابطہ

سنسکرت شعریات
عنبر بہرائچی کی تصنیف

احمد ہمیش — تحریری مطالعہ

خوش قسمتی تو یہ ہے کہ سنسکرت شعریات عنبر بہرائچی کے قلم سے لکھی گئی ایک بڑی تصنیف موجودہ عہد میں شائع ہوئی۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ایک بڑی تصنیف جو شایانِ شان اعزاز اور مانیتا मान्यता کی مستحق ہے، اسے ابھی بہت چھوٹے لوگوں کی لاعلمی، کم ظرفی اور عصبیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اب ذرا اندازہ کیا جائے کہ عنبر بہرائچی کے دیباچہ اور متفرق صفحہ کے اندراج کے مطابق سنسکرت شعریات ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ جبکہ ۲۰۰۰ء کے آغاز کے چار پانچ ماہ بعد ہی صلاح الدین پرویز کا رسالہ سہ ماہی استعارہ شائع ہوا۔ اس میں عنبر بہرائچی کی تصنیف سنسکرت شعریات پر تبصرہ کچھ اس انداز سے شامل ہے جیسے کوئی اونٹ پہاڑ تلے آکے بھی خود کو پہاڑ سے اونچا باور کرا رہا ہو۔ مبصر سنسکرت زبان اور سنسکرت کے ادبِ عالیہ سے بالکل واقف نہیں مگر اس کے باوجود اس نے بڑی دریدہ دہنی سے گوپی چند نارنگ کی مشرقی شعریات کو محققانہ اولیت کا کریڈٹ دے دیا اور نارنگ کی مشرقی شعریات میں ایک مشرق ہی نہیں، باقی الم غلم بہت کچھ ہے۔ اس سے پہلے ایک سازش یہ بھی کی جا چکی ہے کہ عنبر بہرائچی کو مابعد جدیدت کے زمرے میں بڑی چالاکی سے شامل کیا گیا۔ اس میں کامیابی تو نہیں ہوئی۔ کیونکہ سنسکرت شعریات کے بادصف مشرقی شعریات کی اولیت کا سہرا فقط عنبر بہرائچی کے سر جاتا ہے۔ سنسکرت کے ادبِ عالیہ کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کام فورٹ ولیم کالج کے قیام اور مقصد سے انگریزوں کی عمل داری تک نہیں ہو سکا بلکہ جو کام انگریزوں سے جنگِ آزادی اور پھر ان سے آزادی حاصل کرنے تک بلکہ آزادی کے بہت بعد بھی نہیں ہو سکا، اسے فقط عنبر بہرائچی نے انفرادی دستاویزو تاریخ کے طور پہ انجام دیا اور اسے ایک طرح سے مشرق کی بازیافت قرار دیا جائے تو یہ کتنا حق بہ جانب ہے۔ جبکہ ہندی والوں سے یہ کام اس لئے نہیں ہو سکا کہ جس گھر اسٹیشن سے قریب ہوتا ہے اس کی گاڑی اکثر چھوٹ جاتی ہے۔

سنسکرت شعریات کے جمالیاتی و فکری نظام کا احاطہ ہیتی، موضوعی اور تکنیکی سطح (رس، النکار اور ریت) سے ہی نہیں بلکہ تقابلی مطالعہ کی سطح پر غالب، میر انیس اور اقبال کے بعد کے شاعروں کے اشعار

بطور مثال درج کئے گئے ہیں یہاں تک کہ سنسکرت کے خزانے سے اردو کو مالا مال کرنے کے لئے عمیق حنفی، عادل منصوری اور شہریار کے اشعار کو بھی سنسکرت شعریات کے تناظر میں جگہ دی ہے۔ ہر چند اس میں نادانستہ کچھ غلو تو آگیا ہے پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ عنبر بہرائچی کے توسط سے مغربی زبانوں کی شعریات کا عقدہ بھی اس طرح کھلا کہ مغربی زبانوں کے شعری رجحانات مثلاً علامتیت، استعاریت، تجریدیت اور ابہام یہاں تک کہ امیجزم سے بہت پہلے سنسکرت شعریات کے باب میں آنندوردھن نے دھون ध्वनि (نویں صدی عیسوی کنتک نے وکروکت वक्रोक्ति (گیارہویں صدی عیسوی) شیمندر نے اوچتیہ औचित्य (گیارہویں صدی عیسوی) سے روشناس کرادیا تھا۔ البتہ اگر عنبر بہرائچی چھٹی دہائی کے عرصہ میں اپنی اس گرانقدر تصنیف سنسکرت شعریات کے ساتھ نمودار ہوئے ہوتے تو اہلِ اردو مغربی زبانوں کے شعری اور ادبی رجحانات کا اتباع کرنے کی جائے سنسکرت کے شعری اور ادبی ورثے سے ناتا جوڑتے۔

ناشر۔ ۹۰۵ نزد ایس۔ جی۔ پی۔ جی۔ آئی، رائے بریلی روڈ، لکھنؤ۔ قیمت ایک سو پچھتر روپے

مٹھی بھر سانپ

ڈاکٹر سلیم اختر کی کہانیوں کا مجموعہ

احمد ہمیش | تحریری مطالعہ

منٹو اپنی زندگی کسی مغربی ملک میں نہیں، بر صغیر میں گزار رہا تھا۔ منٹو کی ذات کوئی دوسری ذات نہیں، اس کی اپنی ذات تھی۔ منٹو کی کہانیوں کا اسلوب اسکی زندگی سے بنا تھا۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر اپنی زندگی کسی مغربی ملک میں نہیں، بر صغیر میں گزار رہے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی ذات ان کی اپنی ذات ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کہانیوں کا اسلوب ان کی زندگی سے بنا ہے۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ منٹو کی کہانیوں کے ناقدین نے منٹو کو بر صغیر سے، منٹو کو اسکی زندگی سے، منٹو کو اس کی ذات سے اور منٹو کو اس کی کہانیوں کے اسلوب سے نکال باہر کیا۔ معلوم ہوا کہ منٹو اپنے خطہ سے، اپنی زندگی سے، اپنی ذات سے اور اپنی کہانیوں کے اسلوب سے باہر نفسیات کی مغربی اصطلاحات اور شارٹ اسٹوری کے مغربی اکابرین کے زیر اثر کہانیاں لکھ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر کی کہانیوں کے ناقدین ڈاکٹر سلیم اختر کو ان کی زندگی سے، ان کی ذات سے، اور ان کے اسلوب سے باہر نکال رہے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت کہانی کار بدائی کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کہانیوں کے مجموعہ "مٹھی بھر سانپ" میں شامل گیارہ کہانیوں، خاص طور پر مس احمد بی اے بی ٹی، سیفو، بنجر مرد زرخیز عورتیں، لولیتا، تختۂ دمشق، بار ہواں کھلاڑی اور پاؤں کی جنت میں جنسی غیر فطری فعل اور جنسی بد عنوانی کا تجربہ و مشاہدہ کہانی کار کے علاقہ، زندگی، ذات اور اسلوب کی تجربہ گاہ میں واقع ہوا ہے۔ مگر بہت برا ہوا جو انہوں نے دوسرے کی سند حاصل کرنے کے لئے مجموعہ میں مسعود اشعر اور مستنصر حسین تارڑ کے فضول لفظ شامل کر لئے۔ یہ حضرات مغربی حوالوں سے کہانی کے قاری کو بے سبب مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور ایک دھوکا دینے والی آسانی میں کہانی کے تنقید نگاروں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ناشر: دوکنزی بک ورنگ لاہور...... قیمت ۸۰ روپے

تعلق

ارشاد گرامی کا شعری مجموعہ

احمد ہمیش — تحریری مطالعہ

کیا ہی اچھا ہوتا کہ ارشاد گرامی نے جہاں اتنی اچھی شاعری کی، وہیں اپنے شعری مجموعہ "تعلق" کا پیش لفظ بھی خود لکھتے تو ان کی شاعری کا قاری زیادہ مستفید ہو سکتا۔ سو، مجموعہ میں سہیل اختر کے پیش لفظ کو شامل کرنا ضروری نہیں تھا۔ اب ذرا غور کیجئے کہ نعت گوئی کی تقدیس سے ماسوا ارشاد گرامی کے یہاں غزل کی شاعری انفرادی سطح پر ان کے علیحدہ مزاج کا پتہ دیتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ارشاد گرامی کے یہاں میر، مومن، حسرت اور جدید دور کے شعرا (نام کوٹ کرنا ضروری نہیں) کے کلام کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں لیکن اگر قدرے غور کیا جائے تو ارشاد گرامی نے غزل میں اپنا علیحدہ مزاج اختیار کرتے ہوئے ایک عمر ضرور گزاری۔ مثلاً یہ اشعار ۔

لوگوں کی آنکھ سے جو سمندر دکھائی دے\
مجھکو تو ایک قطرے سے کمتر دکھائی دے

چہروں کے سمندر میں کہیں ڈوب گیا ہے\
کھوئے ہوئے انساں کو ذرا ڈھونڈ کے لادو

یہ دور بہر طور ہے کچھ اور طرح کا\
یہ سانپ تو دیتا ہے خزانے نہیں دیتا

ایسے کئی اور اشعار ارشاد گرامی کی غزلوں میں ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کا یہ مزاج ان کی نظموں میں نکھر نہیں پایا۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی ارشاد گرامی کی شاعری دریافت کے دیانت دارانہ موقف کی مستحق ہے۔

ناشر۔ الرزاق پبلی کیشنز۔ ۲۰۷ عرفان چیمبرز ۱۳۰ میل روڈ لاہور۔۔۔ قیمت ۱۲۰ روپے

جب بارش کی پائل چھنکے
کلیم شہزاد کا شعری مجموعہ

انجلا ہمیش　　　　تحریری مطالعہ

کرب کلیم سموتے ہیں جو لفظوں میں　　درد سخنور آجاتے ہیں آنکھوں میں

ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر تو بہت لوگوں نے کہے ہیں۔ کہانیاں بہت لکھی گئی ہیں۔ مگر کبھی کبھی کوئی ایسی تخلیق سامنے آتی ہے جس کا ایک ایک لفظ قاری سے گویا ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ الفاظ بھی بڑا عجیب رول ادا کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر لکھنے والے کے اندر سموجائیں کچھ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا مگر اس کے باوجود وہ شعروادب میں اپنا کوئی خاص مقام نہیں بنا پائے اور ایسے بھی اہل قلم ہیں جنھوں نے کم لکھا مگر ان کا لکھا ہوا امر ہو گیا۔ یوں اس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ کس نے کتنا لکھا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ کس نے کیا اور کیسا لکھا اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔

ہمارے یہاں غزل بہت کہی گئی مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بیشتر شعرائے غزل نے ایک ہی انداز سے غزلیں کہیں اس سے دو نقصانات ہوئے ایک تو قاری ایک ہی انداز کو پڑھتے پڑھتے کوفت میں مبتلا ہو گیا دوسرا غزل کے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ غزل کی وجہ سے اردو شاعری بین الاقوامی سطح پر کوئی مقام نہیں بنا سکی جبکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ غزل چونکہ خاص مشرقی ماحول کی عکاسی کرتی ہے اس لئے مغرب کا مزاج اسے قبول نہ کر سکا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس صنف میں کچھ ایسی نامور ہستیاں بھی موجود ہیں جن کی شاعری میں بے حد انفرادیت اور خوبصورتی ہے۔

کلیم شہزاد غزل کے اچھے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری روایات اور جمالیات کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کا خاص چناؤ ہے، جیسا کہ ان کی غزل کے مجموعہ کا عنوان "جب بارش کی پائل چھنکے" سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کے انتخاب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

رفاقتوں کے امین لمحے جو رت جگوں میں سلگ رہے ہیں
سحاب چہروں کے رازداں تھے، تمازتوں میں سلگ رہے ہیں

ان کی شاعری ایسے ماحول کو پیش کرتی ہے جہاں رواداری بھی ہے، شرم ولحاظ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ

دل میں چھپی وہ امنگیں بھی ہیں جو ساری زندگی دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔

نصیب جن کا محبتیں تھیں، محبتوں میں سلگ رہے ہیں اُداسیوں کا لباس پہنے خموشیوں میں سلگ رہے ہیں

مگر اس کے باوجود شاعر کا تقاضہ ہے کہ سوچ پر پابندی نہیں ہونی چاہیے۔

کون جو دریا کی لہروں سے لڑتا تھا آخری سانسوں تلک

اور چناب عشق میں کچے گھڑے کس نے اُتارے سوچنا

مگر یونس متین کا یہ خیال کہ "وہ (کلیم شنزاد) ہر لفظ کے مقام سے بخوبی آشنا ہے" غلط خیال ہے۔ جیسے کہ ان کا یہ شعر دیکھیے۔

کلیم ہے یہ عطا اُسی کی لباس خوشبو سلا جو مجھ کو اسی کے باعث حیات میری کا لمحہ لمحہ نکھر رہا ہے

اس کا دوسرا مصرعہ صرف ایک لفظ کے غلط مقام پر ہونے کی وجہ سے بے ربط ہو گیا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا

۔ اسی کے باعث میری حیات کا لمحہ لمحہ نکھر رہا ہے

یعنی لفظ "حیات" لفظ "میری" کے بعد ہونا چاہیے تھا

ٹھیک ہے لکھنے والوں نے زبان کی قواعد کو خاطر میں نہ لا کر بے مثل تحریریں لکھیں مگر قواعد کو خاطر میں نہ لا کر بھی لکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ جیسے کلیم شنزاد کا یہ مصرعہ قواعد کے اعتبار سے غلط ہونے کی وجہ سے پورا شعر خبط ہو گیا ہے۔

مجھ کو وفا کے جرم کی ایسی سزا ملی میرا وجود آتشیں برفوں میں جل اُٹھا

برف کی کوئی جمع نہیں ہوتی۔ برف کو دونوں صورتوں (واحد جمع) میں برف ہی کہا جائے گا۔

بعض شاعر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یا تو کہہ نہیں پاتے یا اُن کا کہا ہوا قاری کے دل میں اتر نہیں پاتا۔

کچھ پتہ ان کا چلا اے ہمدمو! پرچم جاں تھام کر تھے، جو گئے

دراصل یہ شعر بالکل بے بحر ہے اور اس کا کوئی معنی اور مفہوم نہیں۔ بہر حال کلیم شنزاد نے بارش کی پائل تو خوب چھنکائی قطع نظر اس کے کہ چھنکنے کے ساتھ ساتھ یہ پائل کہیں کہیں بے سُری بھی رہی۔

برائے رابطہ:۔ آفس: لالہ اکیڈمی ۵۴۳ - ایم اوورے والا۔ قیمت: سو روپے

بے لباس موسم
اجمل اعجاز کے افسانوں کا مجموعہ

سحر علی — تحریری مطالعہ

اجمل اعجاز کی کہانیوں کا مجموعہ "بے لباس موسم" پڑھ کر قاری چونکے یا نہ چونکے مگر خود کو ان کی کہانیوں کے کردار میں ڈھونڈتا ہوا ضرور ملے گا، تحریر کا کھرا پن ہی اس کو مصنف کے دل کی دھڑکن سے ہوتے ہوئے قاری کی دھڑکنوں میں سموتی ہے۔ اعجاز صاحب کا وصف فنی نگاہ سے بے شک کہیں کم اور کہیں زیادہ رہ گیا ہو مگر انہوں نے محض جذباتی تاویلیں نہیں پیش کی ہیں بلکہ قاری کے مسائلِ حیات، ان کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو لے کر دعوتِ فکر دی ہے۔

ان کی کہانیوں میں بہت سے ایسے مناظر دیکھنے میں ملتے ہیں جو غور کرنے پر بہت سی نفسیاتی گرہیں کھولتے ہیں۔ اعجاز صاحب کی کہانی "پتھر روتے ہیں" میں کہانی کا اسلوب بہت حد تک غیر فطری اور طلسماتی بلکہ معجزاتی ہے مگر اس سے قطع نظر، محبت اور ضرورت کے المناک پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔

اعجاز صاحب کا کردار "فلسفی" اپنی پوری توانائی کے ساتھ کہانی میں موجود ہے اور لڑکی کے ہاتھ میں نیلا رومال خزاں کے ہونٹوں پہ آنے والی پہلی مسکراہٹ کا استعارہ ہے، کہانی کی بنت میں قاری الجھا ہوا خود کو نہیں پائے گا۔ "سب کی بھابھی" میں معاشرے کی بے حسی اور محرومی کو موضوع بنایا گیا ہے، جہاں مجبوری تمام اقدار کو پامال کرتی نظر آتی ہے اس کہانی میں عہد حاضر کی بحرانی، مایوسی اور کشمکش کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ "وہ اب بھی میرا ہے" موضوع کے اعتبار سے اس میں کوئی ایسا نیا پن تو نہیں ہے لیکن اسلوب اور تکنیک نے اس کو ایک ہی نشست میں پڑھ لینے والی کہانی ضرور بنادی ہے، مرد کی بے وفائی اور عورت کی وفا کے مابین ...... عورت کی وفا سر خرو رہتی ہے۔ عورت کی مظلومیت کو محسوس کرنے کے باوجود اجمل اعجاز زیادہ تر مرد ہی کے فریق نظر آتے ہیں۔ خوش کن بات یہ ہے کہ اجمل اعجاز کے فن میں سماج کے صحت مند مستقبل اور ترقی کی امید افزا جھلک ملتی ہے۔

رابطہ: الاعظم ایجوکیشن ہاؤس نزد تلک چاڑھی، فوجداری روڈ حیدرآباد سندھ (سندھ) قیمت: ۹۹ روپے

موصولہ کتب برائے تحریری مطالعہ

انتخاب غزلیاتِ فراق : انتخاب وترتیب : کالی داس گپتا رضا : ساکار پبلشرز۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۱۱ (بھارت)

ابھی ناؤ نہ باندھو : مجموعہ غزلیات : کالی داس گپتا رضا : سارکا پبلشرز۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۱۱ (بھارت)

حرفِ خطِ کشیدہ : شعری مجموعہ : ستار صدیقی : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲ (بھارت)

میری محبتیں : خاکے اور یادیں : حیدر قریشی : معیار پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱ (بھارت)

پیش کش : شعری مجموعہ : شاہد نقوی : شاد پرنٹرز۔ ناظم آباد۔ کراچی (پاکستان)

ایش ٹرے : شعری مجموعہ : شکیل اعظمی : معیار پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱ (بھارت)

صبح آنے کو ہے : شعری مجموعہ : عشرت رومانی : بزمِ تخلیق ادب پاکستان۔ کراچی (پاکستان)

جہانِ حمد : انتخاب : طاہر سلطانی : جہانِ حمد پبلشرز۔ کراچی (پاکستان)

رت جگا : شعری مجموعہ : رفیق خیال : فرید پبلشرز۔ کراچی (پاکستان)

ارضِ بے پیغمبر : شعری مجموعہ : مظہر مہدی : مکتبہ شعر و حکمت۔ حیدر آباد۔ آندھرا پردیش (بھارت)

سارا جہاں آئینہ ہے : شعری مجموعہ : فہیم شناس کاظمی : فکشن ہاؤس۔ لاہور (پاکستان)

اجنبی ساعتوں کے درمیان : شعری مجموعہ : نعمان شوق : تخلیق پبلشرز نئی دہلی (بھارت)

آگہی : شعری مجموعہ : ابراہیم اشک : تکمیل پبلی کیشنز۔ بمبئی (بھارت)

"کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز" طبع زاد ڈرامہ : زاہدہ زیدی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (بھارت)

آنکھ جو سوچتی ہے : ناول : کوثر مظہری : علی سنز پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ۲۵ (بھارت)

مستقبل آنجہ سے ملِ : شعری مجموعہ : ستیہ پال آنند : انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲ (بھارت)

شہرِ بے اماں : شعری مجموعہ : نزہت افتخار : گلشن اقبال کراچی۔ (پاکستان)

امریکہ میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو اعزاز

انہیں شہر ولمنگٹن میں یکم اپریل ۲۰۰۰ء کو پوئٹری فیسٹول میں بطور ڈائرکٹر پوئٹری ورکشاپ کے مدعو کیا گیا۔ ولمنگٹن (ڈیلاویئر) کے میئر نے شہر کی سیل (مہر) پیش کی۔

(ڈاکٹر عبداللہ۔ چیرمین مشاعرہ کمیٹی)

منتخب خطوط

بہت ہی زیادہ سچ لکھنے کے بعد
کبھی کبھار میرا دل چاہتا ہے
مَیں تھوڑا جھوٹ لکھوں

مَیں لکھوں کہ رات کو مَیں نے
اپنے گھر کو کہکشاں کی مانند چمکتے دیکھا ہے
سارے خوش رنگ، مہکتے خواب
میری دہلیز پر سجدہ ریز ہیں
مَیں یہ لکھوں کہ مجھے کوئی دکھ یا غم نہیں
کیونکہ سارے جہاں کی چاہتیں
محبتوں کے خدا نے میرے نام کر دی ہیں

ناجیہ احمد کی نظم ''کچھ جھوٹ'' کی ابتدائی سطریں

برجیس صدیقی کے نام

پیارے احمد ہمیش
سلام مستحق

میں نے تشکیل کا مطالعہ کیا اب تک تو یہی اندازہ ہوا ہے کہ تم نے اس کے معیار اور سطح کو بر قرار رکھا ہے۔ نہ ترقی ہے نہ تنزل۔ یہ بھی بہت ہے ...... کاوش صاحب کی غزل دیکھی۔ استادانہ خلاقی کی اچھی مثال ہے۔ مترادفات کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ زبان پر قدرت اسی کو کہتے ہیں۔

والسلام حنیف اسعدی
کراچی۔ پاکستان

محترم احمد ہمیش صاحب سلام مسنون

تشکیل ملا۔ شکر گزار ہوں۔ انجلا ہمیش کا نام میں کافی دنوں سے سن اور پڑھ رہا تھا مگر سچ مچ ان کا قلم بہت بلوان ہے۔ میری کتاب "مٹی مدنی" پر ان کا تبصرہ بہت عمیق اور فاضلانہ ہے۔ انھوں نے مجھے کافی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ تبصرہ میں بلیا، 1942ء کا اندولن، بہادری، حب الوطنی، سر فروشی اور قربانی اور چتو پانڈے، مولانا آزاد سبحانی، نشور واحدی، عارف بلیاوی، فاروق بانسپاری، قمر جمیل اور محبوب خزاں کا ذکر بہت والہانہ ہے۔ ان معتبر اہل علم کی دانش اور ان کا لہو مجھے سر خرو کر گیا۔ بھئی بہت اعلیٰ ادبی و فکری تبصرہ ہے۔ یہاں بنارس الہ آباد، اعظم گڑھ گورکھپور کے ادبی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا ہے۔ جس نے بھی یہ تبصرہ پڑھا وہ انجلا ہمیش کے زور قلم کا گرویدہ ہو گیا۔ بلیا کے ایک ہندی رسالے میں اس کا ہندی میں ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ گویا یہ تبصرہ اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔ آپ کی منفرد سوانح 'مکر چاندنی' بھی یہاں ان حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ ہندی کا ایک رسالہ بھی اس کا ہندی ترجمہ شائع کرنا چاہتا ہے۔ گویا آپ دونوں باپ بیٹی نے اردو ادب میں کمال کر دکھایا ہے۔

آپ کا
آفتاب احمد تسکین واحدی بلیا۔ بھارت

مکرمی احمد ہمیش صاحب تسلیم

شمارہ ۳۵ موصول ہوا۔ "تشکیل" شاید اپنی طرز کا واحد جریدہ ہے۔ جس میں گھسے پٹے موضوعات سے الگ ہو کر لکھا جاتا ہے۔ اب کے بھی اس شمارے میں ایسا بہت کچھ موجود ہے جسے نہ پڑھ سکنے کے باوجود پڑھنا پڑھتا ہے۔ مبارکباد۔

مخلص کالی داس گپتا رضا
ممبئی۔ بھارت

برادرم احمد ہمیش
مزاج

میں نے دسمبر کا پورا مہینہ انڈیا میں گذارا، غالب انسٹی ٹیوٹ میں دہلی میں میر تقی میر سیمنار کے لئے مجھے بلایا تھا دہلی کے بعد لکھنؤ سے علی گڑھ اور ھزاری باغ کاتک کا پھیرا لگا آئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہاں کی ادبی محفلوں میں آپ کا، تشکیل کا اور "کبھی" کا ذکر سننے کا ملا۔ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ کام کیا ہوا ضائع نہیں جاتا، گھر والوں کے تعصب یا دشمنی کا توڑ باہر والوں کی اچھی رائے بنتی ہے

کیونکہ ذات کے بر عکس یہ صرف تخلیق کا بارے میں ہوتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہزاری باغ جیسے دور افتادہ علاقہ میں بھی آپ کا شہرہ پہنچا ہوا تھا۔ تشکیل کا تازہ شمارہ مل چکا ہے اور یہ حسب روایت "شاک انگیز" ہے۔ اللہ! کرنٹ میں اضافہ کرتا رہے...... آمین!

مخلص سلیم اختر

لاہور۔ پاکستان

محترم بھائی احمد ہمیش!

"تشکیل" نظروں سے گزرتا رہا ہے، آپ کی تیغ برہنہ کا قائل ہوں۔ "تشکیل" کے مشمولات پر آپ کی پسند کی گہری چھاپ ہے اور یہ چھاپ یقیناً بہت معیاری ہے خاص طور پر افسانوں کا انتخاب...... "مکر چاندنی" کو پتہ نہیں آپ کس بلندی پر لے جائیں گے۔ جذبات سے اس قدر بھر پور اور جزئیات کی اتنی تفصیل...... آپ کے ساتھ چلنے میں بار بار آنسو پونچھنے پڑتے ہیں۔ خدا آپ کو طاقت عطا فرمائے۔

آپ کا عبدالصمد

پٹنہ۔ بھارت

جناب احمد ہمیش

سلام مسنون

"تشکیل" کو دیر سے آیا ہے مگر اپنی گذشتہ روایت اور معیار کو قائم رکھے، اسی آب و تاب سے آیا ہے۔ آپ کا اداریہ اور نظمیں اس پر مستزاد ہیں اور "مکر چاندنی" تو ہے ہی! اس کے ہونے میں آراء ہو ہی نہیں سکتیں۔ جناب کاوش عمر کی بحر متدارک مثمن سالم (Raise to the power two)، میں کہی گئی غزل کا جواب نہیں۔ یعنی ہر شعر میں رکن "فاعلن" سولہ مرتبہ آیا ہے جبکہ بارہ اشعار کی مرصع غزل کے ہر شعر کے مصرع اولیٰ کے دعویٰ کے جواب میں مصرع ثانی میں جو ضروریات (Requirments) گنوائی گئی ہیں وہ اپنا جواب آپ ہیں یعنی لاجواب ہیں کہ واقعی لاجواب کر دیتی ہیں۔ مقطع میں ان کا دعویٰ شاعرانہ تعلی نہیں لگتا بلکہ مفکرانہ تمکن دکھائی دیتا ہے۔ جناب فضیل جعفری کا مضمون "سلیم احمد بطور ایک نقاد" جہاں تنقید برائے ارزاں شہرت کا ایک واضح نمونہ ہے وہاں ایک گراں قدر دلالت بھی ہے۔

فقط مخلص دل نواز دل

لاہور۔ پاکستان

تشکیل شمارہ نمبر ۳۲ تا ۳۵ تبصرہ

سب سے پہلے اداریہ کے متعلق کچھ باتیں کروں گا۔ آپ نے تخلیقی وجود کو امر کہا ہے۔ اس سلسلے میں میں اتنا ہی کہوں گا کہ عہد حاضر میں بے وحدتی اور بے بصیرتی نے زندگی کی قدروں اور اصولوں کو پامال کر دیا ہے الفاظ مسخ ہو گئے ہیں، خیال دھندلا گئے ہیں اور زندگی کی قوتوں کے سرچشمے خشک ہو گئے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سائے میں جو تمازت تھی۔ بہر حال تخلیقی وجود کو اپنے اوداراور علاقے سرشت سمجھنے میں جو کچھ لوگ پر چاپتی نہیں ہیں! معمولی عوام ہیں۔ اب کچھ باتیں تشکیل کے اس حصے کی جس میں منفرد کہانیاں ہیں۔ اب جب کہ سویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور سپر پاور کا دیوا اپنے پنجے گاڑ رہا ہے زندگی سود در سود

نئے عالمی نظام کے شکنجے میں ہے تو تیسری دنیا کے مسائل نے مشترکہ احساس کو سامنے لا کر ابلاغ کو اہم کر دیا ہے جس میں تجربے ختم ہوتے جا رہے ہیں کچھ ایسی ہی بات اقبال مجید کی کہانی "سوختہ ساماں" میں ہے۔ محمد الیاس نے جو کہانی پیش کی ہے وہ حقیقت پسند اور بیانیہ ہے۔ خود کلامی، رمزیت اور تلازمہ خیال سے سماجی معنویت کو سامنے لا کر تخلیقی سطح پر نئے رویوں کا اظہار کیا ہے۔ تشکیل کے اس شمارے میں نیر جہاں، صفیہ صدیقی، عرفان احمد عرفی، ارشد رضوی، شاہانہ ایلیا، عبدالرشید حواری، اجمل اعجاز اور سحر علی کی کہانیاں انسانی دردمندیوں سے چور ہیں جن میں موضوعیت اور داخلی بحران کے لحاظ سے خیال کی وہ تحلیل ہیں جنہیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر چھو نہیں سکتے!! سحر علی کا فن ابھی ابتدائی دور میں ہے لیکن ان کے یہاں فنی استحکام ہے۔ میں بہت پُر امید ہوں کہ کہانی کی روایت کو وہ زیادہ مستحکم کریں گی۔ تشکیل میں جو نظمیں ہیں متنوع جذبات اور مواد تو ہیں مگر پیرایۂ بیان اور ہیئت میں اس دور کے مشاہدوں کی گہرائی میں کچھ کمی ہے۔ لیکن زیادہ بھی نہیں

عشرت رومانی
کراچی۔ پاکستان

عزیز دوست۔ احمد ہمیش

تشکیل پر اپنا نام دیکھ کر I was so touched کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس پر بیدل کا شعر اور انسان نما جلتی ہوئی شمع کا خاکہ...... تمہارے خلوص و محبت کا کیا جواب دوں؟؟ ویسے میں ان لوگوں کی بہت قدر کرتی ہوں جو گاہے گاہے جھوٹ سے پردہ اٹھاتے رہتے ہیں (جن میں تم ایک اہم نام ہو۔ بہت اہم) (اس سلسلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تشکیل (35۔32) میں ابراہیم اشک کا جو خط چھپا ہے وہ نہایت غیر مہذب بلکہ رکیک ہے اس طرح کے خطوط کو discorage کیا جا سکتا ہے...... اور شہاب اختر جیسی نثری نظموں کو جو سوائے بھونڈی اور سستی نمائش کے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں، کہاں شاعری اور کہاں یہ مہمل تحریریں) جو کچھ تم تخلیقی وجود کی نسبت سے کہتے ہو دل کو لگتا ہے۔ گہری معنویت رکھتا ہے۔ اب اسی شمارے میں "تخلیقی وجود امر ہے" کا پہلا پیرے گراف کتنا خوبصورت ہے ایک ایک جملہ دل میں اتر جاتا ہے۔ اور کتنی ایمائیت اور اختصار سے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے......

مگر چاندنی حسب معمول دلکش ہے۔ کہانیاں تقریباً سب قابل مطالعہ ہیں منظومات میں، رحمان فراز، رفیق سندیلوی، شاہین مفتی، رونق حیات، سحر علی (نثری نظم) احمد ہمیش (نثری نظم) اور پابلو نرودا (ترجمہ ضمیر احمد) ولیم ہنری ڈیویز (ترجمہ سیدہ منیرہ نزہت) اچھی نظمیں ہیں۔ آخر الذکر تین منظومات بہت اچھی ہیں۔ اگر کسی کو نثری نظم لکھنی ہی ہے تو پھر ایسی تو لکھے (اپنے جیسے عاشقوں کے نام)۔ یعنی معنویت اور گہرائی تو ہو اوزان و عروض نہ سہی۔ فضیل جعفری کا مضمون بڑی محنت سے لکھا ہوا ہے۔ اور ان کے موقف کا بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ ریاض صدیقی اور ابراہیم اشک کے مضامین کی شروعات موثر ہیں۔ اور "کہانی کی تاریخ" حسب سابق ایک تخلیقی ذہن کی پیداوار ہے۔ منفرد ہے۔ کتنی مشکلات کے درمیان اور کس قدر توجہ سے محنت اور لگن سے تم تشکیل نکال رہے ہو، ایک قابل ستائش عزم کی منفرد کہانی ہے پھر اس کے دور ہوس پرستی میں، ہوسِ اقتدار اور مصلحت کے سکون بمارے دامن بچانا...... جہاد نہیں تو کیا ہے۔

تم اپنے روشن ضمیر کو منفعت کے آزار سے بچانا
تم اپنے شعلے کو مصلحت کے سکون بمارے بچانا

تم اپنے دل...... اس خدا کے گھر کو ہوس پرستی کے سخت اجبار سے بچانا
اور اس وقت یہ مصرعے یاد آگئے تو تمہیں لکھ دئے۔

ہاں احمد ہمیش۔ ابھی ایک چیز پر نظر پڑی، سوچا وضاحت کر دوں...... تم نے اپنے ادارئے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا حالی نے راست پیروئی مغربی اختیار کی تو معلوم ہوا کہ تنقید میں ذہنی غلامی کی بنیاد پڑی...... اور آگے...... تو ظاہر ہے کہ اس کے پس منظر میں مراعات کا حصول ہی تو تھا...... (اس ضمن میں ڈپٹی نظیر احمد اور محمد حسین آزاد کے نام بھی ہیں)...... تو اس سلسلے میں مجھے خواجہ الطاف حسین حالی کے تعلق سے یہ کہنا ہے...... (کیونکہ وہ میرے جد امجد تھے اور میں ان کی شخصیت، اور ان کے اخلاقی اور تہذیبی پس منظر سے واقف ہوں۔ جہاں تک حالی کی تنقید کا تعلق ہے اہل نظر جانتے ہیں اردو میں آج تک مقدمہ شعر و شاعری سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور وہ ذہنی غلامی کی نہیں بلکہ اردو ادب میں چند دریچے وا کرنے کی ابتدا تھی اور حالی نے یہ بنیاد اپنی شاعری بلکہ اپنی مقبولیت کو داؤ پر لگا کر کیا تھا۔ رہا مراعات کا سوال تو وہ جس خاندان سے تھے وہاں دنیاوی جاہ و حشم، عیش پرستی، مال و زر بعد مراعات کی کوئی جگہ نہ تھی، میں نے حالی کا شہر، حالی کا گھر اور اس کے گھر کے رہن سہن کا طریقہ دیکھا ہے (سادگی، کفایت، شرافت، اور بڑی حد تک Austeritly عسرت میں سربلندی اس گھر اور خاندان کا شیوہ تھا حالی پہلی بار غالب سے ملنے کے لئے پانی پت سے دہلی پیدل گئے تھے، دو دن دو رات کا سفر طے کیا اور راستے میں جب رات آئی لب سڑک سرہانے اینٹ رکھ کر سو رہے۔ صبح فجر کی نماز سڑک پر ادا کی اور چلائے...... "یہاں سے یادگار غالب کی ابتدا ہوئی ہے"۔ واضح رہے کہ غالب نے اپنے تمام شاگرد و دوستوں کو محبت بھرے خطوط لکھے جبکہ حالی کو کبھی خط نہیں لکھا۔ غالب پہ تمام کام حالی کی بے نفسی کا شاہد ہے۔ محض tone of, Commitment labour اور کچھ نہیں۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ"...... آج کل نقادوں میں حالی کی تضحیک کا فیشن سا چل گیا۔ جس کی ابتدا وارث علوی نے اپنے پھکڑ انداز میں "مفلر والے حالی" لکھ کر کی تھی۔ ظاہر ہے وارث علوی کو حالی کی شاعری اور تنقید کیا یاد رہتی البتہ ان کا مفلر یاد رہ گیا۔

مخلص اور خیر اندیش تمہاری دوست ساجدہ زیدی
علیگڑھ۔ بھارت

مکرمی احمد ہمیش صاحب آداب عرض

کچھ دن پہلے تشکیل کا نیا شمارہ (۳۲ تا ۳۵) موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ اور میری طرف سے دلی مبارکباد بھی قبول کیجئے کہ آپ مسائل اور مشکلات پر قابو پا کر آخر کار یہ شمارہ پورے اہتمام اور خلوص کے ساتھ منظر عام پر لانے میں کامیاب رہے۔ سب مشمولات تو نہیں پڑھی ہیں لیکن بیشتر پڑھ چکی ہوں۔ شعری حصہ پورا پڑھا مجموعی تاثر اچھا ہے (کچھ نثری نظموں کو چھوڑ کر) اور اس میں رحمان فراز، شاہین مفتی، سلیم انصاری اور ابراہیم اشک کی تخلیقات بہتر معلوم ہوئیں۔ آپ کی سوانح "مگر چاندنی" کا ساتواں باب بھی پڑھا یہ بہت دلچسپ اور اثر آفریں معلوم ہوا مضامین میں فضیل جعفری کا مضمون "سلیم احمد بطور نقاد" اور ابراہیم اشک کا مضمون "غالب اور بیدل" بہت خوب اور فکر پرور ہیں۔ ریاض صدیقی کا مضمون "اردو شعر و ادب بیسویں صدی کے تناظر میں" (جو کسی طویل مقالے کا ایک حصہ ہے) بھی خاصا دلچسپ ہے اور وہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ آپ کا "تخلیقی وجود امر ہے" بھی دلچسپ ہے اور جو مسائل آپ نے اس میں اٹھائے ہیں وہ غور طلب اور بحث طلب ہیں البتہ آپ کے مختصر مضمون "نظیر اکبر آبادی" (ہماری کی کہانی کی تاریخ۔

۱۱) صفحہ 246 میں کچھ غلطیاں محسوس ہوئیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ اول تو یہ کہ ورڈزورتھ کا سال پیدائش 1770ء ضرور ہے جیسا آپ نے لکھا ہے لیکن سال وفات 1832 نہیں بلکہ 1850 ہے۔ دوسرے یہ کہ وڈزورتھ کی بیشتر شاعری Ballad کے فورم میں نہیں بلکہ انکی شاعری کی صرف ایک کتاب Lyrical Ballads جو تجریدی نوعیت کی ہے اور جس میں کولرج کی بھی کچھ نظمیں شامل ہیں Ballad کے فورم سے قریب ہے۔ اس میں بیشتر دیہاتی زندگی کے مرقعے ہیں جن میں ایک حساس حقیقت نگار کا عکس بھی ہے (اور جو 1800 میں شائع ہوئی تھی)۔ لیکن وڈزورتھ کی وہ شاعری جس پر ان کی عظمت کی مہر ثبت ہے Ballad کے فورم میں نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ نظیر اکبر آبادی نے سب سے پہلے اس قسم کی شاعری کی ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے نظیر اکبر آبادی کی اہمیت پر حرف نہیں آتا۔ البتہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ نظیر اکبر آبادی سے بہت پہلے چوسر Chaucer نے خاص طور سے Canterbury Tales* میں جو شاعری کی تھی اس کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور اس طویل تخلیق کا "ابتدایہ" (Prologue) تو ایک ایسا عظیم الشان آدمی نامہ ہے جو فنی اور معنوی اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کی شاعری سے بلند تر ہے۔

مخلص زاہدہ زیدی

علیگڑھ۔ بھارت

*(1400-?1340) Geoffrey Chaucer نے The Canterbury Tales کے مطابق سن وعن کہی ہوئی کہانیاں سن کے چوسر نے حقیقی پیرائے میں بیان کر دیا۔ یہ کہانیاں چوسر کی عہد کی سوسائٹی کی جسم وروح کی حقیقی کہانیاں ہیں۔ چوسر کا تصورِ حقیقت نظیر اکبر آبادی کے تصورِ حقیقت سے مختلف ہے۔ جبکہ چوسر نے فارسی مثنویوں کی بحر و آہنگ کے اتباع میں The Canterbury Tales لکھی۔ ملاحظہ فرمائیے یہ سطریں:

Of fustyan he werede a gepoun

Al bysmotered with his habergeoun

ظاہر ہے، فارسی مثنوی کی فارم میں لکھی ہوئی چوسر کی محولہ سطریں نظیر اکبر آبادی کی اردو نظم کی فارم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں (ادارہ)

بھائی احمد ہمیش۔ آداب

مجھے افسوس ہے کہ میں نے تشکیل کی وصولی کی رسید نہیں بھیجی میں ان دنوں بہت مصروف رہا۔ بیمار بھی رہا جو ایک خاص قسم کی مصروفیت ہے۔ اب مجھ سے خطوط کے جواب نہیں بن پاتے۔ ذہنِ جدید والے مضمون کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا اس پر مزید وضاحت کی ضرورت مجھے نہیں لگتی۔ میری ایک خراب عادت ہے کہ چیز لکھ کر بھول جاتا ہوں*۔ بعد گئی رات گئی والا معاملہ ہے۔ وہ مضمون اب میں بھول چکا ہوں اور ایسا کوئی اور مضمون اب میرے ذہن میں نہیں۔ یار ہم لکھنے والوں کی بھی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہم چھٹ بھئے قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی فرم تھوڑی چلاتے ہیں کہ ہر چیز کا حساب رکھیں اور روابط میں چاق وچوبند رہیں۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔

وارث علوی

احمد آباد۔ بھارت

*اس تجاہلِ عارفانہ پہ غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں ۔۔۔ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا (ادارہ)

بھائی ہمیش !مزاج گرامی

تشکیل میرے ہاتھ میں ہے اور میں خوشی اور حیرت میں غرق۔ اداریہ ایک ہی نشست میں نہیں پڑھا بلکہ آہستہ آہستہ پورے دن میں نمٹایا۔ واقعی کمال کر دیا...... بھائی ہمیش! تشکیل کو ہر زاویے سے جانچا۔ پرکھا تب معلوم ہوا کہ آپ رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے کیا عذاب جھیل رہے ہونگے۔ میں قاری ہونے کی حیثیت سے آپ کی ہمت کی داد دے سکتی ہوں خونِ جگر پلانا پڑتا ہوگا...... تشکیل کو زندہ رہنا ہوگا چونکہ اسے جنم دینے والا ہر لمحہ کرب کی منزل سے گزرتا ہے۔ بھائی ہمیش! کہنا یہ چاہتی ہوں کہ "تشکیل" نے بہت متاثر کیا......

فقط شاہانہ ایلیا
کراچی۔ پاکستان

بہت پیارے بھائی احمد ہمیش

سلام مسنون

آپ نے ہندی افسانہ نگاروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے مجھے اتفاق ہے۔ ہندی والوں نے اللہ جانے کس وجہ سے اردو افسانے کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، جیلانی بانو بس ان ہی افسانہ نگاروں کو پزیرائی ملی ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی کافی مقبول ہیں ہندی والوں میں۔ ہندی کہانی کا مزاج کچھ الگ ہے پریم چند کا بیانیہ زیادہ پسند کیا گیا ہے ہندی میں۔

میں کان پور میں سب سے الگ تھلگ ہوں جبکہ ہندی، اردو، انگریزی ادب کے مراکز دلی، الہ باد وغیرہ ہیں۔ میرا ہندی والوں سے اتنا رابطہ نہیں جو ہونا چاہیئے اس کی وجہ کان پور اور صرف کان پور ہے۔

ہندی میں 'ہنس' کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس اتنے منظور شدہ افسانے ہیں جو وہ تین سال تک شائع کر سکتے ہیں۔ ہر روز 40-30 افسانے موصول ہوتے ہیں۔ ہندی میں بھی ان کے افسانے شائع ہوتے ہیں جو قاری میں مقبول ہیں یا جن سے ایڈیٹر صاحب کو کوئی فائدہ ہو...... ان حالات میں اردو والوں کو کون پوچھے گا۔ کم از کم مجھے بہت تلخ تجربات ہوئے ہیں اس سلسلے میں۔

شانی مرحوم نے رسالہ 'کہانی' شائع کرنا شروع کیا وہ بہت روشن خیال اور مخلص افسانہ نگار تھے۔ کھرے پٹھان تھے افسوس کہ پہلے شمارے کے بعد ہی ناشران سے ان کی ٹھن گئی۔ پھر وہ بیمار ہو گئے بعد میں وفات۔

ازراہ نوازش آپ اس سلسلے میں کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا۔

مخلص حیدر جعفری سید
کان پور۔ بھارت

محترمی! سلام ورحمت

حضور والا! 'مگر چاندنی' کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہم دونوں کا ایک غم تو مشترک ہے ہی وہ یہ کہ ہم دونوں کو اپنے اپنے گاؤں سے اکھاڑ کر کہیں اور لگا دیا گیا ہے۔ گاؤں چھوڑتے ہی میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا اور اب ان لمحوں کو یاد کر کے پشیمانی نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کی تازگی اور فخر کا احساس ہوتا ہے آپ کو بھی ایسی یادیں اور اشک بہاناں مبارک ہوں کہ یہ سب کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔

آپ نے جو لاٹھی اٹھائی ہے اس کی نیت پر بھلا شک کرنے والا میں کون ہوتا ہوں؟ آپ کا مقصد بھی اعلیٰ

ہے کہ بدیانتی ہمارے یہاں بھی ہوئی ہے۔ میں آپ کے اس جہاد میں آپ کے ساتھ ہوں مگر آپ سے چھوٹا ہونے کے سبب گذارش ضرور کروں گا کہ تلخیوں کو تھوڑا نرم ضرور کر دیجئے آپ تخلیق کا اول و آخر ہیں۔
آپ بڑے بڑوں پر اتنی زبردست لاٹھیاں بھانجتے ہیں کہ حیرت ہے مجر آپ اپنی توانائی ان سب چیزوں پر کیوں خرچ کر دیتے ہیں؟ 'مکر چاندنی' کے بعض حصوں کو پڑھا تھا کئی جگہ آپ کی تحریر آنکھوں کو نم کر گئی۔ یہ سلسلہ بہت خوب ہے۔

والسلام نیازمند عنبر بہرائچی
لکھنو۔ بھارت

بھائی احمد ہمیش اسلام علیکم!
نیر آپا نے 'تشکیل' کا تازہ شمارہ بھجوادیا ہے شکریہ۔ آج ہی پڑھ کر ختم کیا۔ 'تخلیقی وجود امر ہے' اچھا لگا۔ اس کے علاوہ محمد الیاس، نیر جہاں اور شاہانہ ایلیا کی کہانیاں بھی دل کو بھائیں۔ پریم پرکاش کی کہانی کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ سب سے اچھا مضمون ریاض صدیقی کا ہے انہوں نے اردو شعر و ادب بیسویں صدی کے تناظر میں! بہت سچائی سے وہ باتیں اور المناک پس منظر پیش کر دیا جو بہت کم لوگ بیان کر پاتے ہیں۔ میں نے 'ہماری کہانی کی تاریخ ۱۱' حسب سابق دلچسپی سے پڑھی کئی نئے انکشاف ہوئے۔ ماشاءاللہ، سبحان اللہ، واہ واہ راغب تحسین نے آغا گل اور انجلا ہمیش نے احد خان امن کے افسانے پر اچھے تبصرے لکھے ہیں۔
احمد سہیل
پلسٹائین۔ امریکہ

پیارے احمد ہمیش!
سلام نیاز و محبت
......اداریہ کئی مرتبہ پڑھا۔ یہ تحریر صدیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں ان گنت افسانے مضمر ہیں۔
......خاطر جمع رکھیں۔ آپ کا جو تا چوری ہو بھی گیا تو کسی کے کام نہیں آئے گا۔ اپنی منفرد خصوصیات کے باعث موزیک پر بھی نقش چھوڑ جائے گا اور ریت پر بھی اس کی چاپ سنائی دے گی۔ اول تو یہ کج فہم چور کے پاؤں شکنجے کی طرح جکڑ لے گا۔ بعید نہیں کہ ٹخنوں سے کاٹ کر نجات حاصل کرنی پڑے۔
......بھارت کا ہاتھی ہر دور میں زندہ رہا ہو گا۔ مان لیا۔ لیکن حال ہی میں اپنا ہاتھی بے چارہ ابھی مرا تو نہیں تھا کہ اندر گھسے ہوئے گیدڑ پیٹھ پھاڑ کر نکل بھاگے۔ عبرت ناک انجام سامنے ہے جبکہ، کائیاں گیدڑ مزے میں مکر چاندنی نے بہت لطف دیا اور اداس بھی کر دیا۔ تشکیل میں شامل بیشتر تخلیقات معیاری ہیں۔ خوب سے خوب تر کے سفر پر گامزن۔ میں آپ کو ایسی تحریروں پر خراج تحسین پیش کرنے کے بجائے دعا دینا زیادہ پسند کروں گا کہ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

آپ کا الیاس
میرپور۔ آزاد کشمیر

پیارے بھائی احمد ہمیش
سلام و رحمت۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ متعدد مشکلات کے باعث تشکیل کی اشاعت خدا نخواستہ بند ہو گئی ہے اور جب شمارہ ملا تو یقین جانیے بے حد خوشی ہوئی۔ شاعری میں تو غالب باکمال اور بے مثال تھے ہی

انہوں نے نثر میں بھی منفرد اسلوب اختیار کیا بعینیہ آپکی نثر بھی منفرد اور بعد موثر ہے۔ وہ جو محسن بھوپالی نے کہا تھا کہ

ہماری جان پہ دہرا عذاب ہے محسنؔ
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

آپ گہری سوچ بچار کے بعد لکھتے ہیں اور پھر آپ کی تحریر قارئین کو بھی صمٌ بکمٌ اور آمنا و صدقنا سے نکل کر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ آپ کو یقیناً جو تا چوروں سے بچ کر کراچی کے سلگتے راستوں پر ننگے پاؤں چلتے ہی رہنا ہو گا۔ شکیب جلالی کے لہو میں تر پرندے کی طرح جو چٹان پر اپنا نقش چھوڑ گیا۔ ننگے پاؤں چلنے والے کے بھی نقش گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔

آپ نے اداریے میں لکھا ہے کہ "ایک اصیل ملکی و قومی بادشاہ شیر شاہ سوری کے علاوہ تقریباً سارے اسلامی بر ہمن بادشاہ حملہ آور، غیر ملکی اور غیر قومی تھے"۔ غوری، غزنوی، اور بابر تو یقیناً غیر ملکی حملہ آور تھے لیکن اُن کے پڑپوتے بھی کیا غیر ملکی اور حملہ آور ہی تھے۔ کسی کو ملکی یا فرزند زمین کہلانے کیلئے کتنی مدت درکار ہے؟ کیا آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی ابھی غیر ملکی ہی کہلائیں گے۔ آپ نے نکاتِ بیدل کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوئی حکمران آج تک یہ معلوم نہ کر سکا کہ آدمی کی فتح اور شکست (حقیقی) کیا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں بابر کو ایک مرتبہ خارش کی بیماری لاحق ہو گئی۔ کسی دوسرے حکمران کا ایلچی اُن سے ملنے آیا اور بہت دیر تک اُن کے پاس رہا۔ اس دوران بابر کو خارش بارہا شدت سے محسوس ہوئی مگر اس نے خود پر قابو رکھا (تاکہ دوسرے حکمران کو اُن کی بیماری کی خبر نہ ہونے پائے) تو بابر کہتا ہے کہ اس نے پانی پت اور کنواہہ جیسی بڑی جنگیں جیتی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی فتح یہ خود پہ قابو پانے کی تھی۔

آپ انگریز بر ہمنیت میں معاشی تحفظ اور اجتماعی سرشت کے پیش نظر غالب کے طرز عمل کو دانشمندی قرار دیکر اقبال کے قصیدوں کی جستجو میں بہت جلد آگے نکل گئے قصیدہ اسلامی بر ہمنیت کے نمائندہ شاہ کا مصائب بن کر لکھا جائے یا کسی انگریز بد ہمنیت کے نمائندہ کیلئے دونوں صورتوں میں یکساں سبک سری چاہتا ہے۔ تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ وہ غالب ہوں، اقبال ہوں یا شاعر انقلاب جوش ہوں جنہیں کوثر نیازی کی مدح سرائی کرنی پڑی، قصیدہ نویسی سے اُنکی شخصیت اور کردار کی عظمت پر تو حرف آسکتا ہے لیکن اُن کے شاعرانہ کمال میں کمی ہر گز نہیں آسکتی، آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کے لئے تخلیقی برتری کا جواز تو مسجد قرطبہ میں موجود تھا۔ بلا شبہ فن تعمیر کا حسین نمونہ تو وہ پہلے ہی تھی لیکن شعر و ادب کی دنیا میں اُسے اقبال نے شاہکار بنا دیا۔ انگریزی کے شاعر شیلے نے بھی لکھا ہے "Poetry makes immortal all that is best and most beautiful in the world "

(In defence of Poetry)

آپ نے خود اس مضمون کے ابتدایہ میں لکھا ہے "لیکن بڑے خیال تک کوئی تخلیقی وجود کیسے پہنچتا ہے، کوئی کوہ پیما پہاڑ کی بلند چوٹی کیسے سر کرتا ہے!" ماؤنٹ ایورسٹ ہی کیا قدرتی قدرت کے شاہکار بے شمار ہیں لیکن شاعر ان سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے اور کس فنکاری سے اُنہیں شعر میں ڈھالتا ہے بس یہی اس کے کمال کا پیمانہ ہے۔ میں مسعود میاں کے اس خیال سے متفق ہوں کہ تخلیق کاروں کے ذاتی عیبوں کو بنیاد بنا کر ان کے تخلیقی وجود اور تخلیقی ادب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

محترمہ بر جیس زہرا کا انداز نگارش بہت خوب ہے ان سے استدعا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ تنقیدی حصہ بہت اعلیٰ ہے۔ جناب فیصل جعفری کا مضمون فکر انگیز ہے۔ تشکیل کی کتابی صورت پسند آئی کہ اسے

پڑھنا اور سنبھالنا آسان ہے۔

والسلام آپ کا مخلص
مسعود احمد
نوٹنگھم۔یو۔کے

قابل صد احترام جناب احمد ہمیش صاحب
مخلصانہ آداب! مزاج گرامی!

زیر نظر شمارے میں کہانیوں میں سے محترمہ صفیہ صدیقی نے "مکالمہ" خوب لکھا اور جسمانی اعضا کی بے تابیاں اور جذبہ عشق کا اظہار دلنشیں انداز میں بیان کر کے کمال کر دکھایا۔ میں سب سے زیادہ اسی کہانی سے متاثر ہوا ہوں جو روح کی گہرائی تک اثر دکھاتی محسوس ہوئی۔ جبکہ دیگر کہانیوں میں اجمل اعجاز کی سچائی ، عبدالرشید کی تحریر "دوطن کی مٹی" نہایت خوبصورت کہانیاں ہیں۔ ان کے علاوہ عرفان احمد عرفی نے "تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا" بھی خوب لکھا۔ ہندی کہانی "گھوڑا" کا مسعود میاں نے اچھا ترجمہ کیا۔

آپ نے "پردہ اٹھتا ہے" ہے کہ عنوان سے خوب جالاک دامانیاں کی ہیں۔ ہم جیسے چھوٹے شہروں کے قلم کاروں کے لئے اس میں بہت راز وا ہوتے ہیں اور چند لوگوں کی ضمیر فروشی کی انتہا پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حصہ شاعری بھی نہایت خوب لگا۔ تراجم بھی اچھے لگے۔ کس کس کی تعریف کروں دیگر تنقیدی مضامین نہایت معلومات افزا ٹھہرے۔ کتب پر تبصرہ جات بھی نہایت محنت سے لکھے ہوئے تھے جن کے مطالعہ سے کتاب سے مکمل تعارف ہو گیا۔

اسیر خلوص کلیم شہزاد
بورے والا۔ پاکستان

برادرم احمد ہمیش صاحب
اسلام علیکم
تشکیل بہت عمدہ ہے۔ آپ کا اداریہ تو بار بار پڑھتا ہوں آپ سچائی سے محبت کرتے ہیں اور یہ سب سے بڑی بات ہے۔

آپکا مظہر الزماں خان
حیدر آباد دکن۔ بھارت

اچھے تاج میاں احمد ہمیش بہت بہت سلام وخلوص
نجمہ محمود نے تشکیل کا تازہ شمارہ دیا۔ دیر تک دیکھتی رہی، گم سم، نہ الفاظ تھے نہ کوئی خیال۔ انجلا ہمیش کی تحریروں میں پختگی آرہی ہے، لیکن آغا گل والا سوال بھی کہ تلخی کیوں ہے؟ ان سے کہئیے ادب کو ان کی ضرورت ہوگی اور مستقبل کا قاری ان سے اچھی امیدیں رکھے گا، قلم کو تلوار ضرور بنائے رکھیں مگر قتل عام کے لئے نہیں کمزوروں کو حوصلہ دینے کے لئے...... وہ خاتون قلم کار ہیں اور اللہ تعالی نے محبت اور شفقت کا نوے فی صد حصہ عورت کو دیا ہے۔ اسے کام میں لائیں...... میں ان کے سلسلے میں سو فیصد مخلص ہوں۔

آپ کی بہن شہناز کنول غازی

محترم اور مکرم احمد ہمیش صاحب   سلام و آداب

ہمیش صاحب میں آپکی شخصیت سے بھی اتنا ہی مرعوب و متاثر ہوں جتنا کہ شاعر و افسانہ نگار* احمد ہمیش سے آپکے یہاں جو بے باکی ہے وہ مجھے گرویدہ کرتی ہے اور یہ جسارت اب کم ہی لوگوں کے پاس ہے۔ ابھی شب خون میں آپکا خط پڑھا۔ اشرف کی نیل گائے والا جملہ بہت خوب تھا بہت دلچسپ تھا۔

جب بھی تشکیل دستیاب ہو جاتا ہے تو میں ضرور خریدتا ہوں کیونکہ اس میں پڑھنے کو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

نیاز مند   شاہد اختر

کان پور۔ بھارت

*مگر حیرت ہے کہ ماہنامہ شاعر ممبئی اگست ۲۰۰۰ء شمارہ ۸ میں شائع ہوئے "۶۰ء کے بعد اردو افسانہ (ایک جائزہ)" کے مطابق شاہد اختر نے دیانت دارانہ موقف اختیار نہیں کیا۔ (ادارہ)

محترم احمد ہمیش صاحب

آداب! تشکیل کا شمارہ نمبر ۳۵ موصول ہو گیا ہے۔ انور سجاد صاحب کی انٹرویو کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ ویسے ایک بات کروں۔ کہ اگر مرزا حامد بیگ، منشایاد، رشید امجد وغیرہ واقعی ہی غیر اہم نام ہیں۔ تو آپ کس مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں؟ کیا یہ آپ کی توہین نہیں کہ آپ ایسے نالائق لوگوں پر اپنی *شر دماغی ضائع کر رہے ہیں۔ آپ ایمانداری سے بتائیں کیا ادب کی بھی یہی صورتحال نہیں ہے؟ آخر یہ "ہم چما دیگر نیست" والا رویہ کب ختم ہوگا۔ حکومت کی طرف سے دیے جانے والے انعامات پر تبصرہ کرتے کرتے ہمارے بہترین لوگ باولے ہو رہے ہیں۔ کیا یہی ادب رہ گیا ہے تخلیق کرنے کو؟ تمام انعامات جوتے کی نوک پر۔ ادب ارادی چیز تو ہے نہیں کہ کوئی کہے کہ میں نے اب شاعری کی ایسی کتاب لکھنی ہے جو پہلا انعام حاصل کرے۔ کیا ان تمام نام نہاد ادب نواز اداروں نے کئی اور بےچل لوگوں کی تخلیقی کائنات کو بھی اتھل پتھل نہیں کر دیا۔ تخلیقی گداز کو مادیت سے آلودہ کر دیا گیا۔ ہمیں اپنی تخلیقی جنت کو ایسی آلودگیوں سے بچانا چاہیے۔ *بے نیازی اور درویشی میں جو لطف ہے۔ اس آپ ضرور واقف ہونگے جن لوگوں کو آپ غیر ادیب سمجھتے ہیں، کاروباری سمجھتے ہیں۔ اُن سے آپ کا ناتا ہی کیا ہے؟ کیا آپ خود کو سارتر کی برادری کا فرد کہلوانا نہیں پسند کرینگے؟ اگر یہ ٹھیک ہے تو چار حرف بھیجئے۔ لفظ اتنا ارزاں نہیں کہ اُس کو بے دریغ خرچ کیا جائے۔ لفظ اُسی وقت استعمال کریں جب اپنی تخلیقی جنت کی سیر کرنا یا کروانا مقصود ہو!

والسلام خلوص مند   شناور اسحاق

لاہور۔ پاکستان

*سوال نالائق لوگوں سے الجھنا نہیں بلکہ ایک پوری ادبی بددیانتی کے خلاف ایک اکیلے ادیب کی جنگ ہے جسے "شر دماغی" نہیں کہا جا سکتا۔

*ادبی ماجیات میں جو بھیڑیے گھس آئے ہیں انہیں موسیقی نہیں سنائی جا سکتی اور نہ ہی ان سے بے نیاز ہو کے کوئی درویش بنا رہ سکتا۔ بھیڑیوں کو تو گولی ماری جاتی ہے۔ (ادارہ)

سہ ماہی تشکیل۔ شمارہ۔ (۳۵)

ابتدا ارشاگرامی صاحب کی نعت سے ہوئی ہے۔ اور یہ نعت دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی بے کل تمنا

بھی ہے۔ تخلیقی وجود امر ہے۔ ۳۔ پہلے کی طرح اب بھی معرفت کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے نئے اور پرانے افق پر ڈوبتے اور ابھرتے ڈوبتے ہوئے وجودی آفتاب کو دریافت کرنے کا عمل جاری ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔ یہاں آپ نے بخیے ادھیڑے ہیں۔ حالانکہ گیدڑ کے چھپنے اور مرنے کا عمل اور پھر سڑاند کی روئداد کسی طرح بھی خوش کن نہیں کہلائی جا سکتی۔ مگر آپ کے انکشافات سے قاری کو زرد صحافت تک رسائی تو حاصل ہو گئی۔ مگر آپ اس گھپا تک نہ آتے تو دوسروں کی عزت بچی رہتی۔ یہی عمل پڑوسی ملک میں بھی دھرایا گیا۔ اور آپ کی رسائی وہاں تک بھی ہو گئی۔ بات تو درست ہے مگر دکھ بھی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے نام کمانے والے لوگوں کے کیسے کیسے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔

کہانیوں میں اس دفعہ پھر تشکیل نے معرکہ آرا تخلیقات پیش کی ہیں۔ یہ کہانی کی انفرادیت متاثر کن ہے۔ سوختہ ساماں میں۔ اقبال مجید نے جو منظر دکھانا چاہا ہے۔ اس میں کوئی جھول نہیں ہے۔ آغوش مہرباں۔ محمد الیاس کی کاوش پہلے کی طرح اب بھی اپنے دشوار ٹریٹ منٹ کے لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ چھٹی لاش۔ نیر جہاں کا اسلوب پرکشش ہے اور بیان کرنے میں ڈنڈی مارنے کا فن نہیں جانتی ہیں۔ مکالمہ۔ صفیہ صدیقی کی کہانی "مکالمہ" میں ہم سب کی اندورنی کیفیت کو ترتیب وار بیان کر کے چھپے ہوئے گوشوں کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم چونک پڑتے ہیں۔ جیسے ہماری اپنی چوری پکڑی گئی ہو۔ عرفان احمد عرفی کا تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ایک بے حد جاذبیت کا حامل افسانہ ہے، ارشد رضوی (خواب، سانپ اور عورت) اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان الجھی ہوئی انا میں خوف کی ہچکیاں جب نفسیاتی اثرات مرتب کرتی ہیں تو آدمی واہموں کی کمان میں اکڑا ہوا تیر کی مانند فضا کی گھٹن کا شکار بن جاتا ہے۔ شاہانہ ایلیا۔ (ایک حکایت خون آشام) عبدالرشید حواری (وطن کی مٹی) اجمل اعجاز (سچائی) سحر علی (حرف نارسائی) نصیر احمد صدیقی (دو غلام) ان تخلیق کاروں نے بھی اپنا اپنا حق ادا کیا ہے۔ اور پھر مگر چاندنی ایک ایک زاویہ نمایاں ہو رہا ہے۔ ایک ایک قوس اپنا تعارف خود بنی ہوئی ہے۔ اور کمان سے نکلا ہوا ہر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ رہا ہے۔ اور اس بڑی فن کی بلندی اور فتح اور کیا ہو سکتی ہے۔ حیدر جعفری سید نے بیشتر تخلیقات کا اس انداز سے ترجمہ کیا ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے اور یہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ شاعری کے حصہ میں بھی آپ کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ امید ہے اس انتخاب پر آپ نے بہت لوگوں کی ناراضگی بھی مول لی ہو گی مگر شائع وہی کیا ہے جس پر پورا اعتماد ہے۔

آثم میرزا
سیالکوٹ۔ پاکستان

پیارے بھائی احمد ہمیش صاحب

اسلام و علیکم۔ ممکن ہے اسے میری کمزوری کہا جائے کہ جب بھی تازہ تشکیل ملتا ہے میں سب سے پہلے "کہانی کی تاریخ" اور "مگر چاندنی" پڑھتا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے مدیر محترم جناب احمد ہمیش صاحب لکھتے ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کی تاریخ کے سلسلوں کو بڑی عرق ریزی سے دریافت کر کے وہ باتیں ضبط تحریر میں لائی جاتی ہیں جن کا ذکر کہانی کے کسی ناقد یا محقق نے اپنے مضمون میں نہیں کیا ہے۔ کہانی کے حوالے سے اس عنوان کے تحت شائع ہونے والی مختصر سی تحریر کسی بڑے فریم ورک کے برابر ہے۔ "مگر چاندنی" میں حقیقتوں کا برہنہ اظہار ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں ایسی خطرناک تحریر شاید ہی کسی

نے اتنی بے باکی اور صاف گوئی سے لکھی ہو گی۔ اس بار تشکیل کا افسانوی حصہ بہت عمدہ اور وقیع ہے۔ اقبال مجید کا افسانہ 'سوختہ ساماں' جسے میں نے 'شب خون' میں پڑھا تھا دوبارہ اس لئے پڑھا کہ اس افسانے کے چند شکست خوردہ کردار اپنے پوری ہیبت ناکیوں کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ محمد الیاس (آغوش مہرباں) اور نیر جہاں (چھٹی لاش) کے افسانے مُد اثر ہیں۔ شاہانہ ایلیا (ایک حکایت خون آشام) واقعی منفرد اسلوب کے باوصف زبان و بیان پر بڑی حیرت انگیز قدرت رکھتی ہیں۔ بر جیس زہرہ کی تحریر میں میر امن دہلوی دوبارہ زندہ ہو گئے۔ فضیل جعفری صاحب کا مضمون "سلیم احمد بطور نقاد" دلچسپ، کھرا اور نہایت مدلل ہے۔

خیر اندیش یوسف عارفی
بنگلور۔ بھارت

برادر عزیز! اسلام ورحمت

گیٹ اپ کے لحاظ سے نگاہوں کو خیرہ اور مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے ذہنوں کو مسحور کرنے والا تشکیل موصول ہوا۔ آپ کی محنتوں اور آپ کے حسن انتخاب کی داد نہ دینا یقیناً بہت بڑی زیادتی ہو گی۔ اگرچہ موصولہ شارہ کے درمیان ایک طویل عرصہ حائل ہے، تاہم پرچے کو دیکھ کر اور پڑھ کر اس غیر معمولی تاخیر کو صرف نظر کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے مطالعہ سے باعث تاخیر خود بہ خود سامنے آجاتا ہے اعلیٰ اور معیاری پیش کش کی تیاری میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔ تاہم پردہ اٹھتا ہے کہ عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت معلومات افزا ہے۔ لکھتے رہیے۔

دعاؤں کے ساتھ سیدہ حنا
نوشہرہ۔ پاکستان

ایڈیٹر تشکیل۔ محترم جناب احمد ہمیش صاحب اسلام علیکم

آپ کی دلچسپ تحریر "نگر چاندنی" پڑھتے پڑھتے مجھے احساس ہوا جیسے اب آپ جہان آباد، گیا، بہار کا تذکرہ کریں گے...... خیر پھر بھی آپ بہت دور کے نہیں نکلے اور "بلیا" کی چاندنی آپ پر ضوفشاں ہے، خدا آپ کی مسرتوں میں اضافہ کرتا رہے۔

آپ کا خیر اندیش ظفر امام
نیویارک۔ امریکہ

محترم احمد ہمیش صاحب
اسلام و علیکم

سہ ماہی تشکیل (شمارہ ۳-۵) پڑھنے کو میسر ہوا۔ رسالہ پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ اتنا اچھا رسالہ نکال رہے ہیں جس کا علم مجھے نہیں تھا۔ اور وہ بھی معیاری۔ نظم و نثر کے دونوں حصے نہایت جاندار ہیں آپ کا اداریہ اور "پردہ اٹھتا ہے" بہت خوب ہے۔ اداریے میں آپ نے اردو ادب کے اتار چڑھاؤ کو تاریخی پس منظر میں تفصیل کے ساتھ پیش کر کے قاری کو چونکا دیا ہے جس سے آپ کی علمی بصیرت اور گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے میں طنز کے جو نشتر چبھوئے جاتے ہیں ان بڑے بڑے ادبی ہا بھی مر جاتے ہوں گے اور اگر زندہ بھی ہیں تو وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے ہوں گے۔ افسانہ کا حصہ بھی اچھا خاصا جاندار ہے۔ اقبال مجید، صفیہ صدیقی، سحر علی، نصیر احمد صدیقی اور برجیس زہرہ کے افسانے مجھے اچھے

لگے۔ برجیس زہرہ نے اپنے افسانے میں رجب علی بیگ سرور کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ جبکہ غزلوں اور نظموں میں کاوش عمر، نیر جہاں، رحمان فراز، سحر اکبر آبادی، ابراہیم اشک، رونق حیات، ماور اصدیقی، نیر واجد اور کے۔ بی فراق کامیاب نظر آتے ہیں

فقط والسلام صابر عظیم آبادی
کراچی۔ پاکستان

محترم احمد ہمیش صاحب۔ آداب

تشکیل کا تازہ شمارہ تقریباً پڑھ چکا ہوں۔ اداریہ بہت جاندار ہے۔ پردہ اٹھتا ہے نہایت دلچسپ ہے۔ ادارے کا بے باک انداز حیرت میں ڈالتا ہے۔ ہمارے ہاں اس قدر صاف گوئی سے کام نہیں لیتے خصوصاً تحریر میں۔ افسانے خاصے اچھے ہیں۔ خصوصاً اقبال مجید، نیر جہاں، عرفان احمد عرفی کے۔ نصیر احمد صدیقی کا منی افسانہ دو غلام بھی اچھا ہے۔ حصہ شاعری میں صابر ظفر، رفیق سندیلوی، کاوش عباسی کی غزلوں نے دھیان کھینچا۔ فصیل جعفری صاحب کا مضمون بہت واضح ہے۔ وہ ڈھکی چھپی میں وشواس نہیں کرتے۔ جو کہنا ہو، دو ٹوک کہتے ہیں۔ ریاض صدیقی کے مضمون کی دوسری قسط پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔ ابراہیم اشک صاحب کا مضمون "بیدل اور غالب" کے سلسلے میں فارسی سے دور کی سلام ہونے سے لطف نہ لے سکا۔ بھرے ہر بار کی طرح تشنہ ہیں۔

مخلص حسن جمال
جودھپور۔ بھارت

مکرمی جناب احمد ہمیش صاحب۔ آداب و سلام

کاوش عباسی صاحب نے پاکستان سے واپس آکر تشکیل کا شمارہ نمبر ۵ ۳ عنایت کیا۔ تشکیل مکمل طور پر آپکی شخصیت کی متانت، لیاقت اور آپکے ذوقِ ادب کی معنوی شکل کا نام ہے۔ میرا یہ خیال بھی ہے کہ اس صلاحیت کا رسالہ پاکستان اور ہندوستان میں کوئی اور کم ہے۔ آپ کے اداریے کا پہلا پیراگراف فکر کا ایک دریا رکھتا ہے اپنے اندر۔

والسلام۔ احقر سید قمر حیدر قمر
جدہ۔ سعودی عرب

برادرم احمد ہمیش۔ آداب

تشکیل کے مذکورہ شمارے میں میرا ایک خط آپ نے شائع کیا ہے۔ اس پر ادب کے کئی دم چھلوں کو اعتراض ہوا ہے کہ میں نے عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار انتظار حسین پر انگلی اٹھا کر اچھا نہیں کیا ہے...... کچھ ویسے لوگ کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے میں نے دہلی دور درشن (ٹی۔وی) والوں کو ایک خط بھی لکھا ہے جس کے ذریعہ میں نے سیریل 'وکرم بے تال' کی اس قسط کی ذہنگ کو حاصل کرنے کی بات بھی لکھی ہے جس کی پوری کہانی پر ہی مشہور کہانی 'نرناری' کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

یوں تو تشکیل کی کہانیاں، مضامین، غزلیں اور نظمیں سبھی بے حد پسند آئیں۔ لیکن اس شمارے کا سب سے اہم حصہ وہ لگا جسے آپ نے ادارہ کی طرف سے تحریر کیا ہے 'تخلیقی وجود امر ہے ۳' اور 'پردہ اٹھتا ہے'......

آپ کی تحریر کی بے باکی نے اچھے اچھوں کا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیا ہے۔ جس میں ادب کے بے شمار ادباء و شعراء کے جسم سے کاغذی پیراہن اترتے ہی حمام دبستان میں سب کے سامنے ننگے ہو جاتے ہیں...... ادب کی اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اونچی ایڑی کے سہارے قد آور ہو گئے ہیں۔ جو کرتے کچھ ہیں اور کہتے کچھ ہیں۔ ایسی ادبی مخلوق کو میں نے دو مونہا سانپ کا نام دے رکھا ہے...... ادب کے آئینے میں ہر کسی کا چہرہ بالکل صاف و شفاف ہونا چاہئے۔ کیوں کہ یہ وہ آئینہ ہے جو مکھوٹا چہرے کے اندر کا چہرہ پل بھر میں اُتار لیتا ہے۔ اس لئے مانگی ہوئی شہرت کی چاندنی سے اپنی زندگی کو روشن کرنے والوں کو چاہئے کہ اس پہلے کہ ان کی زندگی میں اندھیرا پھیل جائے اپنے حصے کا سورج سے اپنے ہاتھوں سے اپنے آنگن میں اتار لیں۔

آپ کا اختر آزاد

بہار۔ بھارت

مکرمی جناب احمد ہمیش صاحب تسلیم

تشکیل آپ کا رسالہ نہیں آپ کی تخلیق ہے۔ مجھے ایسا ہی لگا۔ کیونکہ پورے رسالہ پر آپ کا اداریہ حاوی رہا اور اس کے پرتو سے مکت نہیں ہو سکا۔ بہت کم ایسا ہوپاتا ہے کہ رسالے بھی شاعر اور ادیب کی تخلیق کی طرح بالکل آزاد تلازمے ہوتے ہیں اور ان کی پہچان اپنے مرتب رمدیر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔

آپ نے اداریہ میں اپنشد کے حوالے سے اور ہندو دھرم کے حوالے سے بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے سچ لکھا ہے کہ "برصغیر کی اجتماعی سرشت کی جملہ خرابیوں کی ذمہ دار بیشتر برہمنیت تھی"۔ آپ نے لکھا ہے کہ بیشتر ہندو برہمن پڑھے لکھے نہیں تھے۔ برصغیر میں برہمنیت ایک بہت بڑا عصبی رویہ بنی جس نے مسلمانوں کے اندر بھی پناہ لی۔ اس حساب سے برہمنیت جاوداں ہیں۔ کیا ہم آپ اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں؟ جب ہم قدیم یونان کی طرف دیکھتے ہیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر نظر دوڑاتے ہیں تو صورت حال دوسری نظر آتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بہت زمانے کے بعد برہمنیت نے اس قوم کے اندر اپنا جادو جگانا شروع کر دیا۔ اور آج تک یہ قوم اس کی کی زد سے آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ آپ کے اداریے کے کئی مدوجزر ہیں۔ بیدل کے نکات پر بھی آپ نے خوب لکھا ہے اور غالب پر بھی۔ آپ سے ذی روح، پر مغز اور تخلیقی جوہر سے لبریز مزید اداریوں کی توقع ہے۔

آپ کا خیر اندیش جمال اویسی

بہار۔ بھارت

انجلا

تشکیل کا شکریہ۔ احمد ہمیش کا اداریہ لاجواب ہے۔ احمد ہمیش جرات اظہار کا بادشاہ ہے۔ تخلیقی وجود امر ہے ایک تجزیاتی محققانہ، تاریخی مقالہ ہے "مراجو ابا تھی اور ابھا گا گیدڑ" کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ جب انعامات کی بندر بانٹ ہوئی تو ڈائریکٹر جنرل ادبیات نے ایک نوجوان شاعر کو فقط ایک مجموعۂ کلام پر ایک لاکھ روپے کا انعام مستحق قرار دیا۔ وجہ یہ ٹھہری کہ اُن کا ہر شعر منتخب ہے۔ میر تقی میر کے چار دیوان ہیں۔ جن میں صرف 72 شعر کو منتخب ہیں۔ جبکہ غالب کا منتخب کلام بھی مختصر ہے۔ لیکن اس نوجوان شاعر کا پورا کلام بھی منتخب تھا۔ سبحان اللہ! کیا ٹیلنٹ ہے...... اکیڈمی ادبیات کا اکیڈمی نے کچھ رجعت پسند اور RADICAL ادیبوں کے بُت بنا کر رکھے ہیں۔ اُن پر بھی کتابیں لکھوائی جا رہی ہیں۔ ہر صوبے سے کچھ خوش قسمت چُن

رکھے ہیں لیکن اُن پر لکھتے چلے جایئے۔ پنجاب میں بھی بابا بُلّے شاہ ANTI RADICAL ہیں۔ اُن کے ذکر سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ "ادبیات" کا رسالہ 120 روپے میں شائع ہوا کرتا تھا۔ جبکہ فروخت 20 روپے میں فروخت ہوتا تھا۔ سرینا ہوٹل کوئیٹہ کے ایک فنکشن میں جس پر لاکھوں روپے ضائع ہوئے۔ میں نے اُٹھ کر چیرمین سے سوال کیا تھا کہ اتنا وگس میٹریل کیوں چھاپنے پر ملک کا روپیہ کیوں ضائع کیا جاتا ہے؟ جس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ بلوچستان کے ادیب کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ گئے۔ اُن کو کسی نے نہ پوچھا، میر محمد زیرانی، مراد ساحر، نور محمد پروانہ کتنے نام گنواؤں۔ قلم کی بے حرمتی ہو رہی ہے اور جینئل لکھنے والے کو مزاحمتی ادب کے زمرے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ بلیک لسٹ کر دیا جاتا ہے۔ قصیدہ، مداح سرائی اور محبت پر لکھوایا جاتا ہے۔ ادیب یا تو دلال بن چکے ہیں۔ یا شادی دفتر کے کارندے۔ محبت محبت محبت ٹی وی پر میڈیا میں صرف اس پہ لکھنے کی اجازت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ GLAMOUR کے سوا۔ ہر شے کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ جلتے صحراؤں، گندے شہروں دھواں اُگلتی گاڑیوں میں کہیں (NEW MILLENNIUM) کی جھلک دکھائی نہیں دیتی وہی فرسودہ قبائلی نظام جہاں کلاس سوسائیٹی کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔

Show me the man I will

Show you the rule

ادب اور ادیب تو معاشرے کی سوچیں بدلتے ہیں۔ ڈیگال نے کہا تھا "میں سارتر کو گرفتار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ سارتر ہی تو فرانس ہے"۔ ادیب ہی تو پاکستان ہیں، ان کا گلہ کیوں گھونٹتے ہیں ایسے ادارے۔ کہ عبدالعزیز خالد جیسے بلند رتبہ شاعر اور دانشور ایسے اداروں سے انعام وصول کرنے سے انکار کر دیں۔ کیا حیثیت ہے ان انعاموں کی؟ ان ادبی انعامات کا رتبہ کیوں اس قدر گرا دیا گیا ہے۔

تشکیل کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ایک شمع جلا رکھی ہے۔ اور احمد ہمیش، انجلا ہمیش سے میں ہمیشہ مزاقاً کہا کرتا ہوں۔ "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

والسلام۔ آغا گل

کوئٹہ۔ پاکستان

محترم احمد ہمیش صاحب اسلام علیکم!

تشکیل ملا، آتش فشاں والی بات باقی ہے۔ کہانیوں کا انتخاب بہت بہتر ہے۔ فکشن پہ آپ کی گہری نظر ہے خوبصورت کہانیاں مجھے یاد رہ گئیں۔ تشکیل یوں بھی کہانیوں کے چناؤ میں کامیاب رہا ہے ہر دم۔ اس بار محمد الیاس، نیر جہاں، صفیہ صدیقی، شاہانہ ایلیا اور سحر علی کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ فرانز کافکا اور پریم پرکاش کی اچھی کہانیاں چنی گئی ہیں اور بہتر ترجمہ کیا گیا ہے۔ پاکستان کے ادبی انعاموں میں جو سیاست چل رہی ہے وہ اچھی بات نہیں ہے ایسی حرکتوں سے انعام کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ شاعری کے حصے میں نیر جہاں، نقوش نقوی، ستار صدیقی، رفیق سندیلوی، اور احمد ہمیش پسند آئے۔ مگر چاندنی نے مزہ دیا۔ ہمیش بھائی آپ ادب سے گندی سیاست کو ختم کرنے میں اپنی جی توڑ محنتوں کے لئے مبارک باد ہیں۔

شہاب اختر

جھریا۔ بھارت

عزت مآب احمد ہمیش صاحب سلام و عقیدت

تشکیل نے بصیرتوں اور بصارتوں سے ہمکنار کیا آپ نے وقیع اور معیاری تحریریں موصول کی ہیں مجموعی

طور پر شمارہ آپ لوگوں کی ادارتی اور ادبی صلاحیتوں کا مظہر ہے انشاء اللہ مستقبل میں ادبی دنیا تشکیل کے ذریعے ادب کی رفتار و معیار قائم کرے گی خدا کرے آپ لوگ اپنے حدف تک پہنچ جائیں۔

والسلام اسیر خلوص طارق قمر

یو پی۔ بھارت

بہت پیارے احمد ہمیش صاحب

تمام مشمولات خوب ہیں آپ سے یہی امید یں ہیں۔ آپ زبان و ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ سب تاریخ میں جائیگا۔ خدا آپکو صحت اور قلم کے ساتھ سلامت رکھے...... بس ایک درخواست ہے جتنا ہو سکے Controvorsies سے بچئے۔ جو ہو رہا ہے وہ سب ظاہر ہے ہماری پسند، ہمارے اصول اور مزاج کے خلاف ہو رہا ہے مگر میرے بھائی...... ہیں بہت آزردہ موجوں سے مگر دریا میں ہیں

ترکِ دنیا کرنے والے بھی اسی دنیا میں ہیں

اگر ہر نا پسند اور ذلیل چیز پر آپ اس طرح React کرتے رہے تو آپ کا وہ قیمتی وقت جو ادب تخلیق کرنے میں جانا چاہئے وہ بلاوجہ غیر ضروری چیزوں میں ضائع ہو گا اور ایک بڑا Talent ادھر ادھر لگ جائیگا یہی آپ کے اور ہمارے بد خواہ چاہتے ہیں تو پھر کیوں ہم اپنا نقصان کریں۔ ایک عظیم ہاتھی کی طرح گذر جائیے اور چھوٹے چھوٹے بھوں بھاں کرنے والے چوپایوں کو بھونکنے دیجئے کہ آپ کا وقت خراب ہونا ادب کا موجودہ منظر نامہ خراب ہونے کے مصداق ہے خدا آپکو ہر نقصان اور ہر بُری نظر سے بچائے۔

فقط والسلام آپکا شکیل جمالی

یو پی۔ بھارت

محترم احمد ہمیش صاحب۔ آداب

حسب توقع اداریہ Exciting ہے اور مشمولات نظم و نثر شاندار اور جاندار...... حرکت اور تغیر عبارت ہے زندگی سے۔ بہت کم ایسے رسالے ہوں گے جو زندہ کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ تشکیل میں حرارت ہے، توانائی ہے، حسن ہے اور تازگی بھی ہے ان ہی صفات کی بدولت اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ اس مادہ پرست دور میں آپ کی راست گوئی، بیباکی اور جراٗت مندی دیکھ کے یوں لگتا ہے آپ out sider ہیں...... اللہ آپ کو حوصلہ اور قوت عطا فرمائے تا کہ آپ جہاد کرتے رہیں۔

نیاز مند۔ ساجد حمید
شموگاں (بھارت)

میرے محترم سر احمد ہمیش اسلام علیکم

تشکیل بھیجنے پر میں آپ کی ممنون ہوں۔ تشکیل میں آپ کی خوبصورت نظم کی چند سطریں تو میرے دل میں خنجر کی مانند اتر گئیں، کہ میں بہت تڑپا ہوں۔

کہ وہاں لوٹ جاؤں جہاں سے میری عمر شروع ہوتی ہے!

تشکیل میں آپ کا اداریہ پڑھا لیکن میری اتنی مینٹل گرو تھ نہیں اور کئی باتیں سمجھ نہ پائی آپ میرے ملک کے بہت بڑے دانشور وادیب ہونے کے علاوہ بہت ہی سچے اور کھرے مدیر بھی ہیں کہ پردہ اٹھتا ہے میں

ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ جو سچ ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں ان لوگوں میں سے کئی لوگ آپ کے دوست بھی ہوں گے اور آپ اگر چاہیں تو ان سے مالی فوائد بھی اٹھا سکتے ہیں لیکن آپ کو سلام ہے کہ آپ اپنے ذاتی مفاد کو عزیز نہیں رکھتے۔ خدا تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ صحت دے اور قلم میں اور زیادہ طاقت دے کہ آپ اور سچ لکھ سکیں۔

ناہید نظم
شکار پور۔ سندھ۔ پاکستان

محترم احمد ہمیش صاحب تسلیمات
آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ہر کوئی معترف ہے میں نے بھی جب تشکیل جیسا معیاری رسالہ پڑھا تو خواہش ہوئی کہ اس میں شرکت کروں اس جیسا معیاری اور سچ لکھنے والا ادبی رسالہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اور سب سے بڑھ کے آپ جس طرح نئے لکھنے والے کو شریک سفر کرتے ہیں وہ آپ ہی کا ظرف ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مزید رفعتیں عطا کرے (آمین)

فرزین مقبول
جلالپور جٹاں گجرات۔ پاکستان

جناب احمد ہمیش صاحب۔ مدیر اعلیٰ تشکیل کراچی
سلام کے بعد عرض ہے کہ تشکیل ملا بہت خوشی ہوئی۔ ابھی تک تو پورا نہیں پڑھا ہے مگر جو کچھ اور جتنا پڑھا ہے اچھا لگا۔ عورت (I am a woman)، "اپنے جیسے عاشقوں کے نام"، "آدھی موت" "راکھ" اور سحر علی کی نظم تمام ناتمام کا مصرعہ "دل ٹوٹنے کا کوئی منظر نہیں ہوتا" لفظوں کی موت وغیرہ وغیرہ۔ مجھے شعری ادب کی اب بھی نہیں آتی مگر تشکیل کی تحریریں ہر دل کی آواز بلکہ ہر عورت کی آواز لگ رہی ہے...... نثری تحریروں میں اجمل اعجاز کی سچائی اور شاہانہ ایلیا کی ایک حکائت خون آشام بہت اچھی لگیں...... سچائی کے اچھا لگنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اجمل اعجاز صاحب حیدر آباد کے رہنے والے ہیں۔

شمیم انصاری دعاؤں کی طالب
حیدر آباد۔ پاکستان

جناب احمد ہمیش۔ محترمہ انجلا ہمیش
سلام خلوص، تشکیل کا تازہ شمارہ ملا۔ تشکیل کا ہر شمارہ منفرد اور معتبر ہوتا ہے۔ اداریہ، تخلیقی وجود امر ہے فکر انگیز ہے۔ پردہ اٹھتا ہے میں بڑی سفاک تحریریں ہیں۔ "کہانی" محمد الیاس کی آغوش مہرباں نیر جہاں کی چھٹی لاش سحر علی کی حرف نارسائی نصیر احمد صدیقی کی دو غلام اور شاہانہ ایلیا کی ایک حکایت خون آشام قابل داد ہیں پریم پرکاش کی ہندی کہانی گھوڑا بہت اچھی اور متاثر کن کہانی ہے، آپ کی سوانح مگر چاندنی اپنی مثال آپ ہے۔ شاعری میں کاوش عمر، دل نواز دل، ابراہیم اشک کی غزلیں قابل داد ہیں۔ نظموں میں رحمان فراز نیر جہاں، سلیم شہزاد، شاہین مفتی، رونق حیات، اکمل شاکر، فوزیہ اختر اور احمد ہمیش کی نظمیں متاثر کرتی ہیں نصیر احمد ناصر اور علی محمد فرشی کی نظموں کی کمی کا احساس ہوا، فصیل جعفری کا مضمون سلیم احمد بطور ایک نقاد بڑا جاندار مضمون ہے ابراہیم اشک کا مضمون بیدل اور غالب آئینہ در آئینہ بھی قابل داد ہے۔ تین اہم خطوط کی

کیابات ہے۔

خداحافظ آپ کا خالد ریاض خالد
ملتان۔پاکستان

مدیر تشکیل جناب احمد ہمیش عزیزم! اسلام علیکم
ا۔اداریہ تخلیقی وجود امر ہے ۳ گزشتہ سے پیوستہ اس بار بھی دس سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اگر اس کو مضمون کی طور پر شامل کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ادبی پرچہ کی اتنی طویل اداریہ کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے۔
۲۔کہانی کے حصے میں بڑے اہم نام شامل ہیں اقبال مجید، محمد الیاس، عرفان احمد عرفی وغیرہ۔صفیہ صدیقی کا مکالمہ بڑا فکر انگیز ہے۔ ۳۔شاعری میں رفیق سندیلوی، سلیم شہزاد، شاہین مفتی اور شاہینہ فلک نمایاں ہیں۔ سحر علی اور ماورا صدیقی کی حوصلہ افزائی ضرور ہونی چاہیے۔ ۴۔ سلیم احمد بطور ایک نقاد فضیل جعفری کے طاقت ور قلم کا شاہکار ہے۔ ۵۔ خطوط کا حصہ ہر بار بیس سے زیادہ قیمتی صفحات نگل جاتا ہے۔اگر آپ چاہیں تو انہیں پرچے میں شامل کرنے کی جائے الگ سے ''خطوط نامہ برائے تشکیل'' مرتب کر کے چھاپ سکتے ہیں۔

والسلام خیر اندیش مسعود میاں
بورے والا۔پاکستان

محترمی اسلام علیکم
سہ ماہی تشکیل کے تازہ شمارہ ۳۵ موصول ہو گیا ہے۔سب سے پہلے تشکیل میں اپنی غزلوں اور ''گزرتے روز و شب کے درمیان'' پر انجلا ہمیش کے تبصرے کی اشاعت کے لئے میں آپ کا اور انجلا ہمیش کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتا ہوں۔انجلا ہمیش نے تبصرہ بہت تفصیلی اور بہت اچھا تحریر کیا ہے۔انہوں نے تبصرہ نہایت ہی ایمانداری سے کیا ہے۔مجھے بہت خوشی ہے، انجلا ہمیش کا مستقبل بہت روشن ہے

آپ کا نثار احمد نثار
بہار۔بھارت

بزرگوار احمد ہمیش صاحب سلام مسنون
تازہ شمارہ زیر نظر ہے، شمارے کے کسی ایک صفحے پر آپ نے نہایت کشادہ دلی سے ہم گوادریوں کی توصیف و ثنا کی ہے۔ویسے ہم ''نالائق'' تو اس لائق ہی نہیں۔

مخلص اصغر دادرس
گوادر۔پاکستان

محترم جناب احمد ہمیش صاحب
اسلام علیکم
میں نے تشکیل کا دوسری مرتبہ امطالعہ کیا ہے اور کر رہا ہوں اس میں مجھے بہت کچھ پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ یہ

کہوں گا کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اس افسانے، غزلیں اور نظمیں سب اپنی مثال آپ ہیں۔

شکریہ فقط آپ کا دعا گو محمد حنیف ناشاد

کراچی۔ پاکستان

پیارے ایڈیٹر صاحب

اسلام علیکم

تشکیل کا شمارہ موصول ہوا۔ ملتے ہی تاک گردانی شروع کی، نظموں اور افسانوں کا زیادائی بہت خوب لگی، کیونکہ مجھے ان صنفوں سے از حد جنون دلچسپی ہے۔ نہ جانے تشکیل کے شمارے میں کیا خلش و کیا کشش ہے کہ اسکا دوسرے شمارے کا انتظار ستائے جارہا ہے۔ جب یہ تشکیل ملا تو یوں لگا کہ جیسے ایک معمر آدمی کو وطن مل گیا! کہ جیسے اجنبیوں کے شہر میں آشنا مل گیا!

نیک ارمانوں کیساتھ دانش داغ بلوچ

مکران۔ پاکستان

محترم احمد ہمیش صاحب سلامت رہو اسلام وعلیکم

میں نے سہ ماہی تشکیل پڑھ لیا۔ اس سے ہمیں سکون ملا۔ تشکیل میں بہت خوبصورت مضامین شامل تھے۔ آج کل ادبی دنیا میں تشکیل کو خاص مقام حاصل ہے۔ میری طرف سے تمام ادبی بھائیوں کو سلام کہیے۔

آپ کا بھائی مظہر علی ناصر

ٹنڈو جام۔ پاکستان

انٹرنیشنل
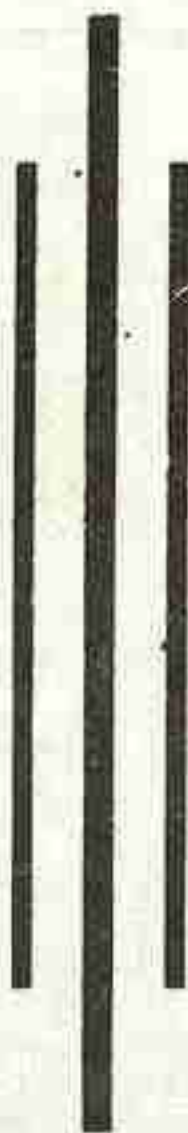
FRIDAY NOVEMBER 15, 1996 8:00 PM

Ball Room, Buena Park Hotel
7675 Crescent Ave. Buena Park (714) 995 1111

زیر اہتمام

شمالی امریکہ کے شعراء / شاعرات

منتخب کلام

۷۲۱ ہل سٹریٹ نمبر ۱۱۱ سینٹا مونیکا، کیلیفورنیا ۹۰۴۰۵

ٹیلیفون نمبر (310) 450-URDU
8738

ORGANIZED BY: URDU MARKAZ INTERNATIONAL
721 HILL ST. # 111
SANTA MONICA, CA 90405, U.S.A.
(310) 450-URDU(8730)

the springs of Your Command
O' the Holy Prophet!
It was the last evening of my separation from Your Command
In the fields sunlight was fallen tired after running with the barefooted and fast running children. In the compound of the mosque *Namaz was indiffernt, My face though towards *Kaba it was only, God to take away the glistening saucer of the sun-Then what was the hap that turned my face.The representatives who crushed my stomach and back ruled over the world.They had enough fuel to generate their race I,in numerous darks having my dark would travel in the trains of slave countries,leaving my bed in the name of the woman not available
ever in the habitations roam about from one habitation to other
They were the girls to snatch eyesights of belivers or the change of climate or the force of history or only for me the rotation of the earth was stopped
O'the Holy Prophet!
It was the last evening of my separation from Your Command

1-Azan: great famine and affliction summon to prayers Muslim
2-Mahakal:The epic period repesenting the totality of various eras in which life, death and time assimlates
3-Namaz: Muslim prayer

Then, only one clock proves to be correct
The clock of death
O 'the Holy Prophet!
After setting my clock by the clock of death I saw towards the sky so that I might pray to God to pass me away from terresterial time. But since long, in the multitude of my generation I forgot that prayer
Leaving my fault pick up only my that will which knowing You the Intercessor of the Day of Judgement weeps through the language of tears
For wait is the heart of eternity, And someone says, "Don't weep my child". Who was he, who having the drop of my blood came from Arabia. And coming over the wars in the Indian territory, was defeated within self. And the camps of life he built houses, mosques, pools and wells, planted trees, cultivated crops and breaded cattles. Who was he whose blood gave eyes to my father's father. And my father gave me the same eyes to me. At that time I didn't know that inheritance walks on having a camera too of its own. Each drop of blood has numerous lenses. If a drop is fallen down somewhere, numerous lenses are broken Who knows that how many drops of blood were fallen down before my birth and how many lenses were broken
How many times I was given birth and how many times was murdered
Hadn't there been the custom of saying *Azan in the ear of newly born baby, who would have told me the meaning of my birth
O'the Holy Prophet! Who would have told me the auspicious name of You
It was my inheritance that kept my head awakened in my tender age. At that time when in the compound of the village mosque the springs of the remet tree would fall over my nonage head and I thought that they were

centre of the Holy Quran
Then fearing of the sins of the past and future there are only eyes which are neither open nor closed
In the name of life age from an unseen height goes on descending to an unseen slope Age which neither sleeps nor wakes
Age itself having a spade in its hand digs on our grave
And yes, this grave is open till our coming agony of death
It is another thing that despite seeing it we cannot see
Sticking with the pulp of backbone, populated in each fluff, compressed with the layers of the skin and kneaded in the flesh and fat, spread into the net of arteries, transparent membrance coate sliva and in the tribe of spittle getting ahead, numerous crucified fates holding the banner of mean pleasures, our nerves of hanging us take away in the mist. In that mist we can see nothing
Neither the pig brought up in the climate of body nor that clamp of splinter of bamboo and rope nor the walls of thick skin made of rich food, alcohol and strong spices. Neither their plaster scoured-scratched with the nails nor the fat to be used for preliminary fuel of body. And nor that spear with the tip of which the intoxicating, mysterious and torturous journey between nerves and the agony of death is completed. But we can see nothing. Neither our those hands which with the help of the tip of the spear goad themselves, dig, tweak, scratch and make hole within so that the blackness of the long night thickened on the skin be erased away And an infinite day may break. And the journey may meet end.
Up to this, reaching between the nerves and the agony of death all the clocks of human beings telling terrestrial time are proved incorrect.

Poem:Ahmad Hamesh
Translation:Syeda Moneera Nuzhat

O' the Holy Prophet
(PEACE BE UPON HIM)

Just now I have set my clock by the clock of death
O'the Holy Prophet!
Before I am dead purify the filthy clay of my body Or forgive it
Over the greed to live for a few years tie up my soul with some strong rope
And theCut the dimensionsof my body with the sword, God has entrusted to You
And my leaven covered with the thick hair of devil burn away into ashes
And scatter the ashes in the airs which blow underYour feet
O'the Holy Prophet!
A cool night, which was drawon the pain of my ribs and it was raining 36 years of.my age
my beds were getting wetstanding out of the room
So as much as I had learnt to burn fire from the world,I brunt it in the stove made of the potsherd of the useless old pitcher lying in the house
And I,on burning only eight coalsout of one and half seer coals purchasedby me for rupees two only from thefire-wood-shop mourning silently for those numerous unaffluentbanishments of the *Mahakal, was unhappy for that lantern of the fire-wood-shop hanging over the poor needs was weepingall smocky-blood-mingled burnt tears of thesad women of our past
O'the Holy Prophet!
I was contentedthat contented people are dear to God
Then I heard the language of embers that embers too while burning recite some holy verse existing in the

Poem By: Naseer Ahmed Nasir.

PURBLIND

If some one were to flash a light
Would you be able to see
All those things
Which are lost in the deep swarthy
Liquid of darkness
Life's configuration
Death's face
Body of sadness
Lips of sound, dimples of pain
Marble-white feet of happiness
Henna-colored fingers of love
Universes of beloved's tresses
Indeed, the divinely musical shadow of God....

If some one were to flash a light
Would you be able to see
Wrapped up in the primordial fog
Waiting since life's beginning
Some one's eyes!

(Translated from the original Urdu by Satyapal Anand)

Poem By: Naseer Ahmed Nasir.

CHARIOTEER HAS GONE TO SLEEP

The charioteer has gone to sleep
Overcome by fatigue of wearisome ways
Unaware of where he is
All that's evident
Is his continuous journey
On unmarked, worn-out way
In his wooden wagonette
From the beginning of time
To the end of time
When the wagonette
Creaks even with a small bump
Wrapped up in millions of folds
Of ragged shabbiness
Each living being is startled
The charioteer dreams
He has lost himself in strange worlds
Comfortable climes
Riding a golden chariot
And holding the princess's hand
The charioteer has gone to sleep.

(Translated from the original Urdu by Satyapal Anand)

To feed you any further

Salahuddin!
This is my last
confession and
I solemnly confess
the truth
on oath and at the
Peril of God's wrath
that
I am Salahuddin
I am a hypocrite
to the core
I am a
NAMAK HARAM
galore
All along I have been
cheating men
and women,
Religions and
God alike and
Making
false confessions
But being a MUNAFIQ
I will deny every word
of this confession
Declaring it a conspiracy
of my enemies
But please do not trust
my denial because
My name is Salahuddin
and
I am also a
compulsive liar
May God forgive me

From his wrath
And from fire of hell
And bestow me
Enough moral courage
To stand by
my last truthful confession;

[TASHKEEL is thankful to the sender of this enlightening poem by post from Delhi via Patna.]

**You are now
Sqandering away
Hard-earned money of
your benefactor
Who doles out
ZAKAT
every month
For the survival of
your orphan children
And your widows
Whom you use
as a post-office
To receive money from
your merciful benefactor
Only to be robbed
by you
To spend on writers
and whores alike
This reasons for not
Showing your face
Smudged by your sins
To your
God fearing benefactor
So you were
always a hanger-on**

**You are still a hanger-on
Because you never
earned a penny
You never learnt to
sweat
to earn a livelihood
But there is a
difference now
You are surrounded
by parasites of
Your own species;**

**Salahuddin!
You must remember now
Your nemesis
Is chasing you hard
Like your notorious
shadow
Your doomsday
is approaching fast
Your money source
will dry up soon
The parasites will
desert you
Leaving you alone
high and dry
Like a leper
You would be
frantically
searching for a shoulder
To weep on
You will go back to
Your banefactor,
fawning
But he will not be there**

Glamourizing their
sacred heroes
You tried to sell
and trade in
Both religions
side by side
For your freakish motives
and selfish stride;

Salahuddin!
You, an imposter
seeking name,
fame and
Grandeur in literature
by buying and hiring
Parrot poets, writers,
critics and editors
To glamourise
and glorify you
You abused and
humiliated
the great icons of
Urdu literature when
They refused to fall in
line to adore you
In the name of poetry
and fiction,
you dished out
Only filth, obscenity
and pornography
Forgetting that man
proposes
and God disposes
All your lewd efforts
and your courtiers'
dishonest
Endeavours finally
boomeranged
Ending up you,
a literary sham
Into a nauseous carrion
Consigning you to
the catacomb of
Eternal shame and
oblivion;

Salahuddin!
You bit the

giving hand of
your benefactor
Because you are
a mongrel of
Doubtful pedigree
Remember the days
when
As an ancestoral pauper,
you did not have money
To buy a bread

MY LAST CONFESSION
BY
SALAHUDDIN

[This lovely poem is dedicated to my mentally retarded friends and blind admirers like Gopi, Mahmood, Shamim, Intizar,Wazir, Jilani and Jamilu. Etc.and my other parasitic fawning courtiers. S.]

Salahuddin
You never made
a confession
You simply indulged in
Befooling all
and sundry and in
Self publicity, mockery
and treachery
You have mastered
the art of
Buffoonery and Chicanery
You have touched
the pinnacle of
Ineptitude and
ingratitude;

Salahuddin!
You never
practiced Islam
You did every thing
prohibited by Islam
Drinking and debauching
licentiously leering
And
lecherously womanizing
You are an
exemplary hypocrite,
a MUNAFIQ
The ultimate
destination of a
MUNAFIQ
Is the lowest rung of
the dreaded
JAHANNAM;

Salahuddin!
TO please Muslims,
youwrote poems
Idolizing their
sacred heroes
To please Hindus,
you wrote poems

TASHKEEL ENGLISH WRITINGS

PART-9

COMPILED BY AHMAD HAMESH

(From back page-2 to 11)

COMPILED BY AHMAD HAMESH

My last confession by Salahuddin, Charioteer has gone to sleep, Purblind by Nasser Ahmed Nasir(Translated from the original Urdu by Satyapal Anand)

O' the Holy Prophet(Peace be upon him) by Ahmad Hamesh

(Translation: Syeda Moneera Nuzhat)

Profile of Zamir Niazi:
Subeditor,Dawn 1954-1962
Chief subeditor,leader writer,Daily News 1962-1965
Edition incharge,editor of magazine section,
news editor,Business Recorder 1965-1990
Editor monthly Recorder and weekly Current
Contributed articles to various local and
foreign publications

Books written:
The Press in Chains 1986
The Press under siege 1992
The web of censorship 1994

Also edited:**Zameen ka nauha 2000**

Three more books under print:
A Fettered Freedom
Unglian Figar Apni(Blood-dripping fingeres)
Haath Hamare Qalam Huvay(Our severed hands)
(Translation,The Press In Chains)
Sahafat Pabazanjir 1994
Hikayaat-Khunchokan
AAJ @ DIGICOM.NET.PK

کہانی مجھے لکھتی ہے

احمد ہمیش کی لازوال کہانیوں کا مجموعہ
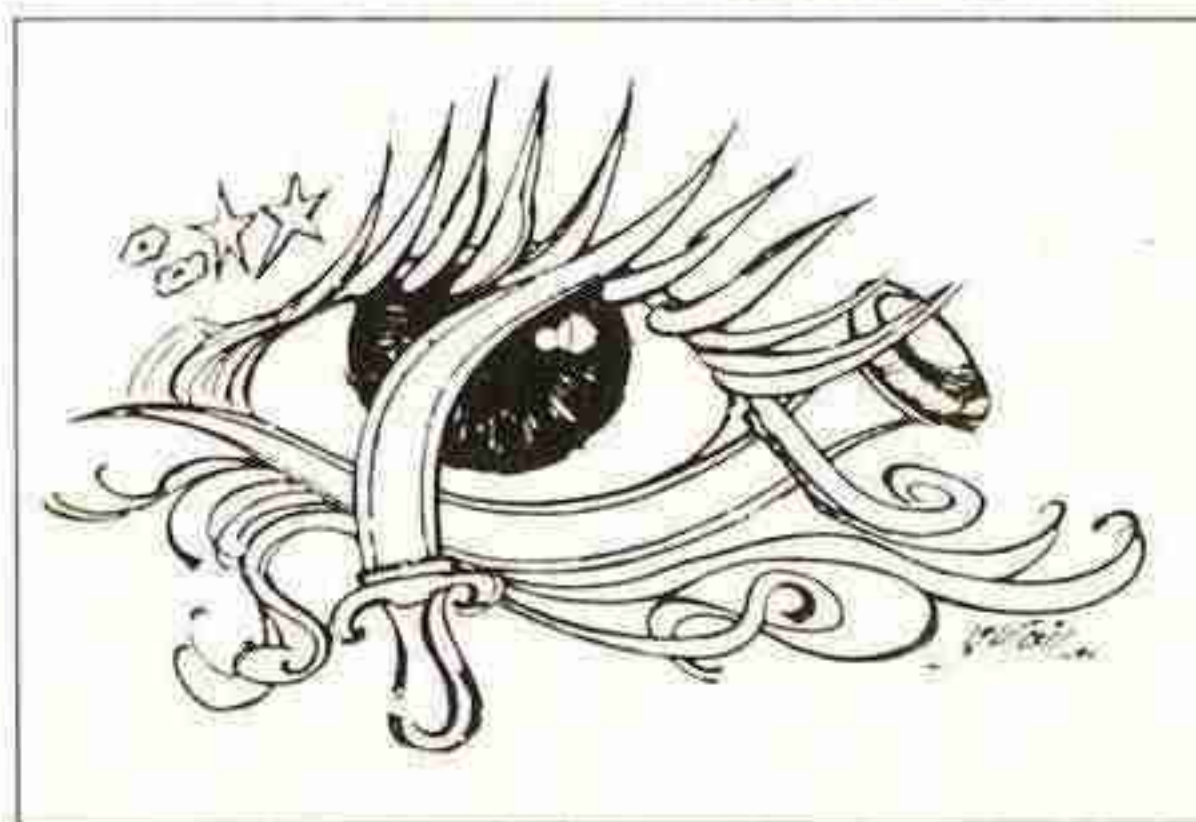
احمد ہمیش کہانی نہیں لکھتا بلکہ کہانی خود اُس کی تخلیقی و تہذیبی بازیافت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیش کی کہانیاں انسانی سچ کی وہ تاریخ ہیں جو وقت کی قید سے ماورا ہیں، جنہیں کسی بھی عہد میں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

(نصیر احمد ناصر)

تخلیقی پبلشرز، 8/6, J-2، عروج کلینک بلڈنگ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰ ـ (پاک)

TASHKEEL QUARTERLY- 39

THE BEGINNING OF NEW MILLENNIUM JAN TO DEC 2000
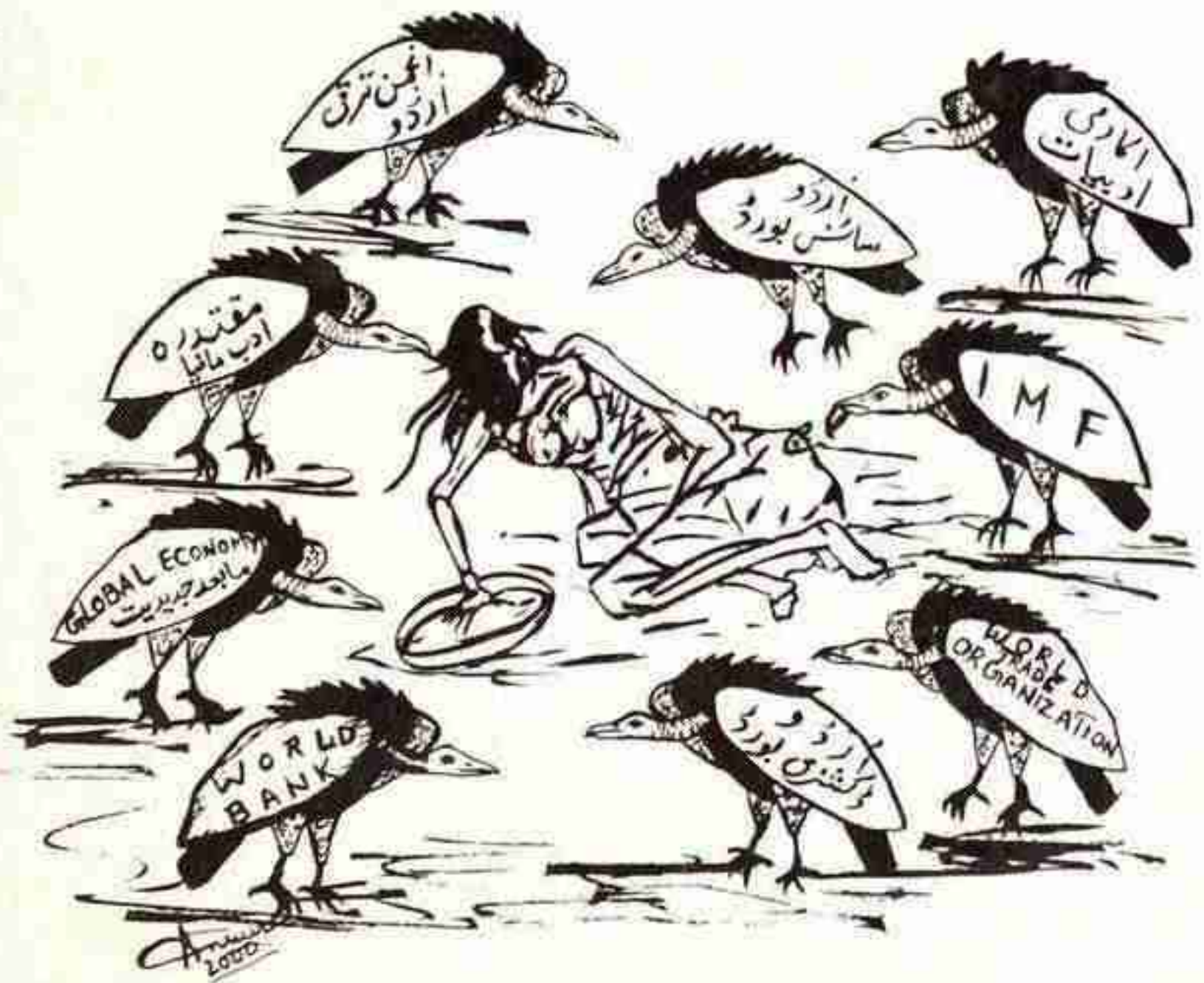
SOURCE OF INSPIRATION----ZAINUL-ABIDEEN